سُرخاب

ممتاز قلم کاروں، فن کاروں کی رنگ رنگ داستانیں

تذکرے، خاکے، قصّے

عرفان جاوید

تذکرے، خاکے، قصّے

عرفان جاوید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

اپنے

احمد ندیم قاسمی صاحب

اور

شکیل عادل زادہ صاحب

کے نام

سیاہ وسفید

تذکرے، خاکے، قصّے

Best

News paper

News paper

انوکھا، لاڈلا
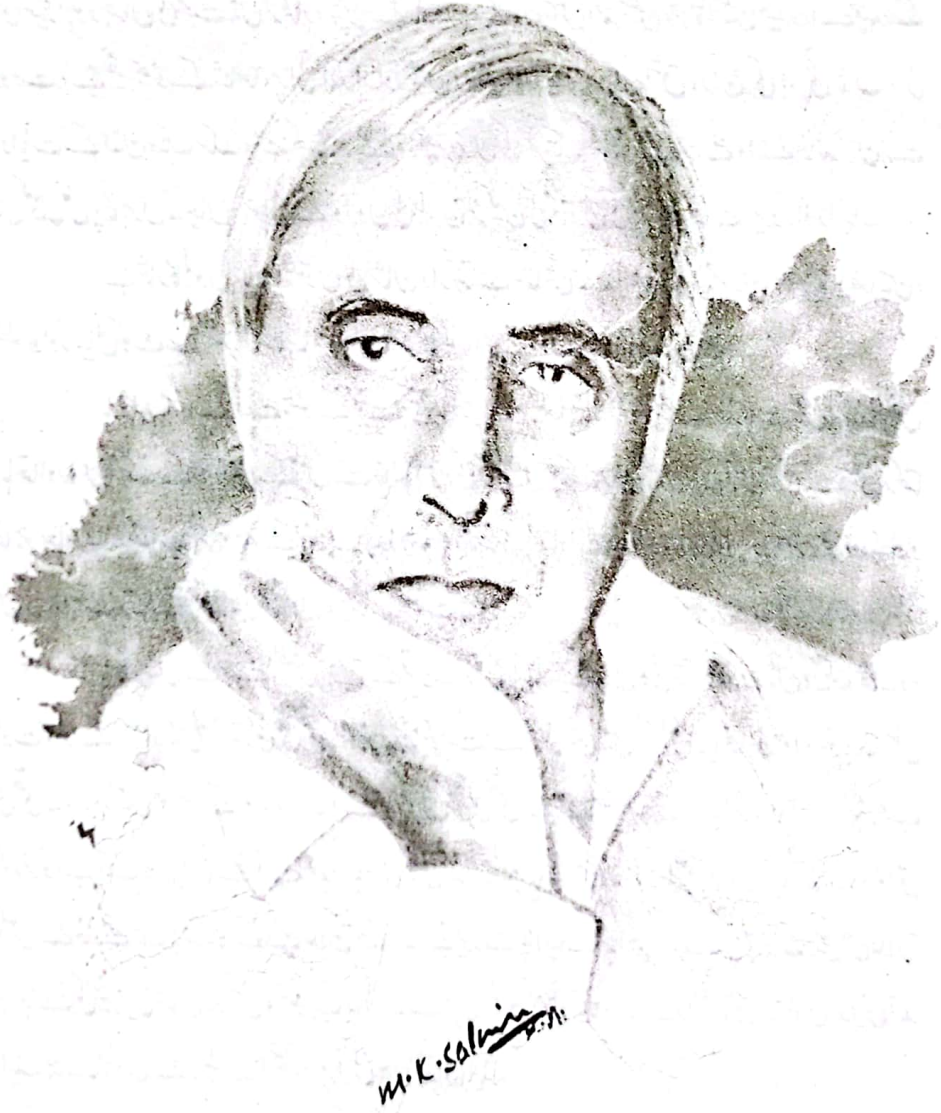
خالد حسن

میں خالد حسن سے کبھی نہیں ملا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھی، محمد علی جناح کے پرائیوٹ سیکریٹری کے ایچ خورشید کے برادرِ نسبتی، پیرس، اوٹاوا اور لندن میں سفارت کار، چالیس کتابوں کے مصنف، باخبر اور حاضر دماغ صحافی، انگریزی کے اپنے وقت کے صاحبِ طرز اور صفِ اوّل کے کالم نگار اور شان دار مترجم خالد حسن سے میں کبھی نہیں ملا۔

پر شاید میں اُس سے مل چکا ہوں۔ بھٹو کی رنگین و سنگین صحبت کے راز داں، امیلیا ہوٹل، ڈرموں والے چوک اور کشمیر کی پہاڑیوں کے قدموں میں آباد سیال کوٹ کو ڈوٹ کر چاہنے والے، دمکتے ہیروں میں بجی میڈم نور جہاں کی محبت میں گرفتار، بچپن کے یاروں کے یار، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، اے حمید کے دوست، بے نظیر بھٹو کے شناسا، پرانی اقدار اور نفیس ریشمی نیکٹائیوں کے عاشق، راج کی اونچی ناک والی روایات کے امین، نک سک، نٹ کھٹ، چلبلے، پچھتر برس کی عمر تک کھلنڈرے رہنے والے خالد حسن سے میں کہیں مل چکا ہوں۔ کہاں، جوانی کے خوابوں کی طرح لڑکپن کی محبتوں کی طرح یاد ہے، پر ذرا ذرا سا۔

بے شمار کالموں، یادداشتوں کی شان دار کتاب مقابل ہے آئینہ (مترجم راجا انور)، مضامین، خطوط اور سیال کوٹ کے مشترکہ شناساؤں کی معرفت گویا اس سے رسمِ شناسائی رہی ہے۔

یا شاید میں نے اُسے بھٹو کے پیچھے اسٹیج پر کھڑے دیکھا تھا۔ بھٹو انتہائے جذبات میں آگ اُگل رہا تھا اور اُس آگ کے شعلوں کے عکس سے خالد حسن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ اُس نسل سے تعلق رکھتا تھا جو بغاوت، انقلاب، استعمار کے خلاف جدوجہد اور انسانی مساوات پر مجنونانہ ایمان رکھتے تھے اور بھٹو کو اس کی علامت سمجھتے تھے، کرشماتی، متلون، سیماب صفت بھٹو!

یا پھر میں نے اُسے کلفٹن برج کے قریب واقع ایک بنگلے میں دی گئی دعوت میں دیکھا تھا۔ وہ دعوت بھٹو کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ بھٹو نے حکومت سے حال ہی میں استعفیٰ دیا تھا اور عوامی توجہ حاصل کی تھی۔ لاہور میں عوام کے سمندر نے اُسے پذیرائی بخشی تھی۔ ایوب حکومت کے بااثر، باوقار اور بارعب گورنر نواب آف کالا باغ نے اُسے گورنر ہاؤس میں کھانے پر بلا کر مشورہ آمیز حکم جاری کیا تھا کہ وہ عوامی ردعمل کے خاتمے تک چند ماہ کے لیے علاج کے بہانے یورپ چلا جائے۔ اخبارات میں بھٹو کے بغرضِ علاج باہر جانے کی خبریں شائع ہوئیں تو حبیب جالب نے اپنی مشہور نظم ''چھوڑ کے نہ جا'' لکھی۔ بھٹو کی کراچی آمد پر ایک بڑے جلوس نے ریلوے اسٹیشن پر اُس کا استقبال کیا۔

جب بھٹو بنگلے پر خوش وضع بیگم نصرت بھٹو کے ہم راہ دعوت میں شرکت کے لیے آیا تو جیالے اُس کے منتظر تھے۔ وہ جذباتی تھے، غم گین تھے اور عرضِ مدعا کے مشتاق تھے۔ بھٹو کرسی پر جم کر بیٹھ گیا تو اُسے مشروب پیش کیا گیا۔ وہ دو تین گھونٹ لے چکا تو خالد حسن نے اپنی جیب سے اخبار کا تراشا نکالا جس پر وہ نظم

درج تھی اور اُسے ''اکیلے نہ جانا'' کی دُھن پر جذباتی انداز میں گا دیا۔ بھٹو جذباتی ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے ''نہیں جاؤں گا! نہیں جاؤں گا'' گلاس دیوار پر دے مارا۔ گلاس کی کرچیاں تو بکھر گئیں پر جیالوں کے حوصلے بندھ گئے اور خوشی کی لہر اُن میں دوڑ گئی۔

فقط تین روز بعد بھٹو ملک سے باہر چلا گیا۔

ایک سننے کا واقعہ ہے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد اُس کے بہت سے ساتھیوں کو ضیا الحق کی مارشل لائی حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اُنھیں قید و بند کی سزائیں دی گئیں، کوڑے لگائے گئے اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اُنھی میں سے ایک خالد حسن کا شناسا جب حراست سے لوٹا تو خالد نے اُس سے گرفتاری کا احوال پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ دیگر لوگوں کو تو کوڑے لگائے گئے پر اُسے چھوڑ دیا گیا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ اُسے ایک نوجوان کپتان کے سامنے پیش کیا گیا تو کپتان نے اُس کا شناختی کارڈ دیکھا اور کہا ''تم 51 برس کے بوڑھے ہو۔ ہم تمھیں تمھارے بڑھاپے کی وجہ سے چھوڑ رہے ہیں۔'' بعد ازاں اُس نے دُکھی لہجے میں خالد سے حالِ دِل بیان کرتے ہوئے کہا:

''اگر وہ مجھے کوڑے مار دیتے تو شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی ''51 برس کے بڑھاپے'' کی بات سن کر ہوئی۔''

بھٹو کا ایک دل چسپ مکالمہ ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ باوجود اس کے کہ معاہدۂ تاشقند کا مسودہ بھٹو نے تیار کیا تھا، اُس کا دفاع بھی بھٹو نے قومی اسمبلی میں کیا مگر عوام کے ذہن میں ایک جذباتی اور افسردہ بھٹو کا تصور قائم ہو گیا جس کا اس معاہدے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاشقند میں ایوب اور لال بہادر شاستری کے معاہدے کے بعد وہیں دل کا دورہ پڑنے سے شاستری کا رات گئے انتقال ہو گیا۔ بھٹو کو اطلاع دی گئی تو مطلع کرنے والے نے فقط اتنا کہا ''سر! شیطان مر گیا۔'' اس پر بھٹو نے آنکھیں ملتے ہوئے تاریخ ساز جملہ کہا ''کون سا شیطان؟ اُن کا یا ہمارا؟''

سیال کوٹ چھاؤنی میں قدیم، درختوں میں گھری، کلیساؤں کے بیچ ستاتی مال روڈ (موجودہ قائداعظم روڈ) پر ایک کائی لگتے سال خوردہ ڈھیتے مکان میں زندگی کے پانچ برس گزارنے کے دوران میں نے کئی لوگوں سے خالد حسن کا پوچھا۔ صنعتی میکانکی شہر میں جوان ہونے والے اُسے نہ جانتے تھے، علمی و تاریخی بستی میں بڑھاپے کے چوبی دروازے کا آہنی کنڈا کھڑکانے والے اُسے خوب جانتے تھے۔ من چلے، حاضر دماغ، خوش مزاج، ہم درد و حلقۂ یاراں کی رونق کے طور پر خوب جانتے تھے۔ عجب آدمی تھا کہ بڈھا ہوا تو بھی جوان تھا۔

اُس کی ترکش میں کیا کیا جملے ہوتے تھے جنھیں وہ متن میں تراز و کرتا رہتا تھا۔

ملکۂ ترنم نور جہاں شبِ قدر کی مقدس رات فوت ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس رات فوت ہونے والے جنت میں جاتے ہیں۔ جب میڈم نور جہاں کے جسدِ خا کی کو لاہور میں دفنانے کی بات ہوئی، تا کہ وہ شہر جہاں انھوں نے زندگی گزاری اور انھیں صحیح معنوں میں پذیرائی ملی، اُن کا دائمی مستقر ٹھہرے تو ان کی بیٹی حنا نے اس کی مخالفت کی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اس طرح تاخیر ہو جائے گی اور یوں شبِ قدر گزر جائے گی۔ اُس نے مادام کی بیٹی ظلِ ہُما اور دیگر سے کہا ''کیا تم نہیں چاہتے کہ ہماری والدہ جنت میں جائیں۔''

اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے خالد حسن نے جملہ تراشا ''اس داستان کو سن کر مجھے اس بات پر دُکھ ہوا کہ ان کی بیٹی حنا کو اپنی ماں کے ویسے جنت جانے کے متعلق کیوں شک تھا؟''

سیال کوٹ کے باسیوں کی حاضر دماغی اور جملہ بازی کے حوالے سے وہ اپنے بچپن اور لڑکپن کے بہت سے لوگوں کو یاد کرتا تھا۔

مرے کالج کے ایک مسیحی طالب علم ''ازو'' کا تذکرہ کرتا جس نے اپنی سائیکل کی پشت پر ایک پلیٹ لگا رکھی تھی جس پر لکھا تھا ''احتیاط !Left Hand Drive۔''

ایک مرتبہ جب ازو سے پوچھا گیا کہ کیا اُس نے (معروف روسی ادیب) دوستوو سکی کو پڑھا ہے تو اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا ''میں اُردو کی کتابیں نہیں پڑھا کرتا۔''

خالد نے شبینہ ہوٹل میں بلیئرڈ کے کھیل، جس پر شرطیں بدی جاتیں، کے حوالے سے لکھا تھا کہ وہاں دیوار پر ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا ''یہاں غریب اور شریف آدمی کا داخلہ ممنوع ہے۔''

یہ سیال کوٹ ہی میں ممکن تھا کہ بلیئرڈ کی گیند سے بات کرنا باضابطہ طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ابراہیم ٹھیکے دار بلیئرڈ کی گیندوں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ سٹروک لگانے کے بعد وہ اس پاکٹ کے سامنے جا کھڑا ہوتا جہاں گیند کو جانا ہوتا اور اسے پیار سے پچکارتا ''آ جا میرے بلبل دے بچے!۔'' اس کے مخالف کھلاڑی ایسے مکالموں سے بہت جز بز ہوتے۔ بالآخر سب نے اکٹھے ہو کر مشاورت کی اور شبینہ ہوٹل میں بلیئرڈ ٹیبل کے پاس گیند سے باتیں کرنے پر باقاعدہ پابندی لگ گئی۔

ملک غلام نبی تاش کا رسیا اور رنگین آدمی تھا۔ اُس نے تاش کی بازی لگا رکھی تھی اور کوئی خاص جیت اس کے حصے میں نہ آئی تھی۔ اُس کا ایک دوست بار بار تاش کاٹنے (بڑا پتا نکلنے پر مرضی کی جگہ بیٹھنے کا استحقاق) کا تقاضا کرتا۔ جب اُس کا تقاضا بڑھ گیا تو ملک غلام نبی نے تاش پھینک دی اور بولا ''تم نے دیکھا ہوگا کہ کوا عورتوں کا کپڑے دھونے کا صابن لے اُڑتا ہے۔ کوے نے اُس صابن سے کپڑے نہیں دھونے ہوتے پر وہ اپنی بدعادت سے مجبور ہوتا ہے۔ ہمارے دوست کو بھی ایسی بدعادت ہے۔ وہ خود تو جیت نہیں

پا تا پر اپنی عادت کی نحوست سے ہم سب کا خانہ خراب کر رہا ہے۔''

مرے کالج کے پروفیسر ٹریسلر کی عقابی نظر، ڈسپلن، تند مزاجی اور غیر معمولی قابلیت کی مخصوص انداز میں تعریف کرتے ہوئے اس نے ایک مکالمہ لکھا ''ہمارے ایک ساتھی کلیم اختر کو پروفیسر ٹریسلر کا ''کڑچھا'' ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ایک بار اس نے انھیں مکھن لگایا ''سر آپ تو بابائے ڈسپلن ہیں'' پروفیسر نے خوشی سے کہا ''اپنی بات پھر دہرانا۔''

بائیں بازو کی جانب رجحان رکھنے والے مسیحی پروفیسر ایرک سپرین لاہور سے سیال کوٹ انگریزی پڑھانے آئے تو ان کے پیچھے پیچھے خفیہ ایجنسیاں بھی چلی آئیں۔ اس سے پہلے کمیونزم سے تعلق کی وجہ سے وہ پابندِ سلاسل رہ چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ سیال کوٹ میں گم نامی کی زندگی گزار دیں گے۔ پر اُس دور کی متحرک ایجنسی سی آئی ڈی نے یہاں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اب پروفیسر صاحب نے ایک عادت بنالی۔ وہ ایجنسی کے اہل کار کو اپنی سائیکل پر بٹھا لیتے تا کہ اُن کا پیچھا کرنے کی ناکامی پر وہ جھوٹ موٹ، سازش کی کوئی ایسی کہانی نہ گھڑ لے جس سے تائب پروفیسر دھر لیا جائے۔ بعد ازاں پروفیسر صاحب نے ایک شادی شدہ بچوں والی مسلمان عورت سے ایسا دِل لگایا کہ اُس کی خاطر اسلام قبول کر کے شادی رچالی۔ پروفیسر صاحب فوت ہوئے تو خالد حسن نے ان کے اوپر لکھے گئے تعزیتی کالم کی سُرخی جمائی۔

''اعجاز سپرین فوت ہو گئے، ایرک سپرین زندہ ہے۔''

خالد حسن کا ایک کالج فیلو محمد عبداللہ تھا۔ وہ شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ پیا نام عین ادیب بولتا اور لکھتا تھا۔ ایک مرتبہ پولیس نے اُسے بغیر بتّی موٹر سائیکل چلاتے ہوئے پکڑلیا۔ نام پوچھا گیا تو اُس نے ''عین ادیب'' بتایا۔ یہ سن کر پولیس والے کو غصہ آ گیا اور وہ اسے دھکیلتے ہوئے بولا ''بچُو میرے ساتھ لومڑ یچی نہ کرو، میں تمھیں کسی مشاعرے میں پڑھنے کے لیے نہیں مدعو کر رہا بلکہ تمھارا چالان کاٹ رہا ہوں۔''

خالد حسن کے کالموں، گفت گو، دیگر تحریروں اور خاکوں میں جا بہ جا زمرد ملک کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ زمرد ملک غیر معمولی مطالعے اور صلاحیت کا مالک آدمی تھا۔ وہ کالج میں خالد کا دوست بنا اور یہ تعلق زمرد کی جوانی کی بے وقت اور اچانک وفات تک جاری رہا۔

زمرد ملک ''شاعری، علمِ نجوم، پتنگ بازی، وجودیت، انقلاب اور بلیرڈ تک متنوع موضوعات پر پُر مغز گفت گو کر سکتا تھا۔ وہ دست شناسی، زائچہ بنانے، فرعون کے دور کی مصری تصویری تحریروں، گورکھی، سگمنڈ فرائڈ، کریملن کی غلام گردشوں میں جنم لیتی کہانیوں، پنجابی صوفیانہ شاعری اور مصوری پر نہ صرف دست رس رکھتا تھا بلکہ ان سب موضوعات پر منفرد اور جدید خیالات کا مالک بھی تھا۔''

وہ بالکل تن درست تھا کہ لاہور کی مال روڈ پر کتابوں کی ایک دکان کے بالکل سامنے دل کا دورہ

پڑنے سے اچانک مر گیا۔ خالد حسن کو اُس کی موت کا انتہائی دُکھ تھا۔ زمرد کا تذکرہ اُس کی تحریروں میں بار ہا یوں دھیرے سے اُتر آتا جیسے کوئی پرانی دُھن سُن کر آنکھوں میں نمی اُتر آئے۔

خالد حسن سیال کوٹ کی صاف ستھری گلیوں، سرمئی رنگ کی پُراسراری پانی کی ٹنکی، ڈھکی ہوئی نالیوں، ہر صبح سڑکوں کی صفائی اور پانی کے چھڑکاؤ، صاف شفاف پانی، تازہ سبزے پر رینگتی سرسراتی خوش بودار ہوا، قدیم قلعے تک جاتی چھوٹی اینٹ کی پیچ دار گلیوں، مرے کالج اور پرانے دوستوں کا یوں تذکرہ کرتا جیسے یہ پچھلی زندگی کی باتیں ہوں۔ اُسے گورنمنٹ کالج لاہور ایسے تاریخی باوقار ادارے میں پڑھانے کا موقع مل سکتا تھا لیکن وہ واپس مرے کالج سیال کوٹ میں بہ طور استاد لوٹ آیا۔ وہی سیال کوٹ جہاں اُس نے جموں میں اپنی پیدائش کے بعد، لڑکپن اور جوانی گزار دیے۔

قریباً بیس برس قبل کا سیال کوٹ، جب میں وہاں چند ماہ رہنے کے لیے گیا پر اپنی زندگی کے خوب صورت ترین پانچ برس وہاں گزارے، یقیناً خالد حسن کے بچپن جیسا تو نہ تھا۔ شہر مخلیں بند ہائے قبا سے اتنا باہر نہ نکلا تھا کہ ڈسکہ، سمبڑیال اور نارووال تک بے ہنگم انداز میں لحیم شحیم تو ندیل کی طرح پھٹ پڑے۔ میرا وقت سیال کوٹ چھاؤنی میں عصر کے وقت کی شفیق نرم نتھری روشنی میں سیر کے آغاز سے شروع ہو کر شام کے دھندلے دریا کے رات کے تاریک سمندر میں اُترنے تک جاری رہتا۔ شہر کے برعکس، کبھی چھاؤنی خالص برطانوی دور کے فوجی انداز کی بیرکوں، کلیساؤں، چوبی بینچوں، درختوں، خودرو پودوں، چھوٹے جنگلی جان دَروں اور کوارٹروں سے آباد تھی۔ صاف شفاف راتوں میں غور سے دیکھنے پر جموں میں کالی کی درگاہ اور مندر کی جھملاتی روشنیاں نظر آجاتی تھیں۔

ابتدائی دِنوں میں مَیں گھنٹا گھر سے صدر بازار کو جاتی سڑک پر مشہور صابری اسٹور کے سامنے سڑک کے پار پانی کے تازہ چھڑکاؤ میں بھیگی سبزی ترکاری کی دکان پر خریداری کے لیے رُکا۔ دکان دار تہ بند اور بنیان پہنے ایک گورے چٹے (غالباً) کشمیری بزرگ تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے ''نئے آئے ہیں؟'' میں نے کہا ''جی، لاہور سے آیا ہوں۔'' انھوں نے ایک دم سوال داغا ''جرمنی گئے ہیں؟'' میں نے تذبذب میں کہا ''نہیں'' تو وہ بولے ''پھر آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرے دو بیٹے وہاں رہتے ہیں۔ چار بار گیا ہوں۔ جس نے جرمنی نہیں دیکھا اُس نے کچھ نہیں دیکھا۔'' میں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا ''واقعی، جرمنی اتنا شان دار ملک ہے؟'' بولے ''جی جناب، سیال کوٹ کے بعد دنیا میں رہنے کی کوئی اچھی جگہ ہے تو وہ جرمنی ہے۔''

بعد میں بزرگوار سے تعلق اتنا بڑھا کہ میں اکثر اُن کے پاس چلا جاتا۔ ایک روز وہ مجھے بہت اہتمام سے سامنے گلی میں اپنے چھوٹے سے گھر میں لے گئے۔ اُن کا نچلے متوسط طبقے سے تعلق تھا پر گھر میں کیا نفاست، قرینہ اور خوش مذاقی جھلکتی تھی۔ سیڑھیوں میں پھولوں کے گملے، چھوٹی سی بیٹھک میں نفیس ہاتھ

کی کڑھائی والے میز پوش اور گرد پوش، صفائی اتنی کہ گرد کا ذرہ نظر نہ آتا تھا اور غسل خانے میں تازہ پھولوں کا گل دان۔ اگر کہیں نفاست اور حسنِ لطیف غریب کے کوارٹر میں دکھتی ہے تو کہیں متمول کے بنگلے میں بے ذوقی، بدنمائی اور اسراف کالی بلی کی طرح یوں رستا کھوٹا کرتے ہیں کہ دوبارہ جاتے ہوئے جی رُک رُک جاتا ہے۔

بزرگوار نے چائے کا پُر تکلف اہتمام کیا تھا۔

دس برس بعد سیال کوٹ جانا ہوا تو میں قصداً وہاں سے گزرا۔ دکان وہاں سے اُٹھ چکی تھی۔ اب وہاں مٹھائی فروش براجمان ہے۔ کسی سے اُن شفیق و شگفتہ مزاج بزرگ کا نہ پوچھا مبادا رنجور کرنے والی خبر مل جائے۔ پس اُن کی صحت و سلامتی کی دعا دل سے بے اختیار اُٹھی (بعدازاں معلوم ہوا کہ ماشاءاللہ حیات ہیں، صاحب حیثیت ہو چکے ہیں، سو بیٹے نہیں چاہتے کہ باپ سڑک کنارے ترکاری سجائے)۔

خالد حسن نے سیال کوٹ کے باسیوں کی بذلہ سنجی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مہمان علامہ اقبال کا گھر تلاش کر رہے تھے۔ انھوں نے اقبال کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر ایک مقامی شخص سے پوچھا ''کیا یہ علامہ اقبال کا گھر ہے؟'' وہ مقامی شخص تُرت بولا'' کیا تم نے اسے آگ لگانی ہے؟''

جب میں اقبال کے گھر کی تلاش میں گیا اور ایک اجنبی سے پوچھا ''علامہ اقبال کا گھر کہاں ہے؟'' تو اُس اجنبی نے مصنوعی لہجے میں کہا'' علامہ اقبال کون؟ آپ بالا صاحب کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''جی'' اُس نے کہا'' وہ ہمارے ہم سائے تھے۔ صاحب تو آپ کی وجہ سے کہہ دیا ورنہ وہ تو بچپن میں صرف کُرتا پہنے ہمارے سامنے بھاگے پھرتے تھے۔ ہم اُنھیں خوب جانتے ہیں۔'' قبل اس کے کہ وہ اجنبی انکشافات کا سلسلہ دراز کرتا، میں نے وہاں سے رخصت میں عافیت جانی اور مکان کی دہلیز سے اندر داخل ہو گیا۔

سیال کوٹ کی قائداعظم روڈ پر آج بھی وہ سنگ ہائے راہ نمائی موجود ہیں جن پر پرانی انگریزی کے پُرشکوہ جملے کندہ ہیں۔ ''یہاں پنجاب کے تپتے گرم میدان اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ یہیں سے ہمالیہ کے عظیم سلسلہ کوہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر آپ یہاں سے ہمالیہ کی جانب نظریں اٹھائیں تو آپ کو کسی حمد خواں کا گایا ڈیوڈ کا مقدس گیت سنائی دے گا۔ (حمد 121)''

جب میں نے سیال کوٹ میں پرانے لوگوں سے خالد حسن کا پوچھا، تب تک خالد حسن زندہ تھا، پر امریکا میں مقیم تھا۔ شناساؤں نے بتایا کہ عملی زندگی میں آجانے، بھٹو کی قربت، سفارتی ذمے داریوں اور بعدازاں بین الاقوامی اداروں سے وابستگی کے باوجود وہ پرانے دوستوں کے ساتھ کبھی کبھار سیال کوٹ کی سڑکوں، محلوں، چوکوں کی جانب نکل آتا۔ امام صاحب کے علاقے میں توے پر دیسی مکھن میں تلی جانے والی

مخصوص سیال کوٹی چانپیں کھانے، ڈرموں والا چوک، پیرس روڈ، پورن نگر اور محلہ اسلام آباد وغیرہ میں اپنے بچپن اور لڑکپن کو تلاش کرتا جا نکلتا۔

قرۃ العین حیدر کو لکھے ایک مکتوب میں اُس کا اپنے وطن جموں، سیال کوٹ اور اس کے نواح میں واقع علاقوں سے رومان اُبل اُبل پڑتا ہے۔ ''بوڈاپیسٹ (ہنگری) جانے سے پہلے میں نے آپ کو ایک رقعہ لکھا تھا۔ اس کے بعد کچھ روز کے لیے وینس چلا گیا۔ گرینڈ کنال کوئی ایسی گرینڈ نہیں۔ موضع ہیڈ مرالہ، ضلع سیال کوٹ کی نہر، جس کے دونوں کناروں پر آم اور جامن کے جھرمٹ ہیں، اس سے زیادہ بڑی ہے۔ اگر ٹامس مان سیال کوٹ کا باشندہ ہوتا تو ہوسکتا ہے Death in Venice کے بجائے Death in Marala لکھتا اور ہیڈ مرالہ تا بقائے دنیا مشہور رہتا۔''

البتہ بعد میں اُس نے نکلنا کم کر دیا اور دوستوں کے مخصوص حلقے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مرے کالج کے گیٹ کے سامنے پدرانہ شفقت رکھنے والے مالٹے بیچنے والے چاچا محمد دین، جسے دیکھ کر فیض احمد فیض بھی گلے ملنے دوڑے چلے آئے تھے کہ وہ بھی وہاں طالب علم رہے تھے، کو ڈھونڈنے نکلا ہو۔ چاچا محمد دین، جس نے کئی طلبہ کی پروفیسر اسکاٹ اور مسٹر ٹریسلر سے سفارش کر کے سزا سے معافی کروائی تھی، لڑکی سے معصومانہ چھیڑ چھاڑ کرنے والے طالب علم کو لیے لڑکی کے باپ کے پاس اُس کے گھر معافی تلافی کروانے چلا گیا تھا اور سب طلبہ سے باپ کی طرح پیار کیا تھا۔ چاچا محمد دین، خالد حسن کو مرے کالج کے سامنے نظر نہ آیا ہو، بلکہ شاید کہیں بھی نظر نہ آیا ہو اور اُس کا دِل ٹوٹ گیا ہو۔

ایک جگہ اُس نے بیان کیا تھا کہ کسی چیز کے چھوٹے یا بڑے حجم کی حقیقت دیکھنے والے کی عمر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ بچپن میں جو چیز بہت بڑی دکھتی ہے، بڑے ہونے پر وہی شے معمولی نظر آتی ہے۔ خالد حسن جب مدتوں بعد 1983 میں بھارتی جموں گیا تھا تو اپنے بچپن کے ایام کی کشادہ کھلی گلیاں اُسے خاصی تنگ محسوس ہوئی تھیں۔ پرانے لوگوں کو اپنے مقام پر نہ پا کر اور مقامات کو حد درجے تبدیل دیکھ کر وہ مایوس ہوا تھا۔

تجربہ بتاتا ہے کہ پرانے رومان، بھلے مقام سے ہوں یا انسان سے، کی جانب لوٹنے سے اُس کا رہا سہا طلسم بھی ٹوٹ جاتا ہے اور انسان یادوں کے حوالے سے غریب تر ہو جاتا ہے۔ یہ یادیں ہی تو ہیں جو عمرِ گزشتہ کا سرمایہ ہوتی ہیں اور ان کی جانب جسمانی طور پر رجوع کرنا گویا نقب لگانے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔

خالد حسن کی نجی زندگی سے ہٹ کر، اُس پر دو عورتوں کے بہت اثرات رہے۔ معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر اور ملکۂ ترنم میڈم نور جہاں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ دونوں خواتین بارعب شخصیت اور جلالی مزاج کی حامل تھیں، اس نے کمال آسانی سے اُن سے واضح طور پر (مودبانہ) اظہارِ محبت

کر دیا۔

اُس نے میڈم نور جہاں کا ایک طویل خاکہ اپنی کتاب میں لکھا اور کالموں میں بار ہا اُن کا ولولہ انگیز، گلابی اور شرارتی تذکرہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چوں کہ میڈم غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک اور حقیقی زندگی میں بڑی خاتون تھیں اس لیے اُنھیں روایتی معیارات پر ماپنا، تولنا درست نہیں۔ وہ اپنے معیار خود تخلیق کرتی تھیں۔ یہ اُن جیسی دبنگ عورت ہی کہہ سکتی تھی ''میں حُسن پرست ضرور ہوں مگر بدکردار نہیں۔''

خالد حسن پاکستان ٹائمز میں کام کر رہا تھا۔ اُس کی ذمّے داریوں میں فلم، ثقافت اور ایسے دیگر معاملات کو دیکھنا شامل تھا۔ انھی دِنوں میڈم اور اُن کے شوہر اعجاز کی طلاق کا معاملہ چل رہا تھا۔ خالد نے اس پر کام کرنے کا طے کیا، ڈائریکٹری سے با آسانی میڈم کا نمبر حاصل کر لیا اور کچھ ردوقدح کے بعد میڈم کو ملاقات کے لیے آمادہ کر لیا۔ لاہور کی موجودہ لبرٹی مارکیٹ کے قریب میڈم کے بڑے بنگلے کے نفیس ڈرائنگ روم میں خالد کے لیے شاہانہ سلور ٹرالی میں چائے لائی گئی اور پھر میڈم آ گئیں۔ میڈم نے قیمتی سفید ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور اُن کی انگلیوں پر ہیرے کی انگوٹھی دمک رہی تھی۔ میڈم نے چائے کا کپ تیار کیا تو اُن کے سونے کے چمکتے لشکتے بریسلٹ آپس میں ٹکرا کر بج اُٹھتے۔

پس پہلی ملاقات کی سفید ساڑھی میں ملبوس، ہیرے اور سونے میں دمکتی خیرہ کن نور جہاں خالد حسن کی یادداشت میں یوں محفوظ ہوئیں کہ بعد کی ملاقاتوں میں گلابی، فیروزی اور دیگر رنگ کے ملبوسات اور مختلف زیورات میں دیکھنے کے باوجود پہلی ملاقات کا تاثر سب سے مضبوط رہا۔

بعد میں میڈم نے خالد حسن کو بتایا کہ جب لاہور کے پنچولی اسٹوڈیو میں پہلی مرتبہ داخل ہوئیں تو وہ نوخیز اور نوآموز تھیں۔ وہاں اُنھوں نے بلند قامت اور پُر وقار خاتون کو دیکھا جس نے سفید رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ اکثر اسٹوڈیو آتی اور سفید ساڑھی ہی میں آتی۔ وہ خوب صورت خاتون اتنی پُر اعتماد اور پُرسکون ہوتی کہ مَن موہنی نور جہاں کے دِل پر نقش ہو گئی اور اس کی طرح میڈم نے سفید لباس زیب تن کرنا شروع کر دیا۔

ویسے دیکھا گیا ہے کہ ابتدائی زندگی کے تاثر اتنے دیرپا اور طاقت ور ہوتے ہیں کہ بعض اوقات پوری زندگی کا رُخ اور رنگ روپ متعین کر دیتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے معاملات میں بیٹے، دانستہ و غیر دانستہ باپ کی اور بیٹیاں ماں کی تقلید و نقل کرتے ہیں۔

نور جہاں سُنایا کرتیں کہ وہ فقط پندرہ برس کی تھیں جب اُن کے ہاں ولادت ہوئی (خالد حسن نے اُن کی ماں بننے کی عمر سترہ برس بتائی)۔ نور جہاں جب ماں بنیں تو خود چھوٹی سی بچی تھیں۔ صحیح معنوں میں اُنھوں نے اپنا بچپن اور لڑکپن دیکھا ہی نہیں۔

صبح ریاض کے بعد ایک استاد نور جہاں کو پڑھانے آتا تھا۔ ننھی نور جہاں کے لیے ریاض، تعلیم اور مشق مشکل ہو جاتے چناں چہ ایک روز اس نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماں نے نور جہاں کو زندگی میں پہلی مرتبہ تھپڑ مارا اور کہا ''نہیں، تم پڑھو گی۔'' چناں چہ بعد میں نور جہاں، ماں کی شکر گزار ہوئیں۔ آج لوگ کسی اداکارہ کے غلط انگریزی زبان و تلفظ کا مذاق اُڑاتے ہیں، یہ نور جہاں کی سی ذہین عورت ہی تھی جو واجبی تعلیمی استعداد کے باوجود عمدہ اُردو بولتی، شین قاف درست رکھتی اور اس کے اپنے الفاظ میں، انگریزی میں ''گزمڑ'' کر لیتی تھی۔

نور جہاں اپنے بچپن کو حسرت سے یاد کرتے ہوئے کہتیں ''بچپن کو گزرے بہت عرصہ ہو گیا لیکن مجھے آج بھی محسوس ہوتا ہے جیسے میں قصور کے بازار سے اپنے والد کے شانوں پر بیٹھ کر گزر رہی ہوں اور کندھوں کی بلندی سے لوگ چھوٹے نظر آ رہے ہیں اور میں دکانوں میں سجی چیزیں دیکھتی جا رہی ہوں۔''

خالد حسن نے نور جہاں سے کئی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات کا احوال بارہا بیان کیا۔ گویا وہ میڈم کے ذہنی رویے اور رجحان کا تذکرہ کرنا چاہتا تھا۔

ذاتی زندگی میں والدین کے بعد وہ فلمی دنیا میں موسیقار ماسٹر غلام حیدر کی بے پناہ عزت کرتی تھیں جنھوں نے اُنھیں مائکروفون کے سامنے کھڑے ہونے، گاتے ہوئے سانس لینے اور ''ہائے''، ''محبت'' اور دیگر کئی الفاظ کی ادائی سکھائی تھی۔ خالد حسن سے اُس ملاقات میں نور جہاں نے اپنے بچپن کی غربت کا حوالہ دیتے ہوئے والدین کی محبت اور شفقت کا بہت دل گیری سے تذکرہ کیا اور کہا تھا ''میرے والدین نے مجھے سکھایا تھا کہ کوئی انسان آپ کو دائمی خوشی نہیں دے سکتا۔ حقیقی خوشی انسان کے دل کی تہ میں چھپی ہوتی ہے جو خود تلاش کرنی ہوتی ہے۔ میرے والد اکثر مشہور شاعر کبیر کے اشعار پڑھا کرتے جن میں سے ایک شعر اکثر ان کی زبان پر رہتا جس کے معنی ہیں ''اے کبیرا تیری جھونپڑی جل کٹیوں کے پاس، جو کریں گے، سو بھریں گے، تو کیوں پریشان۔''

پدرسری دور کے مردانہ معاشرے میں ایک نازک اندام لڑکی سے کام یاب عورت تک کے سفر نے نور جہاں میں احساسِ ملکیت اور جلال بھر دیے۔ اسی کا شاخسانہ تھا کہ ایک مرتبہ جب خالد حسن میڈم کے گھر میں حسن لطیف سے ملا تو میڈم نے تعارف کرواتے ہوئے کہا ''یہ میرے گینگ کا آدمی ہے۔''

نور جہاں کو اس بات سے کد تھی کہ کوئی کھانے کی دعوت پر گھر بلائے اور بعد ازاں گانے کا مطالبہ کرے۔ البتہ ایک مرتبہ خالد حسن اُن کے ہاں لان میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اوائل گرمیوں کی شام تھی اور وہاں نور جہاں نے خالد کے لیے پنجابی کا مشہور گیت گنگنایا تھا ''جدوں ہولی جئی لیندا میرا ناں، میں تھاں مر جانی آں۔''

اردو کی مشہور اور اہم ترین ادیبہ قرۃ العین حیدر نے تو خالد حسن کے لیے کچھ نہ گنگنایا تھا پر وہ انھیں بے اختیار کہہ اُٹھا تھا ''عینی! آئی لو یو۔''

قرۃ العین حیدر کے ساتھ خالد حسن کا ایسا اَن مول تعلق رہا جس میں کئی ملاقاتیں رہیں، درجنوں خطوط کا تبادلہ ہوا، رسمی انٹرویو ہوا اور ٹیلی فون پر وہ باہم رابطے میں رہے۔ خالد حسن نے انھیں اُردو ادب کی ''حاضر امام'' قرار دیا۔

روشنیوں سے منور پرانے دَور کے کراچی کی الفنسٹن اسٹریٹ اور وکٹوریا روڈ کو آپس میں ملانے والی سڑک پر موجود کیپٹل سینما میں خالد نے پہلی مرتبہ قرۃ العین حیدر کو دیکھا تھا۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب وہ ابھی پاکستان میں قیام پذیر تھیں، بھارت میں مستقل سکونت اختیار نہ کی تھی۔ اُس سینما میں فلیمنگو نام کا ایک کیفے تھا جو سیاہ اسٹیل فرنیچر سے سجا ہوتا تھا اور نیم تاریک رہتا تھا۔ کیفے میں قرۃ العین حیدر زرد ساڑھی اور سبز بلاؤز میں ملبوس، اپنی ایک دوست کے ہم راہ بیٹھی تھیں۔ تب خالد اُن سے تعارف اور بات کرنے کی ہمت نہ باندھ سکا۔ پہلی ملاقات تک دو دہائی سے بڑھ کر عرصہ حائل ہو گیا۔ پہلی ملاقات بمبئی میں قرۃ العین کے فلیٹ میں ہوئی۔ خالد نے انھیں اگلے روز اپنی جائے قیام، تاج ہوٹل میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ یوں یہ سلسلہ رسمی ملاقاتوں سے بڑھ گیا۔ اس میں احترام کے ہم راہ خلوص اور بے تکلفی دَر آئے۔ یہاں تک کہ قرۃ العین اپنے افسانوں کا پس منظر اور ادبی اسکینڈل تک بیان کر دیتیں۔ ایک آدھ اسکینڈل خالد حسن نے گپ شپ میں ایک دوست سے بیان کر دیا جس نے اسے اخباری خبر بنا دیا۔ اس پر قرۃ العین کچھ عرصے کے لیے خاصی ناراض ہو گئیں۔ اسی طرح وہ اپنے ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' کی کہانی کے حوالے سے جھنجلاہٹ کا اظہار کرتی تھیں۔ یہ لکھنؤ کی ایک خستہ حال، لاوارث طوائف کی کہانی ہے جو اپنی بیٹی کے باپ کی تلاش میں کراچی چلی جاتی ہے۔ وہاں چند برس مصیبتیں کاٹ کر تباہ حالی میں ہندوستان لوٹ آتی ہے اور سلائی، کڑھائی، دست کاری کی آمدنی سے بہ مشکل گزارا کرنے لگتی ہے۔ چند قارئین نے اسے قرۃ العین کی سوانحی کہانی کہا جو ان کی جھنجلاہٹ کا باعث بنا۔ اس میں سوائے قرۃ العین کی چند برس کے لیے پاکستان آمد کے، کچھ بھی مماثل نہ تھا۔ اسی طرح 'فوٹوگرافر' نامی افسانے کی ڈانسر سے بھی قرۃ العین کو ملایا گیا جو بیس برس بعد اس جگہ آتی ہے جہاں کبھی وہ اپنے دوست کے ساتھ آئی تھی۔ درحقیقت ''فوٹوگرافر'' سری لنکا میں کینڈی کے ایک گیسٹ ہاؤس میں مقیم ساؤتھ انڈین ڈانسر کے گرد بُنی گئی تھی۔ اس معاملے کا قرۃ العین حیدر کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

''ادب کی خاتونِ اوّل'' عنوان کے مضمون میں ایک خرد افروز مکالمے کا ذکر ہے۔ قراۃ العین حیدر خالد حسن سے کہنے لگیں ''آؤ میں تمھیں 'وقت' کا تصور سمجھاؤں۔'' یہ 1980 کی دہائی کی بات

ہے۔ ''تم ساٹھ کی دہائی کو کتنا پرانا محسوس کرتے ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔ خالد نے جواب دیا'' یہ کل ہی کی بات لگتی ہے''۔ عینی نے سمجھایا ''یعنی چوتھائی صدی تمھیں کل کی بات لگتی ہے۔ اب ساٹھ کی دہائی میں کھڑے ہو کر چوتھائی صدی پیچھے چلے جاؤ، تب یہ بھی تمھیں پچھلے کل ہی کی بات لگے گی۔'' خالد نے لکھا'' جب میں نے اس بات پر غور کیا تو میں پلک جھپکتے میں 1935 میں چلا گیا۔ جب میں اس بات کا ادراک کر پایا تو حیران رہ گیا۔'' قرۃ العین نے بات بڑھائی ''اگر تم چوتھائی صدی کی اکائی کو استعمال کرتے ہوئے مزید پیچھے چلے جاؤ تو 1910 میں پہنچ جاؤ گے۔ گویا ابھی پہلی جنگِ عظیم کو شروع ہونے میں چار برس باقی ہیں۔ یوں اکائیاں بنا کر چلو تو ''وقت'' (بہ معنی رفتارِ دوراں: ع ج) کو کچھ سمجھ جاؤ گے اور جان لو گے کہ وقت کس طرح گزرتا ہے۔''

1999 میں جب قرۃ العین حیدر اسلام آباد میں اپنی کزن بیگم جری احمد سیّد (مشاہد حسین سیّد کی ساس) کے ہاں ٹھہریں تو ان کے اعزاز میں پُرتکلف ضیافت کا بندوبست کیا گیا۔ واپسی پر قرۃ العین کی کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے خالد حسن نے کہا تھا ''عینی آئی لو یو۔'' اُس نے دل و جان سے قرۃ العین سے عقیدت آمیز، ارادت مندانہ محبت کی تھی۔

خالد حسن جس سے محبت کرتا تھا، حد سے بڑھ کر کرتا تھا اور اپنے ممدوح کے ناقدین کے لیے وہ دانتوں میں آیا لوہے کا چنا ہو جاتا تھا۔ اکثر اوقات وہ تعریف میں اس درجہ بڑھ جاتا کہ فقط ماورائی خوبیوں کو اپنے ممدوح سے منسلک کرنے کی کسر باقی رہ جاتی۔ وہ یقیناً انسانِ خاکی تھا سو خطا کار بھی تھا۔ اُردو زبان کے اعلیٰ دماغوں قرۃ العین حیدر، فیض احمد فیض، احمد فراز، اے حمید اور دیگر کے قریب رہنے کے باوجود بعدازاں وہ عملی زندگی میں انگریزی زدہ اشرافیہ تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ غالباً مغرب میں طویل قیام سے اس کی حسیات وہاں کی عادی ہو گئی تھیں اور اس سے مماثل طبقے میں زیادہ آسانی پاتی تھیں۔

خالد کی فیض صاحب سے محبت اس درجے بڑھ گئی کہ ان کے ناقدین کی جانب اُس کی شعلہ بار نظریں اُٹھتیں تو کبھی پیمانے چھلک جاتے۔ البتہ چند لمحات آ گہی اُس پر اُن معاملات کے پہلو ہائے دیگر عیاں کر دیتے۔

وہ کوئی ایسا ہی لمحۂ خود فراموشی یا عصرِ آ گہی تھا جب وہی بھٹو جس کی خاطر اُس نے نوکری چھوڑی، در بہ در ہوا، پر آخری عمر تک اُس کا معتقد رہا، کے بارے میں کہہ اُٹھا ''بھٹو کو اپنے دوستوں کے اخلاص پر ہمہ وقت شک رہتا تھا۔ وہ ذاتی تنقید پر بہت حساس تھا اور عوامی خزانے کو غیر ضروری خرچ کرنے پر ذرّہ برابر نہ چُوکتا تھا۔''

بے نظیر سے اُس کا خاصا قریبی تعلق رہا تھا اور اس کی بے وقت موت پر وہ حد درجے آزردہ رہا تھا

پر مضمون لکھتے ہوئے اُس کی ذاتی خامیوں اور انتظامی کمزوریوں سے صرف نظر نہ کیا۔

اُس کی محبت کا اعجاز تھا کہ اگر وہ اپنے پرانے ساتھیوں کا اتنی محبت سے تذکرہ نہ کرتا تو دنیا زمرد ملک کے جینئس سے ناواقف ہوتی اور چاچا محمد دین کو بھی نہ جانتی ہوتی جو مرے کالج کے باہر مالٹے بیچتا تھا اور جس کا ذکر خالد اُسی سانس میں کرتا تھا جس میں ذلفی بھٹو کا کرتا تھا۔

اُس کا اور فیض کا شاعری، بائیں بازو کی سیاست اور زندگی کے عمدہ ذوق کے علاوہ ایک اور شوق بھی مشترک تھا، کرکٹ! فیض احمد فیض نے بہت دیر تک شوقیہ طور پر کرکٹ کھیلی۔ وہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہوتے ہوئے بھی ایک کرکٹ میچ کھیلے تھے۔ فیض کے ایک ایسے انٹرویو کا حوالہ بھی خالد حسن کی تحریروں میں موجود ہے جس میں انھوں نے سارا معانی خیز انٹرویو ''کرکٹ کی زبان'' میں انور حمیدی کو دیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ فاسٹ باؤلنگ سے خوف زدہ ہوتے ہیں تو وہ بولے ''میں نے کبھی ہیلمٹ نہیں پہنی۔'' جب انھیں یاد دلایا گیا کہ اُنھیں ہیلمٹ پہننے کے مواقع بہم میسر رہے تو وہ بولے ''میں مختلف طرح کا کھلاڑی ہوں۔'' ''کیا آپ کبھی کلین بولڈ ہوئے؟'' اس سوال کا جواب تھا ''کبھی نہیں۔ البتہ کئی مرتبہ دائیں جانب پر کیچ ہوا ہوں۔ ہماری بائیں جانب خاصی طاقت ور رہی ہے۔'' جب فیض صاحب سے پوچھا گیا کہ سلیکشن کمیٹی ہمیشہ ان کے خلاف کیوں رہی ہے تو وہ برجستگی سے بولے ''اگر کھلاڑی خود سلیکشن کمیٹی کے خلاف ہو تو سلیکشن کمیٹی کیا کر سکتی ہے؟'' پوچھا گیا ''کیا آپ اچھے فیلڈر تھے؟'' جواب تھا ''نہیں۔ ہم نے کئی چوکے پاس سے گزرنے دیے۔'' سوال تھا ''کیوں؟'' کیا معنی خیز جواب تھا ''کیوں کہ ہمیں جھکنا نہیں آتا۔'' ''کیا آپ نے کبھی باؤلنگ کی؟'' ''جی ہاں، بائیں بازو سے گگلیاں۔''

فیض صاحب نے ستر برس کا ہونے کے بعد ایک خط میں خالد حسن کو لکھا کہ لکھنؤ، الٰہ آباد، بھوپال، بمبئی وغیرہ میں ان کی سال گرہ پر تقریبات منعقد کی گئیں۔ البتہ لاہور میں اس جشن سے وابستہ تمام افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ بہ قول شعیب ہاشمی کے، جب سارا طائفہ کوٹ لکھپت جیل پہنچا تو ایک قیدی نے ان سے پوچھا ''کون سی پارٹی؟'' اس پر شعیب ہاشمی نے جواب دیا ''برتھ ڈے پارٹی۔''

ضیاالحق کے دَور میں خالد حسن نے فیض صاحب کو لکھا کہ وہ ضیا کے خلاف ہنگامہ آرائی اور معرکے کا حصہ نہ ہونے پر لندن میں قیام پر افسردہ ہے تو فیض صاحب نے لکھا ''معرکے'' سے باہر ہونے پر اسے افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت موسیٰ سے مارکس اور لینن تک سبھی نے وہی کچھ کیا جس کی حالات نے اجازت دی۔ یہ ہرگز تقاضائے دانائی نہیں کہ انسان غیر ضروری مصیبت کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے۔ انھوں نے ایک چینی مقولے کا بھی حوالہ دیا ''جب سیاست کی گنجائش نہ ہو تو بہترین راستہ یہ ہے کہ انسان خوب محنت کرے، دل جمعی سے مطالعہ کرے اور خیر خواہ، دوست بنائے۔''

سام راجیت اور اس کے بہی خواہوں کے حوالے سے خالد حسن کا قلم ترش و سنگین ہو جاتا۔

زیڈ اے سلہری معروف صحافی اور دانش ور تھے۔ اُنھیں ایوب دور میں کرنل کا اعزازی رینک دیا گیا اور انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ ان کے بارے میں خالد حسن نے اپنے مخصوص انداز میں جملہ کسا ''سلہری صاحب کو وردی میں دیکھ کر مرحوم بریگیڈیر محمد عثمان کا اردلی بھاگا بھاگا جی ایچ کیو آیا اور بولا کہ اُس نے ابھی ایک 'نقلی کرنل' دیکھا ہے۔ اسی طرح اُس نے لکھا ''چند بریفنگز اور پریس کانفرنسوں کے بعد غیر ملکی اخباری نمایندے سلہری کو ایس ایس ڈبلیو کہنے لگے بہ معنی لال بہادر شاستری (بھارتی وزیر اعظم) کا خفیہ ہتھیار۔''

سام راج کے خلاف جدوجہد کے حوالے سے اور بھٹو کی بیٹی ہونے کے ناتے خالد حسن کو بے نظیر بھٹو سے حد درجے ہم دردی تھی۔ وہ ہر وقت بے نظیر بھٹو کے ساتھ رابطے میں رہتا۔ وہ اسے اپنی حکومت میں اہم ذمے داری بھی دینا چاہتی تھیں پر چند مخصوص حلقوں کے تحفظات کی وجہ سے ایسا نہ کر پائیں۔

ایک مرتبہ اُس نے بے نظیر کو اُن کی چند پرانی تصاویر بھیجیں۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور شکریے کی ای میل کی جس میں لکھا ''اے کاش میں پہلے جتنی دبلی پتلی ہو سکوں۔ مگر یہ خاصا مشکل کام ہے۔''

اپنی سال گرہ پر بے نظیر نے 2003 میں خالد حسن کو لکھا ''میں نے شاہ لطیف کی، ملیر کی ماروی سے متاثر ہو کر 'بے نظیر کی کہانی' کے عنوان سے نظم لکھی ہے۔ ماروی دیس بدر ہوئی تھی اور اپنے وطن کو یاد کرتی تھی جیسا کہ میں کرتی ہوں۔ جب میں نے ماروی کی داستان پڑھی تو میں اس سے بہت متاثر ہوئی اور میں نے اسے موجودہ حالات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔''

پاکستان کے اقوامِ متحدہ میں ایک سفیر کی سفارش کرتے ہوئے خالد حسن نے بے نظیر کو آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ متعلقہ صاحب انتہائی باصلاحیت ہیں اور ان چند سندھی لوگوں میں سے ہیں جو فارن سروس میں موجود ہیں۔ اس پر بے نظیر نے اصولی اور بے لچک موقف اپناتے ہوئے لکھا ''خالد بھائی! وہ شخص عورت پر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ پیپلز پارٹی عورتوں کے حقوق کے بارے میں بہت مضبوط موقف رکھتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو کسی خاتون پر ہاتھ اُٹھا سکتا ہے، میری نظر میں، پاکستان کی نمایندگی کا ہرگز اہل نہیں۔'' نیرنگیٔ زمانہ دیکھیے، خموشی گفت گو ہے، بے زبانی ہے زباں مری۔

انوکھا، دوستوں کا لاڈلا، کھیلن کو ماضی کا نقرئی چاند مانگنے والا خالد حسن 2009 کو قریباً چوہتر برس کی عمر میں واشنگٹن میں فوت ہو گیا۔ پاکستان کی ثقافت و ادب سے عشق کرنے والا اور سیاست میں سرگرم رہنے والے ذہین و فطین انگریزی زبان کے ادیب، مترجم، نامہ نگار اور کالم نگار کو عمرِ عزیز کی آخری دہائیاں بہ سلسلۂ معاش بیرونِ وطن گزارنا پڑیں۔ اُس کا دل یہاں کے سونا رنگے گیہوں کے کھیتوں، رہٹ کے

ٹھنڈے ٹھار پانیوں، چاندی رنگے آبشاروں، قدیم شہروں کی پُر پیچ و پُراسرار گلیوں چوباروں اور رنگا رنگ بولیوں کے ساتھ ایک طلائی زنجیر سے بندھا رہا، ارضِ پاک کے میدانوں، ویرانوں کی دھول اُس کی آنکھوں کا سُرمہ بنی رہی۔

اس جھوٹ کے بیوپار میں یہ بھی ایک جھوٹ ہوگا، اگر کہا جائے کہ خالد حسن کے جانے سے دنیا میں ایک نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ زندگی کی رَوایتی رفتار سے چلتی رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ نئے چہرے اُبھرتے اور پرانے ڈوبتے رہیں گے۔ امریکا کے ایک اسپتال کی نرسیں تو اب تک اُس ایک بوڑھے شخص کو بھول بھی چکی ہوں گی جو آخری وقت میں تنہا تنہا، اُداس اُداس تھا اور اس کا جی اپنے وطن جانے کو ترستا تھا۔ میرے وطن کے کیا کیا نامی اور نابغے تھے، جنھیں لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، رزق کی تلاش میں غریب الوطن ہوئے، یورپ و امریکا میں گم نام ہوگئے۔ وہ نرسیں کیا جانتی ہوں گی کہ اُن کے سامنے وہ شخص لیٹا ہے جس نے تیسری دنیا کے ایک ملک میں سیاسی انقلاب کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا، اُس مختصر خفیہ اجلاس کا حصہ تھا جس میں بھٹو نے ملتان میں ایک شامیانے کے نیچے ایٹم بم بنانے کا عہد کیا تھا اور وہاں موجود گنتی کے چند ایٹمی سائنس دانوں نے تین برس میں اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا تھا۔

واشنگٹن کے لوگ کیا جانتے ہوں گے کہ وہ ایک بوڑھا سا شخص جوان کے بیچ فٹ پاتھ پر تیز برفانی ہواہیں اوورکوٹ کے کالر اونچے کیے تنہا کندھے جھکائے چلا جاتا تھا، وہاں سے ہزاروں میل دور ایک پاک زمین کا قابلِ فخر بیٹا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو زندہ رہے گا سو بے نظیر بھی، قرۃ العین حیدر کا تذکرہ ادب میں ہوتا رہے گا اور فیض کا بھی، نور جہاں بھی گائیکی میں امر رہے گی، شہر سیالکوٹ کی رونقیں آباد رہیں گی اور شہر لاہور دائم آباد رہے گا۔ مگر خالد حسن کی موت کے ساتھ زمرد ملک اور چاچا محمد دین ہمیشہ کے لیے مر گئے۔

11:20 PM
محمد
رکن

پارو

پروین شاکر

پروین شاکر دادی بنی تو اُسے فوت ہوئے اُنیس برس پانچ روز گزر چکے تھے۔

سارے میں پروین مدّھم لوری، گیت، مرثیے، اپنے بیٹے گیتو کو پکارتی ہوئی، سرگوشی کرتی صدا گونجتی ہے اور دل کو مَسل دینے والے نوحے'' گھبرائے گی زینب'' پر دھیرے دھیرے دم توڑ دیتی ہے۔

پروین، بانو، بینا، پارہ، پاروایک ہی لڑکی کے نام ہیں جو نہ جانے تب کتنی تنہا تھی جب اُس کے بالوں کی لٹ اُس کی کشادہ خوں آلود پیشانی چوم رہی تھی اور وہ بہ مشکل سانس لے رہی تھی۔ وہ جورات کی رانی کی مہک کی عاشق تھی، موتیے کے پھولوں کے پاس چہل قدمی کیا کرتی اور گلاب کی ڈالیوں کے پاس دیر دیر تک کھڑی رہتی تھی، اس کے اِردگرد موت کی بو پھیلی تھی۔

یہ بو اُسے تب سے تنگ کر رہی تھی جب سے وہ اپنی سہیلی رفاقت جاوید کے ہم راہ دِلّی میں شہرت یافتہ جوتشی چوہان سے مل کر آئی تھی۔ چوہان ایک معروف نجومی تھا۔ اُس سے ملنے کے خواہش مند دور ممالک سے بھارت آتے تھے۔ رفاقت جاوید کے شوہر دہلی کے پاکستانی سفارت خانے میں سفارت کار تھے، سو جوتشی کو اُن کی آسان دست رَس میں سمجھتے ہوئے پروین نے اُس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جوتشی چوہان کا عالی شان گھر دہلی کے سرسبز وشاداب نواح میں واقع تھا۔ بنگلے کے صحن میں گلابوں اور اگربتیوں کے دھوئیں کی باہم گھلتی ملتی مہک ماحول میں فسوں پھونکے رکھتی۔ پروین شاکر وہاں گئی تو اُس کی آنکھوں میں بے یقینی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ایسے شعبدہ بازوں پر یقین نہ رکھتی تھی۔ البتہ جب وہ واپس آئی تو اُس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں اور چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ایسا کیا ہوا تھا جس نے پروین کی سی پُر یقین خاتون کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

جب چوہان نے پروین کو اپنے کمرے میں طلب کیا تو اُس نے جلدی سے اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ لیا اور چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

کمرے میں وہ، سہیلی رفاقت اور ان کے شوہر جا کر جوتشی چوہان صاحب کے سامنے مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ چوہان صاحب نے بہ غور پروین کی طرف دیکھا، اُس کا سنِ پیدائش معلوم کیا، والدہ کا نام پوچھا اور اُس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں بولے'' بیٹا! عمر بہت چھوٹی لکھوا کر لائی ہو۔''

اس سے پہلے چوہان نے پروین کو اس کی تعلیم کا سرسری بتایا جسے اُس نے سنجیدگی سے نہ لیا تھا۔ البتہ جب انھوں نے عین حقیقت کے مطابق کہا'' بیٹا اب تک چار کتابیں لکھ پائی ہو، بہت شہرت بھی کمائی اور اس کی قیمت بھی خوب ادا کی'' تو پروین چونک گئی۔ نجومی کاغذ پر حساب لگا رہا تھا۔ اُس کی غم گین آواز کمرے میں گونجی'' ان چار کتابوں کے بعد پانچویں کتاب نظر نہیں آ رہی۔ تمھارا بہت بڑا حادثہ ہوگا، ڈرائیور موقع پر مر جائے گا۔'' پروین نے اُن کی بات کاٹی'' میں تو بچ جاؤں گی؟'' چوہان نے پروین کی بے چینی اور

پریشانی کو بھانپتے ہوئے اُسے مصنوعی دلاسا دیا ''تم ٹانگ سے محروم ہو جاؤ گی۔ خون، خون نظر آرہا ہے۔'' یہ سن کر پروین نے اضطراری کیفیت میں اُن کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا کر گود میں رکھ لیے۔

چوہان بولتے چلے گئے ''رام رام، تمھارا ماضی تمھارا پیچھا نہیں چھوڑتا، تمھاری ساس سخت مزاج تھی، تمھیں تصویر اُتروانے سے نفرت ہے۔'' انھوں نے جس تیقّن سے درست طور پر پروین کے ماضی کے حالات وواقعات کا نقشہ کھینچا۔ پروین کو اُن کی اپنے حادثے اور چار کتابوں تک محدود زندگی کی پیش گوئی پر یقین آ گیا۔ وہ سوچوں کے دھندلکے میں کھوگئی اور گُم سُم ہوگئی۔

گم تو وہ بچپن میں بھی اپنی چیزیں کر دیا کرتی تھی مگر تب گم سُم تو وہ ہرگز نہ تھی۔

جوتشی کا واقعہ اور دیگر کئی واقعات پروین شاکر کی سہیلی رفاقت جاوید نے اپنی کتاب ''پروین شاکر، جیسا میں نے دیکھا'' میں بیان کیے ہیں، اُس کے بچپن کا صحیح معنوں میں کھوج احمد پراچہ نے ''پروین شاکر، احوال وآثار'' ڈاکٹر سلطانہ بخش نے ''پروین شاکر۔ شخصیت اورفن'' میں لگایا ہے اورفن وشخصیت پر وقیع مقالہ مالیر کوٹلا، ہندستان کی ڈاکٹر روبینہ شبنم نے تحریر کیا اور دیگر بے شمار تحریریں سامنے آئیں، طویل اور چشم کشا انٹرویو آصف فرخی نے 18 مئی 1985 کو لیا۔ پروین کے کئی دوستوں اور شناساؤں سے گفت گو ہوئی تو اُس کی شخصیت کے برفانی پربت کے فقط چند پہلوؤں پر سنہری، گلابی دھوپ پڑی اور ایک شبیہ واضح ہوگئی۔

پروین شاکر کی شاعری سے میری شناسائی میرے اسکول کے زمانے میں ہوئی۔ میرا ایک دوست بابر بیگ ہر دوسری بات کے ساتھ یہ مصرع ٹانک دیا کرتا تھا ''بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی'' مثلاً 'میں نے بہت محنت کی مگر فلاں مضمون میں فیل ہوگیا' بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی یا پھر 'رات میں نے ابا جی کے بستر پر چادر کے نیچے باجا رکھ دیا۔ وہ چادر پر بیٹھے تو باجا بج اُٹھا۔ پتا چلنے پر ابا جی نے میری خوب مرمت کی 'بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی' یہ مصرع اُس کا تکیۂ کلام بن چکا تھا اور اس تکرار سے گفت گو میں شامل رہتا کہ میری سماعت کا حصہ بن گیا۔ اِس کو وہ ایسے دشوار مقامات اور جملوں میں غیر متوقع طور پر استعمال کرلیا کرتا کہ غالباً پروین شاکر نے اسے لکھتے وقت اس کے ایسے نکتہ آفریں اور پرمعانی استعمال کا سوچا بھی نہ ہوگا۔ تب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ مصرع کس کا ہے۔ لڑکپن کی کم علمی کا دور تھا۔ بعد میں پروین شاکر کے بارے میں پڑھا تو معلوم ہوا کہ میں اب تک کئی مصرعے سنتا آیا تھا جو عام گفت گو میں استعمال ہوتے تھے اور ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے تھے، پروین شاکر نامی نوجوان، منفرد اور پراثر شاعرہ کے تھے۔

اردو شاعرات میں سب سے اہم اور زیادہ شہرت پانے والے چار شعری مجموعوں اور ایک کلیات،

کئی کالموں اور نثری تحریروں کی خالق پروین بانو شاکر نے انگریزی ادبیات میں ماسٹرز کیا تھا۔ وہ بہاری اور سرتاپا شیعہ تھی، متوسط خاندان سے تعلق تھا، والد شاعر، نانا شاعر تھے اور دیگر کئی ننھیالی عزیز اسپ شاعری کے سوار تھے۔ بیوروکریسی کا حصہ بنی، ہارورڈ ایسے بین الاقوامی موقر ادارے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، صبح کے وقت پیدایش ہوئی اور صبح ہی کے وقت وفات ہوئی، بہ وقتِ ولادت بارش ہو رہی تھی اور انتقال کے وقت بھی مینہ برس رہا تھا۔ ایک مجموعے کا نام خود کلامی تھا اور اپنی مختصر زندگی میں زیادہ تر خود ہی سے کلام کیا۔ عجب دلیر عورت تھی کہ کئی مردوں کی سی زندگی جی گئی اور ایسی چھوئی موئی سراپا نسوانیت تھی کہ اپنی تمام تر دل آویزی کے ساتھ زندگی کی بہتی ندی میں ماہِ تمام کے عکس کی مانند ہاتھ بھر فاصلے پر ہونے کے باوجود کوسوں دور رہی۔

پروین کے والدین کا تعلق صوبہ بہار کے شہر پٹنا سے تھا، جہاں سے وہ قیامِ پاکستان سے دو برس قبل کراچی کی بستی چاکی واڑا میں قیام پذیر ہوئے۔ چاکی واڑا کے حوالے سے بعدازاں معروف ادیب محمد خالد اختر نے 'چاکی واڑا میں وصال' نامی ناول لکھا۔ کراچی کے ایک علاقے 'خدا کی بستی' کا شوکت صدیقی صاحب کے شان دار ناول 'خدا کی بستی' کے عنوان پر نام رکھا گیا تھا۔

پروین کے تایا جابر حسین اور منظر حسین عراق کے شہر نجف اشرف سے مذہبی تعلیم حاصل کر کے ذاکر بن گئے۔ والد سیّد شاکر حسین کو ابتدائی طور پر کراچی میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا، البتہ بعدازاں محکمہ ٹیلی فون، ٹیلی گراف میں بہ طور کلرک نوکری مل گئی۔ یوں زندگی کی کاغذی کشتی وقت کی ندی پر ڈولنے تیرنے لگی۔ پروین کے والد آٹھ بھائی اور دو بہنیں تھے۔ عجیب واقعہ ہے کہ 1930 کی ایک وبا میں صرف تین بھائی بہ شمول سیّد شاکر حسین بچے۔ 1949 میں اُن کی شادی افضل النسا سے ہوئی۔ ایک برس بعد ایک بیٹی نسرین بانو پیدا ہوئی اور تین برس بعد 24 نومبر 1952 کو فجر کے وقت کراچی کے لیڈی ڈفرن اسپتال میں پروین بانو کی ولادت ہوئی۔ اُس روز رات گئے سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ پروین بانو بعدازاں پروین شاکر کے نام سے معروف ہوئی۔ کراچی کے ایک معمولی اسپتال میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والی بے شمار دوسری لڑکیوں جیسی ایک عام سی لڑکی نے اپنی خوبی اور صلاحیت کے بل پر غیر معمولی شہرت اور مقام حاصل کر کے ثابت کیا کہ خداداد صلاحیت، مستقل مزاجی اور محنت کے سبب دنیا کے کسی معاشرے میں بھی عروج حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پارہ صفت پیاری سی پروین کو بچپن میں محبت سے ''پارو'' کہا جاتا تھا۔ بعد میں کالج کی تعلیم کے دوران، شاعری کے ابتدائی دنوں میں اُس نے اپنا تخلص ''بینا'' رکھا تھا۔

ننھی پروین لااُبالی طبیعت کی بچی تھی، اپنی چیزیں اکثر گم کر آتی، باقاعدگی سے مجالس میں جاتی اور چپل اُتار کر بھول آتی، گھر میں مرغی، خرگوش، بلی اور بکری کو بہ طور پالتو جانور رکھ کر انہماک سے اُن کا

خیال رکھنے میں مصروف ہو جاتی۔ اگر اُس کا کوئی جان ور مر جاتا تو رو رو کر بڑا حال کر لیتی اور باقاعدہ قبر بنا کر اُس کو دفنا آتی، مبادا کوئی گوشت خور جان ور اُسے کھا جائے۔

پروین شاکر کی والدہ مجالسِ عزا میں باقاعدگی سے جاتیں، پروین اُن کے ہم راہ ہوتی، واپسی پر اپنی پسندیدہ ذاکرہ بتول ترابی کے انداز میں مشق کرتے ہوئے محلے کے بچوں کو اکٹھا کر کے مرثیہ، نوحہ، سوز و سلام پڑھتی۔

حسن عسکری عظیم آبادی، پروین کی نانی کے پھوپھی زاد بھائی تھے، پیشے کے اعتبار سے ہومیو پیتھ تھے اور علم و ادب کا کچھ ایسا شستہ ذوق رکھتے کہ پروین اور اس کی بڑی بہن نسرین کی علمی و شعری تربیت کر کے ان کی زبان صاف کر دی اور شعر کے شغف اور فہم سے دونوں کے وجود معطر کر دیے۔

پروین کو گڑیا سے کھیلنے کا شوق نہ تھا، درختوں پر چڑھنا، اُن سے پھل توڑ کر کھانا اور کھیل کود پسند تھے۔ بارش پروین کی کم زوری تھی۔ وہ خود گڑیا سی تھی، جسے اُس کی والدہ ہلکے گلابی اور سبز رنگ کے فراک، چوڑیاں اور پازیب پہناتیں اور نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کا انتظام کرتیں۔ اُسے نانا کے کمرے سے ہومیو پیتھک میں استعمال ہونے والی میٹھی گولیاں بھی پسند تھیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ایسا تھا کہ وہ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتی۔ گھر کا تعلیمی ماحول اس کے ذوق کو جلا بخشتا اور شوق کو مہمیز عطا کرتا۔

ابتدائی تعلیم رائزنگ سن اسکول اور رضویہ گرلز اسکول سے حاصل ہوئی۔ درجۂ چہارم سے نعت اور تقریری مقابلے جیتتی رہی، درجۂ ہشتم میں معلّمہ نے پیش گوئی لکھ کر دی ''یہ طالبہ مستقبل کی معروف ادیبہ اور شاعرہ ہوگی'' بعد ازاں دونوں بہنوں کو سر سیّد کالج برائے خواتین میں داخلہ مل گیا۔ اس سے پہلے پروین خداداد ذہانت کے بل بوتے پر ڈبل پروموشن حاصل کر کے بڑی بہن کے برابر آ چکی تھی۔

وہ سر سیّد کالج، کراچی کی مقبول ترین طالبہ ثابت ہوئی۔ وہاں اُسے عرفانہ عزیز ایسی مشفق اور باصلاحیت معلّمہ کی راہ نمائی میسر آئی تو اس کی صلاحیتیں چمک اُٹھیں۔ ایک اعلیٰ سطحی شعری مقابلہ ہوا جس میں مختلف کالجوں کی طالبات نے حصہ لیا۔ پروین ابھی پوری طرح مشاق و پختہ شاعروں کے برعکس اوزان اور بحور سے آشنا نہ تھی۔ عرفانہ عزیز نے اُسے مشورہ دیا کہ میسر محدود وقت میں غزل نہ کہے بلکہ ایسی نظم کہے جس میں ابلاغ اور قدرے ابہام ہو۔ فارسی لفظیات اور تراکیب اُس نے یوں یاد کر رکھی تھیں کہ اُس کے ذہنی سانچے کا حصہ بن چکی تھیں۔ پروین نے نظم کہی، پہلا انعام جیتا اور کالج کی چار دیواری سے نکل کر اُس کی شہرت پھیلنے لگی۔ اُس نے ابتدائی طور پر اپنا تخلص ''بینا'' رکھا جو جلد ہی ترک کر دیا۔

چاکیواڑا کراچی کے متوسط طبقے کا مسکن تھا جہاں مختلف قومیتوں کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ بلوچ، مکرانی، متنوع خصائل و لسانی ذائقوں کے مہاجر، میمن، بوہری اور اندرونِ ملک سے ہجرت کر آنے

والے لوگ ہنڈیا میں پکتے پکوان میں ڈالے گئے مختلف مصالحوں کی طرح تھے۔ رنگ رنگ کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں، طرح طرح کی روایات سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں نظر آ جاتیں۔ بعدازاں وہ لوگ ناظم آباد آ گئے جو پڑھے لکھے متوسط اور خوش حال طبقے کا علاقہ تھا۔

بالوں کو دو چٹیا میں گوندھ کر ستھری نتھری پروین نفاست اور قرینے سے آگے بڑھتی رہی۔ اُس کی استانی عرفانہ عزیز نے اُسے یاور مہدی سے متعارف کروایا جو ریڈیو سے طلبہ کا پروگرام "یونی ورسٹی میگزین" پیش کرتے تھے۔ یوں پروین ریڈیو کے پروگراموں میں باقاعدگی سے حصہ لینے لگی۔ ایک مرتبہ یاور صاحب نے شہر بھر سے طالب علم شعرا کو ریڈیو کراچی کی عمارت میں مدعو کیا، ایک کمرے میں بٹھایا اور سادہ کاغذات تھما دیے۔ اب اناؤنسر نے اعلان کر دیا "ہمارے اسٹوڈیو میں فلاں طالب علم شعرا اکٹھے ہوئے ہیں، انھیں دو مصرعے "طرح" کے طور پر غزل کہنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ اب سے تین گھنٹے بعد یہ فی البدیہہ مشاعرہ سماعت فرمایئے گا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی نوجوان شعرا پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے مبادا اُن کا پول کھل جائے۔ کوئی بیمار پڑ گیا، کسی کو عزیز کی بیمار پرسی یاد آ گئی تو کوئی ضروری کام سے نکل گیا۔ پیچھے بس پانچ لوگ بشمول ایوب خاور اور پروین رہ گئے۔

اسی دور میں پروین نے ملک کی معروف ادبی شخصیات کے ساتھ پروگرام کیے۔ ان میں سب سے یادگار پروگرام ابن انشا کے ساتھ تھا۔ پروین ان دنوں انگریزی ادب کی طالبہ تھی اور مشہور انگریزی شاعر شیلے کی شاعری سے متاثر تھی۔ سو ابن انشا کے شعری مجموعے "چاند نگر" سے چاند کی علامات کا شیلے کی شاعری میں موجود چاند کے حوالہ جات سے موازنہ کر ڈالا اور ثابت کیا کہ ابن انشا شیلے سے حد درجے متاثر ہیں۔ پروگرام کے بعد اسٹوڈیو سے نکل کر پروین نے انشا سے پوچھا کہ کیا انھوں نے شیلے کا خوب مطالعہ کیا ہوا ہے؟ انشا نے راہ داری میں اِدھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں کہا "شیلے؟ بی بی ذرا آہستہ بولیں کوئی سن نہ لے۔"

اُنھی دنوں کی بات ہے۔ پروین محبت کے لطیف گلابی تجربے سے گزری۔ وہ پولیس میں سرکاری عہدے پر متمکن تھا اور یہ طالبہ تھی۔ یہ جذبات میں سچی تھی اور وہ وعدوں کا پاس دار تھا۔ یہ اُنھی دنوں کی بات ہے کہ اُس کے کچے وجود پر محبت کے دیرپا نشانات یوں ثبت ہو گئے جیسے نرم پتھر پر مہاتما بدھ کے پیروں کے نقش آج بھی بدھ مندروں میں محبت و عقیدت سمیٹتے ہیں۔ وہ کچی امبی کی کھٹی کنواری مہک لیے ہوئے تھی اور اُس کا محبوب اُس کے بہ قول برسات کی خوشبو کے مانند تھا۔ اس سے پہلے اُس کی بچپن میں ایک سگائی ہو چکی تھی جو فریقِ ثانی کے کم تعلیم یافتہ اور بے جوڑ ہونے کے باعث دونوں خاندانوں نے بہ رضا و رغبت ختم کر لی تھی۔

اب کے جو پروین نے محبت کے صندل کو چھوا تو اس کا وجود معطر ہو گیا۔ اُسے ایک قریبی خیر خواہ نے منع کیا تو وہ بہ ضد ہو گئی ''میں یہ تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ کیا جانتی تھی کہ یہ تجربہ دل کا روگ اور زندگی بھر کی کسک بن جائے گا۔

وہ ذہین، خوب رو، باوقار، برسرِ روزگار اور اس سے محبت کرنے والا تھا۔ دونوں کی جوڑی خوب سجتی تھی۔ لڑکے نے اپنے اہلِ خانہ کو رشتے کے لیے پروین کے ہاں بھیجا۔ پروین کے والد رشتہ دیکھ کر بھڑک اُٹھے۔ پروین کی یہ جرأت کیسے ہوئی تھی کہ اپنے لیے رشتہ خود تلاش کر لے اور لڑکا بھی سنّی! یہ کٹر شیعہ تھے اور وہ سنی العقیدہ۔ سو دوٹوک انکار ہو گیا۔ اس انکار نے پروین میں کونین کی گولی کی سی کڑواہٹ بھر کر اُس کے اندر سلگتے سرکشی کے الاؤ کو ہوا دی۔ بس جو کچھ پروین کے قلب و فہم میں تھا وہ بے باکی سے تمام تر نسوانیت کے ساتھ شاعری میں سامنے لے آئی۔ کمالِ ضبط کو خود بھی آزماؤں گی، میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی۔ آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو، رات بھر جاگی ہوئی جیسے دلہن کی خوشبو۔ وہ بدن کا پہلے پہل آگ چکھنا، رگ و پے میں کوئی لذت عجیب تھی۔ اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا، روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی۔

1971 میں پروین کا احمد ندیم قاسمی صاحب سے تعارف ہوا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ سیماب صفت، من چلے اور عشق پیشہ شاعر عبیداللہ علیم نے پروین شاکر کے حوالے سے قاسمی صاحب کو تعارفی خط لکھا کہ اس ذہین لڑکی کی شاعری ''فنون'' جیسے موقر رسالے میں اشاعت کی مستحق ہے۔ قاسمی صاحب نے غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو انھیں اس میں ''کام یاب عشقیہ شاعری'' نظر آئی سو انھوں نے اُس شاعری کو شائع کر دیا۔ یہ سلسلہ چل نکلا اور ایسا چلا کہ قاسمی صاحب پروین کے استاد، راہ نما اور غم گسار ثابت ہوئے۔ اُس نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو'' کا انتساب بھی اُن کے نام کیا، جنھیں وہ پیار سے عمو کہتی تھی۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ جب پروین کی شادی کا معاملہ چلا تو احمد ندیم قاسمی بہ طور خاص پروین کی درخواست پر لاہور سے کراچی آئے تاکہ ہونے والے دُلھا سے مل کر اپنی رائے دے سکیں۔ یہ بھی دل چسپ داستان ہے۔

بہرحال، پروین نے اس تعارف کے چودہ برس بعد آصف فرخی سے بات کرتے ہوئے کھل کر اعتراف کیا ''قاسمی صاحب نے میری پوری Grooming کی ہے۔ بہت سے لوگوں میں ٹیلنٹ اور جوہر ہوتا ہے۔ اگر انھیں سکھایا نہ جائے، کوئی باقاعدہ کلاس نہ سہی، لیکن یہ کہ دیکھو، اپنے شعر میں ذرا یہ لفظ تبدیل کر کے دیکھو، کیسی چمک آ جاتی ہے۔ انھوں نے مجھے اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں سکھائیں۔ یہ بھی کہ میں کیا پڑھوں، مزید کیا پڑھوں۔''

پروین اپنی زندگی کے ناول کے ایک باب کے بعد نہیں جانتی تھی کہ آیندہ باب میں کیا ہے۔ وہ

اپنی زندگی کی کتاب کی مصنفہ نہ تھی، فقط ہیروئن تھی۔ اس کہانی میں نصیر نامی کردار داخل ہوتا ہے۔ پر لطف ماجرا تو یہ ہے کہ پروین کی وجۂ شہرت اردو زبان تھی، اُس نے تعلیم انگریزی ادب میں حاصل کی، اس نے ماسٹرز کیا اور عبداللہ کالج کراچی میں نو برس تک انگریزی کی لیکچرر رہی۔ معروف ادیب اور دانش ور اسلم فرخی کراچی یونی ورسٹی میں شعبۂ تدریس سے وابستہ تھے۔ وہ گھر میں اپنی ایک طالبہ کا تذکرہ کرتے تھے جو جماعت میں اچھی شاعری پر باقاعدہ جھومتی تھی۔ وہ پروین شاکر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا، داغستان کے شاعر رسول حمزہ توف کی محبوبہ کے عاشقِ صادق کے بہ قول کوئی اور اس جیسا کیسے ہو سکتا تھا۔

پروین کے لڑکپن کے سولھویں برس کے پہلے مجنونانہ عشق اور بعد ازاں ایک سچی محبت پر شادی سے گھر والوں کے انکار نے پروین کو نفسیاتی اضمحلال سے دوچار کر دیا۔ نازک، جذباتی لڑکی تھی، قلبی سانحات سہ نہ پائی اور اسے چند ایک بار بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس کی والدہ کی ماموں زاد بہن کے بیٹے ڈاکٹر نصیر علی کو عموماً مشورے کے لیے بلایا جاتا۔

نصیر علی نے لاہور کے بہترین کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور پاکستان آرمی میں بہ طور کپتان تعینات تھا۔ اس کا خاندان 1971 کی شورش کے دوران چٹاگانگ سے کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ بہ ظاہر تو اس خاندان کے پروین کے خاندان سے خاصے خوش گوار تعلقات تھے۔ البتہ نصیر کی والدہ ایک سخت مزاج خاتون تھیں۔ پروین کے علاج معالجے کے دوران دونوں خاندانوں کو قریب آنے کا موقع ملا۔ نصیر کے دل میں پروین کو اپنانے کی خواہش اُبھری اور اس نے اس کا اصرار اظہار کر دیا۔ اُس کی والدہ ایک روایتی خاتون تھیں جو اپنے بیٹے کے لیے امیر خاندان سے گھریلو دلہن لانا چاہتی تھیں جو گھر گرہستی کے معاملات سنبھال سکے۔ پروین شاعرہ تھی، معلّمہ تھی، معروف تھی، خوش شکل تھی سو معاملاتِ دیگر بھی غلط طور منسوب ہو جاتے تھے، اور وہ نصیر کی والدہ کی خواہشات کے مطابق نہ تھی۔ جب نصیر کا اصرار بڑھا تو طوعاً و کرہاً اس کے اہلِ خانہ نے آمادگی ظاہر کر دی۔

اُدھر آمادگی سامنے آئی، اِدھر پروین کی والدہ کے دل میں وسوسے کیکڑوں کی طرح پنجے جمانے لگے۔ اُنھیں اس خاندان میں بناوٹ اور گھٹن کا احساس ہوتا۔ پروین کی والدہ نے نصیر کی ماں کو بتایا کہ پروین گھر داری کے معاملات میں کوری ہے، کھانے پکانے سے نابلد ہے، سلائی کڑھائی جانتی ہے اور نہ ہی اس میں دل چسپی رکھتی ہے۔ البتہ اسے پڑھنے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔

نصیر کی ماں نے انھیں تسلی دلائی کہ ایسی کوئی بات نہیں، سبھی لڑکیاں کہاں یہ جانتی ہوتی ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ وہ سب سیکھ لے گی۔ یہ اُس دور کی بات ہے کہ خواتین کی، سوائے طب اور تعلیم کے شعبوں کے، ملازمت معیوب سمجھی جاتی تھی، گھر داری فرائض میں شامل تھی اور عورت کے پاس انتخاب کی

گنجایش کم تر تھی۔ شادی کے معاملات بڑھے اور پروین کے وساوس میں اضافہ ہوا۔

یہاں اُسے اپنے عُمو احمد ندیم قاسمی صاحب کا خیال آیا۔ اس نے ان سے درخواست کی کہ وہ کراچی آکر نصیر سے مل کر اپنی رائے دیں۔ اس کی درخواست پر قاسمی صاحب بہ طورِ خاص کراچی آئے، نصیر، اس کے خاندان، پروین کے خاندان والوں سے بات چیت کی اور اس رشتے پر پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔

پروین شاکر کے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو'' کو 1976 میں شائع ہو کر خوب پزیرائی حاصل ہو چکی تھی۔

پروین کی شادی نصیر سے اکتوبر 1976 میں نارتھ ناظم آباد کے ''الحسن میرج ہال'' میں انجام پائی، دلہن نے سرخ قمیص، سرخ دوپٹا اور سبز پاجامہ پہن رکھا تھا اور چندرما کی طرح دمک رہی تھی۔ شادی کو سادہ رکھا گیا، منہدی کی رسم نہ کی گئی، حق مہر چودہ ہزار روپے مقرر کیا گیا، کھانے پر پابندی کے باعث صرف مشروبات پیش کیے گئے۔ یوں پروین کی زندگی کی کہانی میں اندھا موڑ آیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس موڑ کی دوسری جانب اندھی کھائی ہے یا روشن منظر۔

شادی کے بعد ایک اور معاملہ درپیش ہوا۔ اب تک ملک کے ادبی حلقے اُس کے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ چناں چہ اُس نے اپنی انا اور جدت پسند روش کے مطابق طے کیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام نہ لگائے گی۔ اس کے شوہر نے اس کا ساتھ دیا۔ یوں اس کا نام پروین شاکر ہی برقرار رہا۔

قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کی نواسی، پروین کی کلاس میں طالبہ اور پروین کی مقربِ خاص رخسانہ نے پروین کی شادی کا فوٹو گراف البم تیار کیا۔

شادی کے بعد پروین نصیر کے مشترکہ خاندان میں منتقل ہو گئی۔ اس بھرے پرے خاندان میں نصیر علی کی دو شادی شدہ بہنیں، ایک شادی شدہ بھائی بھابی اور اُس کے والدین شامل تھے۔ پروین کی سب سے پہلے اپنی بھابی سے دوستی ہوئی۔ ساس نے گھر کا کام تقسیم کر رکھا تھا۔ صبح کے ناشتے کا اہتمام بڑی بھابی کے ذمّے تھا، دوپہر کے کھانے کے معاملات ایک بیٹی دیکھتی جب کہ رات کے کھانے کی ذمّے داری پروین کو سونپی گئی۔ پروین کھانے پکانے کے معاملات سے ناواقف تھی سو پکوان کی کتابوں اور بڑی بہن نسرین کی راہ نمائی میں کھانا بنانا سیکھنے لگی۔ اسے روزانہ کئی روٹیاں پکانی پڑتیں، رات گئے تک جوٹھے برتن دھونے پڑتے اور وہ تھک ٹوٹ کر ایسی سوتی کہ کالج جانے سے پہلے پہل ناشتا کرنے میز پر آجاتی ورنہ ناشتہ نہ ملتا تھا۔

دن رات یوں ہی گزر رہے تھے کہ پروین کی زندگی کا خوش گوار ترین دور شروع ہو گیا۔

نصیر کا تبادلہ ایبٹ آباد ہو گیا۔ تب ایبٹ آباد ایک برطانوی طرز کا خوب صورت پرفضا پہاڑی شہر تھا۔ اُس میں راج دور کی بو باس موجود تھی۔ ملٹری کا اہم مقام ہونے کی وجہ سے، قریب میں کاکول اکیڈمی

،ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی آماج گاہ ہونے کے باعث ایک نظم تھا۔اُسے صنوبروں کی بستی بھی کہا جاتا تھا،
ہرسُو جنگلی ہوا، گھنے جنگل، سرسبز پہاڑیاں اور تازہ ٹھنڈے پانی کی ندیاں اور چشمے اسے خواب ناک شہر بناتے
تھے۔ پروین کے کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو وہ نصیر کے پاس ایبٹ آباد آ گئی۔ یہاں اسے ازدواجی زندگی کا
پرسکون اور بھرپور وقت گزارنے کا موقع ملا۔اس دوران نصیر کے والدین اور بہنیں بھی مختصر قیام کے لیے
آتے رہے۔ پروین اس دور کا بہت مسرت سے ذکر کیا کرتی تھی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنا تبادلہ بھی
کراچی سے ایبٹ آباد کرا لے گی۔ البتہ نصیر کے خاندان کی سوچ مختلف تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نصیر واپس
کراچی چلا آئے۔اُس کے بڑے بھائی کی بے وقت وفات کی وجہ سے بھی اُس کی والدہ بہت اُداس رہتی
تھیں۔وہ بھی ایک سعادت مند بیٹا تھا سو ایک برس بعد وہ کراچی چلا آیا۔ساتھ میں پروین بھی چلی آئی۔
یوں یہ وقت پل بھر میں گزر گیا۔ پروین کی ساس سخت مزاج تھیں اور پروین سے اُن کی تلخ کلامی چلتی رہتی
تھی۔ پروین کا سب سے غم گسار رشتہ اُس کا اپنا شوہر تھا، بعد میں بھابی تھی۔ پروین تُو تکار سے گریز کرتی
پر معاملات خرابی کی جانب بڑھ ہی جاتے۔ ایک مرتبہ پروین کا صبر جواب دے گیا تو وہ اپنے والدین کے
پاس چلی گئی۔

اس دوران نصیر نے فوج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔وہ خواہاں تھا کہ شادی چلتی
رہے۔ چناں چہ تعلق کو سدھارنے کے لیے بزرگوں کو بیچ میں ڈالا گیا اور مفاہمت کی ایک صورت سامنے آئی۔
میاں بیوی نے کرائے پر علیحدہ مکان لے کر رہنے کا فیصلہ کیا اور پروین کے والدین کے گھر کے پاس ایک عزیز
کے مکان کا حصہ کرائے پر لے لیا گیا۔

پروین کی شادی کو تین برس ہو چلے تھے۔ اب تک وہ ارادتاً خاندان بڑھانے سے گریز کر رہے
تھے۔ تین برس بعد ارادہ بدلا، ایک روز لیڈی ڈاکٹر نے اُسے خوش خبری سنائی کہ وہ اُمید سے ہے۔ میاں
بیوی نے فیصلہ کیا کہ اگر اُن کے ہاں بیٹی ہوئی تو اس کا نام شفا رکھیں گے اور بیٹے کا نام مراد علی رکھیں گے۔

20 نومبر 1979 کو پروین کے ہاں بیٹا ہوا۔ افسوس ناک امر یہ تھا کہ نصیر علی بیٹے کو اس کی
پیدائش کے دو روز بعد دیکھنے آیا۔ اُمید تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد پروین کے اپنی سسرال سے تعلقات
اچھے ہو جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ نتیجتاً جب مراد بڑا ہو رہا تھا تو نصیر صبح ملازمت پر چلا جاتا اور پروین بیٹے کو
اپنی ماں کے ہاں چھوڑ کر کالج پڑھانے چلی جاتی۔ وہ مراد کو پیار سے گیتو کہتی تھی۔ اس نام کے پیچھے ایک دل کو
چھو لینے والا واقعہ تھا جو اس نے اپنی سہیلی رفاقت کو سنایا تھا۔

''مراد چند ماہ کا تھا۔ میں اسے ہمیشہ لوری سے سلایا کرتی تھی۔ ایک رات میں ٹیبل لیمپ کی لائٹ
آف کر کے اس کے پاس لیٹی ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اپنے شہزادے کو لوری سناتی، مراد نے اپنی آواز میں

ہوں ہوں کرتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں مجھے لوری سنانا شروع کر دی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں میں نے خوشی سے مغلوب ہو کر اس کے چھوٹے نازک سے کندھے کے ساتھ اپنا سر ٹکا دیا اور محظوظ ہونے لگی۔ اس کے گلے سے وہ مدھری دھن اس وقت تک اُبھرتی رہی جب تک وہ گہری نیند میں نہ چلا گیا تھا۔ میں یہ عمل روزانہ دہرانے لگی تھی اور پھر ایک رات بے اختیاری و بے ساختگی سے اُسے گیتو کہہ کر پکارنے لگی تھی۔''

مراد کی پیدایش کے چوتھے ماہ کی بات ہے، پروین کی ماں اور بڑی بہن ہندوستان عزیزوں کو ملنے گئی ہوئی تھیں، وہ اپنے والد کی دیکھ بھال کے لیے میکے میں تھی، جب اُس نے اپنے شوقِ حصولِ علم، جستجو اور زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش کے تحت والد سے انگریزی لسانیات میں ایم اے کرنے کی اجازت طلب کی۔ والد نے اجازت دے دی۔ والدہ اور ہمشیرہ ہندستان سے لوٹیں تو اس اجازت کی مخالفت کی۔ والد نے پروین کی حمایت جاری رکھی۔ یوں اُس نے 1981 میں امتحان میں درجہ اوّل کام یابی حاصل کی۔ 1980 میں اُس کا دوسرا مجموعۂ کلام ''صد برگ'' کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔ اُس کی شہرت قومی سطح سے نکل کر بین الاقوامی سطح تک پہنچ چکی تھی اور اُسے بھارت میں مشاعروں کی دعوتیں وصول ہو رہی تھیں۔

پروین اور نصیر ریل کی دو پٹڑیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے، جو ساتھ ساتھ چلتی تو رہتی ہیں پر ملتی نہیں۔

پروین کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ فزوں تر تھا، نصیر حالات پر شانت اور میسر پر قانع تھا۔ کہتے ہیں، اس میں جستجو کا جذبہ مفقود اور بہتری کی خواہش ندارد تھی۔ اُس نے فوج کی نوکری چھوڑ کر سوشل سیکورٹی کے ادارے میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور اپنا ذاتی کلینک چلاتا تھا۔ اُس کی زیادہ تر توجہ اپنے خاندان کی جانب مرکوز رہتی تھی۔ پروین بیٹے کو بیماری کی صورت میں اکیلی ڈاکٹر کے پاس لے جاتی، گھر کے کام دیکھتی اور بچے کو ننھیال لے جاتی۔ نصیر چھٹی کے دن گھر پر آرام کرتا، کرکٹ دیکھتا، بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ صرف سوشل سیکورٹی اسپتال ہی میں نوکری کرے گا، کرائے کے مکان ہی میں رہے گا اور بیٹے کو سرکاری اسکول میں پڑھائے گا۔ یہ باتیں پروین ایسی ترقی کی خواہاں لڑکی کے لیے روح کا سوہان ثابت ہوتیں۔

ڈاکٹر نصیر بنیادی طور پر ایک اچھا اور بھلا مانس آدمی تھا، جسے پروین کی مشاعروں میں شرکت پر کوئی اعتراض نہ تھا، کئی مرتبہ ادبی مجالس میں ساتھ بھی ہوتا اور اُس کی کام یابی پر خوب خوش ہوتا۔ اس نے پروین کی مزید تعلیم پر بھی اعتراض نہ کیا، اُسے علیحدہ کرائے کا گھر بھی لے کر دیا اور اس کی تخلیقی نمو و پرداخت میں رکاوٹ نہ بنا۔

اختلاف تھا تو سوچ کا، مزاج کا۔

پروین نے مقابلے کے امتحان سی ایس ایس میں بیٹھنے کا ارادہ کیا تو نصیر نے اس سے بھرپور تعاون کیا اور تیاری کے دوران سہارا دیا۔

پروین کی زندگی کے ناول میں ایک رکاوٹ اور ایک ثانوی کردار داخل ہوتے ہیں۔ یہ کردار بریگیڈیر صدیق سالک کا تھا۔ صدیق سالک جنرل ضیاالحق کی جنتا کے نمایاں چہروں میں سے ایک تھے جنھوں نے 1965 اور 1971 کی جنگوں میں حصہ لیا تھا، 1971 کی جنگ کے بعد بھارت کی قید میں رہے اور عمدہ تصنیفات 'ہمہ یارانِ دوزخ'، 'تا دمِ تحریر'، 'ایمرجنسی'، 'پریشر ککر'، 'سلیوٹ' اور 'میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا' کی وجہ سے اہم ادبی مقام حاصل تھا (افسوس اسّی کی دہائی میں سالک کی مقبولیت پانے والی عمدہ کتب کس طرح زمانے کی یادداشت سے مٹتی جاتی ہیں)۔ بعدازاں صدیق سالک، ضیاالحق کے ہم راہ طیارہ حادثے میں راہیٔ اجل ہوتے ہیں۔

بہرحال مقابلے کے امتحان میں ایک بنیادی رکاوٹ پروین شاکر کی عمر تھی۔ وہ حدِ عمر پار کر چکی تھی۔ اُسے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت صرف صدرِ مملکت سے مل سکتی تھی۔ وہ ابھرتی ہوئی، اور مسلسل رُو بہ عروج شاعرہ تھی۔ مشاعروں اور ادبی تقریبات کا نمایاں نام تھی، خوب رو تھی، جلد توجہ حاصل کر لیتی تھی، توانا نسوانی آواز تھی جو عورت کے جذبات کی عکاس تھی اور منفرد تھی سو ادیب و ادب شناس صدیق سالک تک رسائی رکھتی تھی۔

ایک معجزہ ہوا۔ ضیاالحق نے صدیق سالک کی درخواست پر عمر کی حد میں استثنا دیتے ہوئے پروین شاکر کو مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت دے دی۔

پروین نے دن رات امتحان کی خوب تیاری کی اور ملک بھر میں امتیازی کام یابی حاصل کرتے ہوئے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ مقابلے کے امتحانات کے حوالے سے ایک حیران کن امر یہ تھا کہ اُس کے اختیاری مضامین میں اردو کا پرچہ بھی تھا، اس میں جن کتابوں پر تبصرہ کرنے کا کہا گیا اُن میں پروین کی اپنی کتاب ''خوشبو'' شامل تھی۔ بہت بعد میں پروین نے ہنستے ہوئے آصف فرخی کو بتایا ''میں نے اپنی کتاب پر اتنا سخت تبصرہ لکھا جتنا شاید میرے سخت مخالف نے بھی نہ لکھا ہو۔ میں نے اتنی کڑی تنقید اس لیے کی تاکہ میں پہچانی نہ جاؤں کہ میں اپنی ہی کتاب پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ البتہ تب میں نے اندازہ لگایا کہ میں اچھی خاصی نقاد بھی بن سکتی ہوں۔'' جب پروین کو ٹریننگ کے لیے کراچی چھوڑ کر لاہور جانا پڑ رہا تھا تو بیٹے مراد کی تحویل کا مسئلہ درپیش ہوا۔ نصیر کو گوارا نہ تھا کہ وہ شوہر اور بیٹے کو چھوڑ کر دور چلی جائے۔ پروین کے والد نے یہ توجیہ پیش کی کہ ان حالات کا اِدراک نصیر کو پہلے کر لینا چاہیے تھا تو وہ بے بسی سے بولا ''خالو میں نے تو اُسے ویسے ہی اجازت دی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ امتحان میں کام یاب ہو جائے گی۔''

نصیر معاشی آبز مائش کا شکار ہو چکا تھا، اُس کا ذاتی کلینک بک چکا تھا اور فقط سوشل سیکورٹی کی آمدنی بہ قدرِ اشکِ بلبل رہ گئی تھی۔ معاشی بے حالی بھی میاں بیوی کے درمیان تناؤ کی وجہ بنتی چلی آ رہی تھی۔

اوپر سے بیٹے کا معاملہ درپیش تھا۔ پروین کے والدین اُسے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ نصیر کی خواہش تھی کہ مراد یا تو ماں کے پاس رہے یا باپ کے پاس ہو۔ کسی تیسرے شخص کے پاس ہونا مناسب نہ تھا۔ اس سب تکرار در تکرار سے عاجز آ کر پروین بیٹے کو ساتھ لے کر ٹریننگ پر لاہور چلی گئی۔

وہ لاہور تو چلی گئی پر باپ بیٹے کے بغیر اداس ہو گیا اور ہفتے بھر بعد نصیر علی، مراد کو واپس کراچی لے آیا اور اسے پروین کے والدین کے پاس چھوڑ دیا۔

لاہور کا علمی و ادبی ماحول گویا پروین کا منتظر تھا۔ یہاں اُس کے عمو احمد ندیم قاسمی صاحب اور دیگر کئی ادبی دوست تھے۔ اکیڈمی میں اُس کے کمرے کی ہم نشیں طلعت الطاف اُس کی گہری سہیلی بن گئی۔ اکیڈمی میں پروین کے پاس ایک پرانی فوکسی گاڑی تھی جس میں بیٹھ کر پروین اور چند قریبی دوست لاہور کے ادبی ٹھکانوں پر جاتے، مباحثوں میں شریک ہوتے، چائے پان سے لطف اندوز ہوتے اور لوٹ آتے۔

پروین کو نئے سرے سے اسٹوڈنٹ لائف کا لطف آ رہا تھا۔ البتہ شادی کی کدورت پلاؤ کے چاولوں میں آئے کنکر کی طرح تنگ کر رہی تھی۔

نصیر نے نئے سرے سے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ پروین، مراد کو کراچی آ کر لاہور لے جائے۔ اُسے پسند نہ تھا کہ بچہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے دوسرے گھروں میں پرورش پائے۔ اس کی ضد کے آگے مجبور ہو کر پروین مراد کو لے کر اکیڈمی آ گئی۔

ایک مرتبہ لازمی ملکی دورے پر پروین، مراد کو لے کر اسلام آباد میں زیرِ تربیت افسران کے ہم راہ ایم این اے ہاسٹل میں ٹھہری تو وہاں مراد کی طبیعت بگڑ گئی۔ ایسے میں محکمہ کسٹم کے شاہد رحیم شیخ اور سہیلی طلعت الطاف، پروین کی مدد کو بڑھے اور بچے کو فوری طور پر اسپتال کے ہنگامی شعبے میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں کی توجہ سے بچے کی حالت سنبھل گئی۔ اس دوران طلعت، پروین کے والدین کو مراد کی صحت کی خرابی کی اطلاع دے چکی تھی۔ وہ لوگ ہنگامی طور پر اسلام آباد پہنچے۔ بچے کی سنبھلی حالت دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی اور یوں ایک آزمائش ٹلی۔

پروین نے یک سوئی سے ٹریننگ جاری رکھی اور 154 طلبہ میں سے امتیازی کارکردگی سے اکیڈمی کا امتحان پاس کیا، ''بہترین زیرِ تربیت افسر'' کا اعزاز پایا، سونے کا تمغہ حاصل کیا اور محکمہ کسٹمز میں بہ طور افسر اس کی تعیناتی ہوئی۔ پروین کے کیریر کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا جب کہ عائلی زندگی شکست و ریخت کا شکار تھی۔

ایک جوان خود مختار لڑکی تنگ ذہن، سازشی عناصر کا آسان شکار ہوتی ہے۔ کسی بھی لڑکی پر الزام لگا دیا جائے تو بہ قول علی شریعتی وہ داڑھی رکھ کر اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔ پروین سے بھی جھوٹے سچے قصے منسوب کیے گئے۔ وہ کومل نازک جذبوں والی چینی گڑیا سی لڑکی کمھلا کر رہ گئی۔

اسلام آباد کا واقعہ ہے۔ بہار کا خوش گوار دن تھا۔ آسمان روشن تھا اور تازگی بھری ہوا مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹکراتی، لوٹتی، بیچ سے گزرتی ماحول میں مسرت بکھیر رہی تھی۔ ایک سرسبز گرین بیلٹ کے سامنے بڑی سی کوٹھی کے نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں فیض احمد فیض چند دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ وہاں پروین شاکر بھی موجود تھی۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ فیض صاحب سے مل چکی تھی۔ وہ اُن کی متانت، مزاج کی نرمی اور ذات کی شگفتگی کے باعث اُن سے حالِ دل بیان کرنے میں آسانی محسوس کرتی تھی۔ اُس روز اِردگرد لوگ خوب مسکرا رہے تھے اور قہقہے اُبل رہے تھے۔ فیض صاحب شروع سے کم گو تھے، بڑھاپے میں آ کر چپ شاہ ہو چکے تھے۔ پروین گم سم، اُداس بیٹھی تھی۔ لوگوں کے بکھر جانے کے بعد جب فیض صاحب کو اس سے بات کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے اُس کی اداسی کی وجہ دریافت کی۔ اُس نے بتایا کہ وہ نہ صرف لوگوں کی تہمتوں کی وجہ سے خائف ہے بلکہ اپنی معاصر شاعرات کے حسد کے باعث بھی دکھی ہے۔ اُس نے تو کبھی دانستہ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی کسی کا برا سوچا ہے۔ اس کی ہم قبیل عورتیں زیادہ جلاپے میں اُس کی بدخوئی کرتی ہیں۔ اس پر فیض صاحب نے بہت شفقت سے اُسے سمجھایا "تم بہت بے وقوف لڑکی ہو، نظر انداز کرو۔ تم نے کبھی ہمیں پلٹ کر جواب دیتے دیکھا ہے۔ جس کا جو جی چاہے، اُسے کہنے دو۔ وہ اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ تم ان چیزوں میں پڑ کر اپنی صلاحیتیں مت گنواؤ۔ اب مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ شروع میں میں بہت دکھی ہوتا تھا، اب نہیں ہوتا۔"

اپنی معاصر شاعرات کے حوالے سے فہمیدہ ریاض کو وہ اس کی جرأت پر سراہتی تھی۔ فہمیدہ ریاض کے ہاں موضوعاتی اور لسانی بے باکی دیکھ کر پروین کی ہمت بندھی کہ عورت ایسا بھی لکھ سکتی ہے۔ البتہ اُس کا خیال تھا کہ فہمیدہ نے سیاست کو اپنی شاعری میں غیر ضروری طور پر جگہ دے کر اس کے معیار سے سمجھوتا کیا۔ کشور ناہید سیدھے سبھاؤ والی براہِ راست شاعری سے رمزیہ شاعری کی جانب آ گئی۔ اس وجہ سے عام قاری شعوری سطح نہ رکھنے کے باعث اس شاعری کو سمجھنے سے محروم رہ گیا۔ وہ کشور ناہید کو "شاعرات کی شاعرہ" قرار دیتی تھی۔ وہ شاہدہ حسن کی صلاحیت، عشرت آفرین (اگر وہ فقط ایک خاص نظریے کی ترجمانی نہ کرے)، سارا شگفتہ کے ہاں دلیرانہ انداز تکلم اور نسرین انجم بھٹی کے اندرونی آہنگ کے باعث انھیں مستقبل کی نمایاں شاعرات کے طور پر دیکھتی تھی۔

وہ روایتی اساتذہ کی پیروی میں شاعری کی اصل کسوٹی پابند شاعری کو تسلیم کرتی تھی۔ جو اس

معیار پر پورا اُترے، بھلے بعد میں دیگر تجربات کرتا رہے، صحیح معنوں میں قابلِ قدر شاعر ہے۔

ایک شام کراچی کے متوسط خوش حال، پڑھے لکھے طبقے کے اقامتی علاقے گلشنِ اقبال کے ایک سادہ سے مکان میں منعقد ہونے والی ایک ادبی نشست میں پروین نے ادب کے حوالے سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ کسی نے اُس سے پوچھا کہ وہ شاعری کیوں کرتی ہے تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں پیشانی پر آتی بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے چہرے کو ایک طرف جھکاتے ہوئے جواب دیا ''کوئی چیز بھی مجھے شاعری کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے، میرے دل اور جذبات کو متاثر کر سکتی ہے، کوئی دُکھ، بے پناہ خوشی، دریافت کا لمحہ، حیرت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ الفاظ سے مجھے عشق ہے، یہ مسحور کرتے ہیں، میری اتنی زندگی کتابوں میں گزری ہے کہ اب میں ہر جذبے کو الفاظ میں ڈھالنے میں آسانی محسوس کرتی ہوں۔''

جب اُس سے پوچھا گیا کہ اُس کی ابتدائی شاعری میں رومان کی واضح چھاپ ہے، کیا بعد کی شاعری میں مزید پختگی اور تنوع آئے گا، تو اُس نے سوچتے ہوئے اپنے پیر صوفے پر اپنے نیچے سمیٹ لیے (جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتی تھی، چپل اُتار کر، پیروں کو سمیٹ لیا کرتی تھی، پرندے کی طرح سمٹ جاتی تھی) اور بامعانی اور پختہ انداز میں کہنے لگی ''جب میری پہلی کتاب 'خوشبو' سامنے آئی تو تب تک میں اپنے اندر دیکھ رہی تھی، بعد میں مجھ پر منکشف ہوا کہ میرے اِردگرد بہت سے لوگوں کے ایسے ہی مصائب ہیں، وہ خواب دیکھتے ہیں جو ٹوٹ جاتے ہیں، سو بعد کی شاعری میں، بالخصوص 'صد برگ' میں خارج کا، آس پاس کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔''

پروین کی شاعری مختلف مدارج اور ارتقائی منازل طے کرتی رہی البتہ گلاب، خوشبو، ہوا، پانی، پرندے اور مخصوص علامات مستقل موجود ہیں۔

پروین شاکر پر کام کرتے ہوئے ایک دل چسپ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو نثر میں نمایاں کام اردو بولنے والوں کے علاوہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ادبا نے کیا، البتہ خواتین کی شاعری میں نمایاں نام پروین شاکر، کشور ناہید، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، زہرا نگاہ، ادا جعفری اور بیش تر شاعرات کا تعلق خالصتاً اردو بولنے والے (مہاجر) طبقے سے ہے (اس میں استثنا سارا شگفتہ، نسرین انجم بھٹی اور گنتی کی چند شاعرات کو ہے)۔ ایسی کیا لسانی، ثقافتی، سماجی وجوہ ہیں جنھوں نے اردو بولنے والی خواتین کو شاعری کی جانب رجوع کرنے اور اعلیٰ پائے کی شعری تخلیقات سامنے لانے پر آمادہ کیا۔ کیا اردو بولنے والی خواتین میں شعور زیادہ تھا، معاشرتی آزادی بڑھ کر تھی یا تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان میں روشن خیالی زیادہ تھی، غور طلب معاملات ہیں۔

پروین میں ایک ادا ضرور تھی، وہ اپنی شاعری پر نازاں تھی، اس لیے اپنی شاعری کی اشاعت سے پہلے،

ابتدائی دنوں میں عرفانہ عزیز سے اصلاح لیتی تھی اور بعدازاں یہ سلسلہ احمد ندیم قاسمی پر ختم ہوگیا۔ وہ کہتی تھی ''اس کے علاوہ میں نے اپنی شاعری کسی کو نہیں دکھائی اور نہ کبھی کسی کو یہ حق دیا کہ کوئی لفظ کاٹے یا تبدیل کرے۔''

پروین سمجھتی تھی کہ قومی سطح پر اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر معروف ہونے والی خواتین کم ہیں، ایسی خواتین جو کسی مرد کی بیوی، بیٹی، بہن یا عزیزہ ہونے کے باعث معروف و محترم نہ ہوں بلکہ اپنی انفرادی خوبی کی وجہ سے جانی جائیں، کم یاب ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایسی کم عمر لڑکیاں جو تخلیقی کام میں مصروف ہوں اور اپنی ذات و تخلیق کی وجہ سے دل کشی کی حامل ہوں، جلد ہی لوگوں کی دل چسپی کا مرکز بن جاتی ہیں اور ایک پدرسری معاشرے میں بدقسمتی سے منفی رائے کو اپنی جانب یوں کھینچتی ہیں جیسے مقناطیس لوہے کی کیلوں کو۔

پاک و ہند کی روایت میں، ماضی میں شاعری بیگمات، شہزادیاں یا کوٹھے کی طوائفیں کرتی تھیں۔ جیتی جاگتی عام عورت تاریخ میں شاعری (میرا بائی وغیرہ ایسی کرشنا کی معتقد، درویش شاعرہ اور چنیدہ استثنات سے ہٹ کر) کرتی نظر نہیں آتی۔ یہ بیسویں صدی کی ہندوستانی روایت ہے۔

پروین کی زندگی کے حوالے سے چند دل چسپ واقعات اور باتیں ہیں۔ وہ کہتی تھی تقریر انسان کو ہجوم کی طرف لے جاتی ہے، شاعری تنہائی کی جانب۔

پروین کسٹم ہاؤس کراچی میں تعینات تھی کہ اسے فیصل آباد ڈسٹرکٹ جیل سے ایک قیدی کا خط آیا۔ اس قیدی کو سزائے موت ہو چکی تھی۔ اس نے صدرِ مملکت سے رحم کی اپیل کر رکھی تھی۔ اُسے اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں تھی۔ اپنی زندگی اور حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے قیدی نے پروین سے درخواست کی کہ وہ مرنے سے پہلے پروین کے دست خطوں والی اس کی شاعری کی کتاب پڑھنا چاہتا ہے۔ پروین اپنے نام آنے والے خطوط کے جواب نہیں دیا کرتی تھی، اس مرتبہ اُس نے نہ صرف قیدی کے خط کا جواب دیا بلکہ پولیس کے ایک اے ایس پی کی مدد سے اپنی کتاب بھی پہنچوادی۔

ایک مرتبہ پروین نے دیگر ادیبوں کے ہم راہ چین میں پندرہ روز گزارے۔ دیگر ادیبوں میں ایک تاثر پایا جاتا تھا کہ پروین مقبول شاعرہ، سرکاری عہدے دار اور اپنی افتادِ طبع کے باعث لیے دیے رہتی ہے اور لوگوں سے تکلف برتتی ہے۔ ایک روز بیجنگ کے ہوٹل میں قیام کے دوران اُس نے عطاالحق قاسمی صاحب کو قمیص استری کرتے دیکھا تو باقاعدہ ناراض ہوکر اُن سے قمیص چھین لی اور بولی ''بہن کی موجودگی میں بھائی یہ کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔'' بعدازاں اُس نے عطا صاحب کو ان کی قمیص استری کر کے دی۔ عطا صاحب پروین کی پرخلوص، پاکیزہ محبت سے اتنے متاثر ہوئے کہ بعد میں ایک جگہ پروین کو یاد کرتے ہوئے کہا ''پروین شاکر ایک لبرل ترقی پسند خاتون ہونے کے باوجود مشرقی تہذیب اور روایات کی پاس داری کرتی تھی۔''

شکیل عادل زادہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کسٹم افسر حسن امام مرحوم کے گھر ایک مشاعرے میں مدعو تھے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا اور پروین شاکر کو بھی آ کر اپنا کلام سنانا تھا۔ سامعین بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں پروین اپنے شوہر ڈاکٹر نصیر علی کے ہم راہ تقریب گاہ میں داخل ہوئی تو ہر سُو بھن بھناہٹ ہونے لگی اور بلند ہوتی گئی۔ پروین راستے میں کھڑے لوگوں کے بیچ سے گزری تو لوگوں نے نازیبا، ناپسندیدہ آوازے کسے۔ اِن میں واضح طور پر پروین اور اُس کے شوہر کے بارے میں طنزیہ جملے شامل تھے۔ پروین اور نصیر خاموشی اور بردباری سے وہاں سے گزر گئے۔ البتہ شکیل صاحب اور دیگر سنجیدہ، بامروّت ادیبوں کو یہ سب کچھ بہت ناگوار محسوس ہوا۔ ایسے میں پروین اور نصیر کے دل پر جانے کیا گزرتی ہوگی۔ وہ بہت پیاری اور حساس لڑکی تھی، ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہوگی۔ شکیل عادل زادہ کہتے ہیں ''اُس کا ہمارے گھر آنا جانا خوب تھا۔ ہمارے گھر بھی زیادہ دور نہیں تھے۔ عرصے بعد اسلام آباد میں اہلِ قلم کانفرنس کے ٹھہرانے پر میریٹ ہوٹل میں آمنا سامنا ہوا۔ اس نے مجھے اور میں نے اُسے دیکھا تو والہانہ ایک دوسرے کی جانب بڑھے۔ میرے بازو بے اختیار پھیل گئے۔ پروین بھی بے اختیار میرے گلے سے آ لگی اور تجسّس وتردّد سے بیٹی کو پوچھنے لگی۔ 'دل کش کیسی ہے؟' اور سب گھر والوں کا بھی فرداً فرداً احوال دریافت کیا۔ پروین کے اس بے ساختہ، بے محابا اظہار پر اردگرد موجود، ادیبوں شاعروں کو حیرت ہوئی اور مرحوم جمال احسانی نے پروین کے کچھ آگے چلے جانے کے بعد کہنی مارتے ہوئے شوخی سے پوچھا کہ یہ کون سا ہنر ہے، کچھ ہمیں بھی تعلیم دیجیے۔ شکیل صاحب نے مسکرا کے کہا ''تم نہیں سمجھوگے۔ یہ آنکھ اور نیت کی بات ہے۔''

شکیل صاحب پروین کے ذکر پہ خوش گوار یادوں میں کھو جاتے ہیں۔

اُس کی بڑی بہن نسرین، پروین کو حسرت آمیز لہجے میں یاد کرتے ہوئے ایک جگہ بتاتی ہے۔

''پروین ابا ہی کی طرح معصوم تھی۔ بہت جلد دوسروں پر بھروسا کر لیتی تھی۔ اس نے دھوکے بھی کھائے۔ ابا اور اماں دونوں کی عادتیں اس نے لے لی تھیں۔ ابا کی طرح بے نیازی اور کاہلی، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے کا انداز بالکل ابا کی طرح تھا۔''

ممتاز مفتی انوکھے آدمی تھے اور منفرد سوچ کے مالک، سو وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک مرتبہ پروین شاکر کے بارے میں کہنے لگے ''پروین شاکر کی بدقسمتی ہے کہ وہ نوازدی گئی ہے۔ جو نوازے جاتے ہیں ان پر اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے، ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔''

اُس کی قریبی، بہن جیسی سہیلی اور پُرشفقت شخصیت پروین قادر آغا نے بیان کیا تھا ''پروین شاکر دوسروں سے منفرد اور بلند تھی۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ اتنی کم عمری میں اپنی شاعری کی بہ دولت اُس نے جو شہرت حاصل کی، اسے کتنی بردباری سے اپنے اندر جذب کر لیا۔''

بعض لوگ پروین کی بردباری کو اس کے غرور سے تعبیر کرتے ۔البتہ ایک جگہ وہ خود لکھتی ہے
''میری خامیوں میں سے ایک خامی یہ ہے کہ میں کم گو اور کم آمیز ہوں۔''

بمبئی میں ایک لڑکی کینسر کے مرض میں مبتلا تھی۔ وہ پندرہ سال کی تھی۔ اُس کی انگریزی نظموں اور ڈائری پر مشتمل مجموعہ ''گیتانجلی البم'' کے نام سے پہلے لندن اور بعد ازاں ہندوستان سے شائع ہوا۔اس کتاب میں ''پندرہ سال کی اس معصوم بچی کی نظموں کا نیا پیغام تھا اور موت کا ایک ہی جواب ہوسکتا تھا۔کوئی اور نہ مرے،اس عمر میں نہ مرے،اس طرح نہ مرے۔'' گیتانجلی کے دل کی آواز پروین کی روح کو چھوگئی۔وہ ان نظموں کا ترجمہ کرنا چاہتی تھی،دوسرے دیس کی ایک معصوم بچی کی ابتلا میں وہ اس کے ساتھ تھی۔جلد ہی اُس نے لڑکی کی منتخب نمایندہ نظموں کا ترجمہ مکمل کرلیا تھا۔گیتانجلی کی نظموں اور ڈائری کے اقتباسات (مترجم احمد سلیم) کو پڑھیں تو انسان پر عجیب اثر ہوتا ہے، جس عمر میں لڑکیاں محبت کرنے کا سوچتی ہیں، گیتانجلی مرنے کا اہتمام کررہی تھی۔ان نظموں میں گیتانجلی موت کو دیکھ رہی تھی، پروین موت کے مقابل زندگی کو دیکھ رہی تھی۔ایک حقیقت کو دو مختلف پہلوؤں سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

پروین کی زندگی میں شگفتہ لمحات کی بھی کمی نہ تھی۔

کراچی میں حالات کی خرابی کے باعث کرفیو نافذ کردیا گیا تھا۔پروین نے ایک واقعہ اپنے کالم ''گوشۂ چشم'' میں لکھا۔

''ابھی پچھلے دنوں ایسے ہی ایک مشاعرے سے واپسی پر افتخار عارف اور اظہر عباس ہاشمی دھر لیے گئے۔''اتنے رات گئے آپ دونوں کہاں جارہے ہیں؟''،''گھر جارہے ہیں''،''یہ گھر جانے کا کون سا وقت ہے؟''افتخار عارف نے اپنے شعر کی مار دینا چاہی 'شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے'۔''اس ظالم نے نہ ٹی وی پروگرام ''کسوٹی'' دیکھا تھا، نہ ''ماہ دو نیم'' پڑھی تھی اور نہ ہی ''حرفِ باریاب'' پر ایک سو ساٹھ تبصرے پڑھے تھے۔سو اُس نے دونوں کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھا۔جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ دونوں ''دہشت گرد'' نہیں بلکہ ''دہشت زدہ'' ہیں تو جان بخشی کی۔''

ایک روز کا دلچسپ ماجرا ہے۔پروین اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھی، پچھلے دنوں بیماری کی وجہ سے چھٹی کی تھی، اس کا تمام کام بھی اکٹھا ہو چکا تھا۔کاغذات کے پلندے اور فائلوں کے انبار میز پر دھرے تھے۔اتنے میں اُسے اطلاع ملی کہ اپنے وقت کی ایک حسین اور مقبول فن کارہ اس سے ملنے آئی ہے۔پہلے تو پروین نے سوچا کہ کام کی زیادتی کے باعث اُسے ٹال دے پر ایسا کرنا اچھا نہ لگا۔اُسے اندر بلالیا۔اُس فن کارہ کو شادی کے اٹھارہ برس بعد گھر سے نکال دیا گیا تھا اور بچوں کو چھین لیا گیا تھا۔وہ یہ سب سناتے ہوئے رو رہی تھی۔ جب اُس نے کہا 'پروین! اتنے ظلم وستم کے باوجود جب میرا شوہر مرگیا تو میں

مگر مچھ کے آنسو روئی تھی'' (اُس کا مطلب تھا کہ وہ بہت روئی تھی مگر پروین کے سامنے محاورے کا غلط استعمال کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ دکھاوے کے آنسو روئی تھی)۔اس سے پہلے کہ پروین اپنے قہقہے پر قابو نہ رکھ پاتی، وہ معذرت کر کے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ وہ باہر تب آئی جب خود پر قابو پالیا۔ یوں اُس کی رگِ شرارت جاگ اُٹھتی تھی۔

وہ ہندوستان کے دورے پر گئی تو ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں اُس کی ملاقات اپنی سہیلی رفاقت سے طے تھی۔اس سے پہلے شاعرہ شبنم شکیل، رفاقت کو اس کی دو پریشانیوں سے آگاہ کر چکی تھی۔ پہلی پریشانی یہ تھی کہ پروین اپنے بیٹے مراد کو اپنے ہم راہ لائی تھی اور وہ بیٹے کو ہوٹل کے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اُس نے علی گڑھ یونی ورسٹی میں مشاعرے کی دعوت قبول کر لی تھی مگر اس کے پاس وہاں کا ویزا نہ تھا۔

پس رفاقت نے اُسے اپنے گھر منتقل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ یوں اُس کا مراد والا معاملہ حل ہو گیا اور ایک ماں کا بیٹے کے حوالے سے تفکر ختم ہوا۔

علی گڑھ کے مشاعرے میں شرکت کا مسئلہ بھی حل ہو ہی گیا۔ علی گڑھ میں پروین کو یونی ورسٹی دیکھنے کا زیادہ اشتیاق تھا۔ یونی ورسٹی دیکھنے کے دوران اپنی شستہ اور شگفتہ تحریر کی وجہ سے پہچانے جانے والے، علی گڑھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق سربراہ تاریخ ساز ادیب رشید احمد صدیقی کا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُن کا گھر محفوظ کر لیا گیا تھا۔ وہ پانچ مرلے کا' صاف ستھری زندگی کا آئینہ دار' سادہ سا گھر تھا۔ اُس شام مشاعرے میں شریک شرکا و سامعین کو دیکھ کر پروین کو اُن میں اپنا پن محسوس ہوا۔ وہ دھیمے مزاج کے متین لوگ تھے۔ پروین نے مشاعرے کے بعد رفاقت سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا'' ہمارے لیے لمحۂ فکر یہ ہے کہ دھیما پن اور نرمی و لحاظ جیسی خوبیاں ہم سے روٹھ گئی ہیں۔''

پروین کو معروف مصور ایم ایف حسین سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ وہ خداداد صلاحیت کے مالک جدید دور کے بڑے مصور تھے۔ وہ ہر محفل میں ننگے پیر شریک ہوتے تھے اور ایک جواں سال حسینہ اُن کی بغل میں ہوتی تھی۔ وہ معروف بھارتی اداکارہ مادھوری ڈکشٹ کے بھی عاشق صادق تھے اور اس کی مختلف انداز میں درجنوں تصاویر بنا چکے تھے۔

دراز قامت، چوڑے، لمبے ہاتھ پیر والے، سفید دھوتی کُرتے میں ملبوس ایم ایف حسین ننگے پیر گھر کے صدر دروازے پر پروین کے منتظر تھے۔ وہ پروین اور اس کی سہیلی کو اندر لے گئے جہاں ایک حسین خاتون نے ان کا والہانہ استقبال کیا، سادہ پانی پیش کیا، چائے کے ساتھ اچار اور مٹھیاں لے آئی۔ پروین خاصی دیر تک اُن کے پیر دیکھتی رہی جو بغیر جوتوں کے چلنے کے عادی ہونے کی وجہ سے خاصی بری حالت

میں تھے۔ حسین صاحب محافل، تقریبات، بازاروں، محلوں اور سفر میں ننگے پیر ہی جاتے تھے۔ وہ اور پروین خاصی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر طویل خاموشی کے بعد پروین نے اُن کے فن کی تعریف کرنا شروع کی، وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ چائے کے بعد وہ انھیں چھوڑنے باہر تک خاموشی سے چلے آئے، الوداعی سلام کیا اور لوٹ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر پروین نے چہکتے ہوئے کہا کہ اُس میں اور ایم ایف حسین صاحب میں ایک شے مشترک ہے۔ اُس کا اشارہ ننگے پیروں کی جانب تھا۔ پروین بھی اپنے جوتوں کے بارے میں خاصی بے پروا تھی اور انھیں کہیں اُتار کر اکثر بھول جاتی تھی اور اسے واپس ننگے پیر آنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ تو وہ اسلام آباد کی جناح سپر مارکیٹ میں ننگے پیر گاڑی چلاتی ہوئی آئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے جوتوں کی دکان سے چپل خرید کر پہنی۔

پروین دِلّی کی معروف ادب شناس کامنا پرشاد، جو خوش ونت سنگھ کی بھی دوست تھی، سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اردو شاعری کی شائق اور پروین کی شاعری کی مداح تھی۔ اُس نے پروین کی کئی نظموں اور غزلوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا تھا۔ کامنا کا چھوٹا سا گھر ہندوستانی ثقافت کا مرقع تھا۔ وہ راجستھانی پہناوے میں تھی، عنابی اور سیاہ رنگ کا کڑھائی کیا ہوا گھاگھرا، چھوٹی سی بے پردہ چولی، لمبے کھلے بال اور ناک میں راجستھانی کیل پہنے وہ پروین سے بہت گرم جوشی سے ملی۔ گھر میں چاندی کے گلاسوں میں پانی پیش کیا جاتا اور فرشی نشست کا اہتمام ہوتا تھا۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے دھرے تھے۔ اُس نے سہگل نام پکارا تو ایک بیس سالہ لڑکا، منہ میں پان کی گلوری دبائے بے تکلفانہ اندر چلا آیا۔ وہ کامنا کا منگیتر تھا اور عمر میں اُس سے بہت چھوٹا تھا۔ کامنا نے بتایا کہ وہ اور سہگل بہت جلد، سہگل کے والدین کی مرضی کے برخلاف، بیاہ رچانے والے ہیں۔ کامنا نے پروین کو یہ بھی بتایا کہ وہ پروین کی طرح نسوانی آزادی کی حامی ہے۔ پروین نے اُس کی تصحیح کرتے ہوئے وضاحت کی کہ کامنا اُس کی شاعری کو غلط سمجھی ہے۔ پروین نسوانیت کا تذکرہ مخصوص حدود میں کرتی ہے۔ (غالباً پروین مادر پدر آزادی سے اپنی شاعری کے سمبندھ کو غیر متعلقہ اور گم راہ کن سمجھ رہی تھی)۔ کامنا کی بقیہ گفت گو کے دوران پروین خاموش رہی۔ تکرار و کج بحثی اس کے مزاج کے خلاف تھی۔ پروین جس راہ سے اخلاقیات کا جنازہ گزرتا دیکھتی، اُس رستے سے ہٹ جاتی۔ سو اس کا کامنا سے رابطہ رسمی سا ہوتا ہوا معدوم ہو گیا۔ اُس کی نسوانیت تو رنگوں کی بھیگی پھوار تھی، مقامی ذائقے میں رچی اور روایات کی خوشبو سے مہکتی ہوئی۔ اُس کی کئی نظموں پر رقاصہ پشپا ڈوگرا نے کتھک رقص بھی ترتیب دیا تھا جس میں ایک نرالی نظم یوں ہے: بسنت بہار کی نرم ہنسی، آنگن میں چھلکی، بھیگ گئی مری ساری، پھر۔ پروا کی شوخی! کیسے اپنا آپ سنبھالوں، آنچل سے تن ڈھانپوں — تو، زلفیں کھل جائیں، زلف سمیٹوں، تن چھلکے گا۔

عشق پیشہ، خوش فکر، خوش کلام، ماہ جبیں پر ایسا گرہن آیا کہ اُس کی تابانی چرا لے گیا۔
وہ اور اس کا شوہر، دونوں عمدہ انسان تھے، پس ایک دوسرے سے مختلف تھے، اک دوجے کے لیے نہ تھے۔ مزاج و فکر کا تفاوت زندگی پر حاوی ہو گیا۔ باہر شہرت کے ڈنکے تھے اور گھر میں اداسی اور حزن آلود خاموشی تھی۔

پروین سے جا و بے جا باتیں وابستہ ہوتیں تو نصیر کا دل دکھتا۔ پروین کے والد شاکر حسین نے تو واضح طور پر اُس سے کہہ دیا تھا کہ وہ شاعری سے دور رہے وگرنہ اُس کی خانگی زندگی کو بربادی اور بیٹے کی پرورش کو حسرت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

پاکستانی معاشرے میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کے علاوہ معاشی مسائل بھی بہت سی شادیوں میں دیمک لگا دیتے ہیں۔ پروین کو نصیر کی جامد طبیعت بھی کھلتی تھی۔

اِدھر اُدھر نصیر کو ایسی صورت میں کہ پروین اسلام آباد میں ہو اور وہ کراچی میں، شادی کی بنیاد صائب طور پر متزلزل نظر آتی تھی۔ ایسے کھنچاؤ کے حالات میں پروین نے کراچی سے دور اسلام آباد جانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا تبادلہ دارالحکومت میں کروا لیا۔ اُس نے زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اُس نے ہیئت بدلی، ساڑھی پہننا چھوڑ دی، بال کندھوں تک ترشوا لیے اور لباس کا انداز بدل دیا۔

نصیر علی نے پروین سے شادی کا بندھن برقرار رکھنے کے لیے ایک ملاقات اکتوبر 1986 میں کی مگر دونوں باہمی رضامندی اور مصالحت کی شرائط پر آمادہ نہ ہو سکے۔ نصیر کی شرائط میں سے ایک یہ تھی کہ پروین شاعری چھوڑ دے۔ شاعری پروین کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتی تھی اور اُس کے لیے لازم و ملزوم تھی۔ اس کی پہچان شاعری تھی۔ نصیر کی دوسری شرط یہ تھی کہ پروین ملازمت چھوڑ کر گھریلو زندگی بسر کرے۔ پروین زندگی کے سفر میں بہت آگے آ چکی تھی، معاشی طور پر خود مختار ہو چکی تھی اور ایک باعزت ملازمت سے منسلک تھی۔ اُس کے لیے اُلٹے قدموں واپسی کا سفر محال تھا۔

اُس نے پروین سے آخری ملاقات فروری 1987 میں کی جس کے بعد دونوں میں باہمی رضامندی سے گیارہ برس کی شادی کے بعد طلاق ہو گئی۔ طلاق کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ پروین دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی، بہ صورتِ دیگر اُسے اپنے بیٹے مراد (گیتو) کی تحویل سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔

اس کے برعکس نصیر دوسری شادی کے لیے آزاد تھا۔ (آیندہ دنوں میں اُس نے دوسرا بیاہ کیا جو کام یاب رہا اور وہ صاحبِ اولاد بھی ہوا)۔

پروین نے اپنے آپ کو تعلیم میں مگن کر کے توجہ بٹانے کی کوشش کی۔ اُسے عمدہ تعلیمی ادارے سے

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جنون بھی تھا۔ اُس نے فل برائٹ اسکالرشپ حاصل کی اور امریکا کی ہارٹ فور ڈیونی ورسٹی، کنیکٹکٹ روانہ ہوگئی۔ اُس کا داخلہ معروف درس گاہ ہارورڈ یونی ورسٹی میں بھی ہوگیا تھا لیکن اُس نے اسے عارضی طور پر موخر کر دیا۔

ایک موقع پر کورس کے حصے کے طور پر پاکستانی فلم کا انگریزی ترجمے کے ساتھ دکھایا جانا شامل تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ اس کا انتظام نہ کرسکا۔ وہاں کے ہندوستانی طلبہ نے تجویز پیش کی کہ ہندوستانی فلم دکھا دی جائے۔ پروین نے تجویز کی بھرپور مخالفت کی۔ اس کی خواہش تھی کہ امریکی پاکستانی اور بھارتی ثقافت کو علیحدہ طور پر پہچانیں۔ یہ اصرار اُس کے جذبۂ قومیت کا عکاس تھا۔

1990 میں اسے صدارتی تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا گیا جس کے لیے وہ اپنے کورس کے بیچ میں بیٹے کے ہم راہ پاکستان واپس آئی۔ وہ اس روز حقیقی طور پر خوش نظر آرہی تھی۔

1992 میں اسے امریکا میں اپنے والد کی علالت اور پھر وفات کی اطلاع ملی۔ صدمے کی وجہ سے اس کے حواس پر شدید منفی اثر ہوا۔ ان دنوں وہ خود علالت کی وجہ سے بوسٹن کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج تھی لہٰذا والد کے جنازے میں شریک نہ ہوسکی۔

امریکا سے واپسی پر اسے اسلام آباد میں ایک ایسا گھر الاٹ ہوا جس کے ساتھ سبزے کا قطعہ تھا۔ اسے وہاں اِردگرد سبزے، بوٹوں اور پھولوں کی مہک بہت بھلی لگتی تھی۔

پروین شاکر جوتشی چوہان کی وہ پیش گوئی غلط ثابت کرنا چاہتی تھی جس میں اُس نے اِس کی چار کتابوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اس نے ''ماہِ تمام'' کے نام سے کلیات چھپوانے کا اہتمام کیا۔ گویہ پانچویں کتاب نہ تھی مگر پروین کے ذہن کے مطابق کلیات کی شکل میں ایک کتاب ضرور تھی۔

''ماہِ تمام'' کے معنی 'اختتام' کے لیے گئے تو اس نے وضاحت کی کہ اس کا مطلب چاند کا عروج ہے۔ جب اس کے استاد اسلم فرخی کے صاحب زادے آصف فرخی نے اِس نام پر اعتراض کیا تو وہ باقاعدہ ناراض ہوگئی۔ رفاقت جاوید نے ایک دسویں محرم کا احوال لکھا ہے جب پروین شاکر نے ان کے ہاں قیام کیا تھا۔

''رات خاموش تھی، سب سو چکے تھے کہ مجھے ایک دم سے ایک پرسوز نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ یہ خوب صورت آواز پروین کی تھی وہ دکھ میں سو نہ سکی تھی اور اپنے جذبات کا اِظہار تڑپا دینے والے نوحے ''گھبرائے گی زینب'' سے کر رہی تھی۔ دکھ و دَرد میں ڈوبی ہوئی آواز کا اُتار چڑھاؤ کسی صورت ناصر جہاں کی آواز سے کم نہ تھا۔ اس کی شخصیت کا یہ روپ مجھ پر آج عیاں ہوا تھا۔ میں دیر تک اس کی آواز میں کھوئی رہی۔ کافی دیر بعد اس کی آواز قدرے مدھم پڑ گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ کچن کی طرف چلی گئی غالباً

اس نے اپنے لیے چائے بنائی تھی۔ رات بھر وہ سو نہیں پائی تھی، صبح دیر تک سوتی رہی۔ جب وہ سو کر اٹھی، تو اس کی آنکھوں میں لال ڈورے اس کی رات بھر بیداری اور اشک باری کی غمازی کر رہے تھے۔''

25 دسمبر 1994 کو سرکاری دفاتر میں چھٹی تھی۔ پروین اپنے بالوں میں منہدی لگایا کرتی تھی۔ اُس روز بھی اُس نے منہدی لگائی اور گھر کے کام نمٹائے۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔

اگلی صبح اُس نے سبز رنگ کا لینن کا سوٹ زیب تن کیا، کالے رنگ کی جوتی پہنی اور کالے رنگ کا پرس تھاما اور صبح نو بجے دفتر جانے کے لیے گاڑی میں آ بیٹھی۔

پروین کی عادت تھی کہ وہ پہاڑ کے ساتھ چلنے والی مارگلہ روڈ پر سفر کرتی ہوئی دفتر جایا کرتی تھی۔ یوں یہ خوب صورت سفر خوش گوار دن کا پیغام ثابت ہوتا تھا۔

اُس روز لوڈشیڈنگ کی وجہ سے رستے کے اشارے بند تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ جب وہ فیصل مسجد کو جانے والی سڑک اور مارگلہ روڈ کے سنگم پر پہنچی تو فیصل مسجد کی جانب سے ایک بس تیز رفتاری سے آئی جسے اُس کا کلینر چلا رہا تھا۔ وہ بس پروین کی چھوٹی نیلے رنگ کی کار سے زوردار دھمک سے ٹکرائی اور کار کو دھکیلتی ہوئی سڑک کے پار لے گئی۔ بس، ڈرائیور کی جانب سے کار کو ٹکرائی تھی سو کار ڈرائیور موقع پر دم توڑ گیا۔ پچھلی سیٹ پر بے ہوش اور زخمی پروین نیم دراز تھی۔ اُس کے پیروں میں اُس کی بیاض کھلی پڑی تھی اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ وہ پروین کو پہچان نہ سکے تھے۔ انھوں نے ایک راہ گزرتی وین کو رکنے کا اشارہ کیا اور خاتون کو وین میں لٹایا۔ وین کے ڈرائیور نے خاتون کے بیگ سے تعارفی کارڈ نکالا تو اُس پر ''پروین شاکر'' لکھا دیکھ کر دہل گیا۔

اِدھر اسلام آباد کے ایک گوشے میں رقص اجل جاری تھا۔ اُدھر ایک اور گوشے میں واقع دفتر میں پروین کی عزیز ترین ہم درد سہیلی پروین قادر آغا کو دس بج کر بیس منٹ پر پروین کے بیٹے مراد کا فون آتا ہے۔ وہ گاڑی اور ڈرائیور مانگتا ہے۔ اُس روز اُن کا ڈرائیور ایک شادی کے انتظامات میں مشغول ہوتا ہے، لہٰذا وہ معذرت کر لیتی ہیں۔ مراد گلوگیر لہجے میں اُنھیں اپنی امی کے حادثے کا بتاتا ہے۔ پروین قادر آغا کا دل دہل جاتا ہے۔ وہ پریشان ہو کر سوچتی ہیں کہ کہیں پروین شاکر کو زیادہ چوٹیں نہ آئی ہوں۔ وہ اسپتال کی جانب لپکتی ہیں۔ وہاں شعبۂ حادثات میں اُس وین کا ڈرائیور موجود ہوتا ہے جو زخمی پروین کو اسپتال لایا ہے۔ وہ پروین قادر آغا کو بتاتا ہے کہ کار ڈرائیور فوت ہو گیا ہے۔ یہ سن کر اُن کی ٹانگوں سے جان نکل جاتی ہے۔ اچانک سامنے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے، اسٹریچر پر پروین کو لایا جاتا ہے اور اسے ایکس رے روم کی جانب لے جایا جاتا ہے۔ اتنے میں معصوم مراد (گیتو) ٹیکسی پر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنی امی کے لیے بے حال ہو رہا ہے۔

آپریشن تھیٹر کے ڈاکٹر مراد کی امی کو پہچان نہیں پائے اور جب اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ وہ پروین شاکر ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ پروین کے سر میں شدید ضربیں آئی ہیں اور ناک منہ سے خون بہہ رہا ہے۔

اتنے میں ایک نرس باہر آتی ہے اور پروین قادر آغا کے ہاتھ میں پروین کے ناک کی لونگ اور کلائی کی گھڑی رکھ جاتی ہے۔ وہ ہکا بکا کھڑی ہیں۔ اتنے میں وہی وین کا ڈرائیور آتا ہے اور کہتا ہے "وہ نہیں رہی، چل بسی۔" پروین قادر آغا کا بیٹا ڈاکٹر جہاں زیب بھی وہاں پہنچ چکا ہے اور ماں سے نظریں چرا رہا ہے۔ پروین شاکر کی موت کی اطلاع شہر بھر، ملک بھر اور دنیا بھر میں آناً فاناً پھیل جاتی ہے۔

دنیا کے لیے وہ پروین شاکر ہے، مراد کی تو امی ہیں۔

مراد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ سبھی بچے جن کی جوان مائیں مرجاتی ہیں، شروع میں تو اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔

پروین شاکر کی ماں اور بہن کراچی سے اسلام آباد پہنچ جاتی ہیں۔ اُن کے دل دوز بین دلوں میں چھید ڈالتے ہیں۔ ماں پکارتی ہے "پارو! تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ میری پارو! تم خاموش کیوں ہو؟ جواب دو، مجھ سے باتیں تو کرو۔"

جنازہ اُٹھتا ہے تو گھن گرج سے بارش شروع ہو جاتی ہے، بالکل ویسی ہی بارش جیسی پارو کی پیدائش کے وقت ہوئی تھی۔

6/7/2022

Great Sketch!

دم دم دامن

اُستاد دامن

پنڈت جواہر لعل نہرو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُنھوں نے جذباتی ہو کر اپنے پرانے سیاسی رفیق، پنجابی زبان کے معروف عوامی شاعر اُستاد دامن کو بھارتی شہریت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ استاد دامن نے جواب دیا "پنڈت جی، میں پاکستان ہی میں رہوں گا، چاہے وہاں مجھے جیل ہی میں رہنا پڑے۔"

یہ واقعہ ہے دِلّی کے لال قلعے میں 1955 منعقد ہونے والے مشاعرے کا جس کی صدارت بھارتی وزیراعظم اور راہ نما پنڈت جواہر لعل نہرو نے کی۔ ہند کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کے بعد دونوں ممالک کے لوگوں کے بیچ دکھ بھرے فاصلے دَر آئے تھے۔ وہ لوگ جو ایک ہی درخت کے شاخے تھے، اُن میں مغائرت آ گئی تھی۔ جنوری 1955 میں لاہور میں دونوں ملکوں کے بیچ کرکٹ میچ ہوا جس کے لیے بھارتیوں کو عارضی ویزے دیے گئے۔ بڑی تعداد میں ہندو، سکھ اور مسلمان بھارت سے لاہور آئے۔ لاہور میں تقسیم سے پہلے والی ہماہمی اور ثقافتی رنگینی قریباً آٹھ برس بعد نظر آئی۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لارنس گارڈن لاہور میں پنجابی کا مشاعرہ ہوا جس میں مغربی اور مشرقی پنجاب کے ہندو، سکھ اور مسلمان شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے کی رونق استاد دامن تھے۔ اس مشاعرے کے بعد لال قلعہ، دِلّی میں بھی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت نہرو نے کی۔ وہیں انھوں نے استاد دامن کو بھارتی شہریت کی پیش کش کی جسے استاد نے بہت محبت سے رَد کر دیا۔ استاد دامن نے وہاں پنجابی نظم پڑھی جس میں دونوں جانب کے عوام کی آنکھوں میں گریے کی وجہ سے اُتر آنے والی سرخی کو مشترکہ دُکھ کہا گیا تھا۔ لالی اکھیاں دی پئی دس دی اے، روئے تُسیں وی او روئے اسیں وی آں۔

یاد رہے کہ نہرو پنجابی سے آشنا، اُردو لکھت پڑھت میں رواں تھے اور ادب شناس تھے سو ان زبانوں کے شعرا بہ شمول جوش ملیح آبادی کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔

استاد دامن سے نہرو کا پہلا تعارف کانگریس لیڈر، بعد ازاں پاکستان ٹائمز اور امروز ایسے موقر روزناموں کے مالک، میاں افتخار الدین کی وساطت سے ہوا۔ یہ 1930 کی بات ہے جب استاد دامن اپنے والد کی باغبانپورا لاہور کی دکان پر درزی کا کام کرتے تھے۔ اُن کے لڑکپن کا زمانہ تھا، عمر انیس برس تھی اور شاعری سے مجنونانہ لگاؤ تھا۔ ایک مرتبہ میاں افتخار الدین اُس دکان پر شیروانی سلوانے کے لیے آئے، استاد دامن سے شعر سنے اور انھیں لاہور میں ہونے والے آل انڈیا کانگریس کے جلسے میں شعر پڑھنے کی دعوت دے دی۔ اُس جلسے کی صدارت نہرو کر رہے تھے۔ جلسے میں استاد دامن کا شاعری پڑھنے کا جذباتی اور من موہنا انداز شرکا کو بے حد متاثر کر گیا۔ اور نہرو نے انھیں "شاعرِ آزادی" کا خطاب دیا۔ وہیں انھیں انتظامیہ کی جانب سے دس روپے دیے گئے۔ وہ ہاتھوں میں پیسے پکڑے خوش گوار حیرت کا شکار ہو گئے۔ نہرو یہ سمجھے کہ شاید وہ غیر مطمئن ہیں سو استاد کو سو روپے دیے گئے اور ہدایت کی کہ آئندہ کانگریس کے پنجاب میں

ہونے والے ہر جلسے میں استاد کو شامل کیا جائے۔

تب تک استاد دامن کو اُن کے پیدائشی نام چراغ دین کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ اُستاد کا کمال صرف عوام کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کی جانے والی شاعری نہ تھا بلکہ وہ جملہ بازی، جگت، نکتہ آرائی اور سامعین کے مزاج پر بھی دست رس رکھتے تھے۔ وہ ہنستے تھے، ہنساتے بھی تھے، روتے تھے، رلاتے بھی تھے۔ البتہ اپنی زندگی کے اہم ترین حادثے پر وہ تنہا روئے تھے، وہ غم ساری عمر اُن کے اندر سرطان کی رسولی کی طرح پلتا رہا تھا۔

اُن کی بیوی اغوا ہو گئی تھی۔

اُن کی بیوی غیر مسلم تھی اور اُس کا نام کیتھرائن تھا۔ چوں کہ استاد نے بہت چاؤ اور لاڈ سے کیتھرائن سے بیاہ کیا تھا اور وہ غیر مسلم تھی اس لیے کسی الجھاؤ اور تنازع سے بچنے کے لیے استاد نے اس شادی کو لوگوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ جب تقسیم کے فسادات ہوئے تو استاد کو عوامی کانگریسی ہونے کی وجہ سے لاہور میں خاصا مشکل وقت دیکھنا پڑا۔ اُن کی دکان تک جلا دی گئی اور انھیں بادشاہی مسجد کے برآمدے میں منتقل ہونا پڑا۔ دریں اثنا اُن کے ہاں ایک بیٹا مولد ہوا۔ وہ پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد وفات پا گیا۔ اولاد کے مرنے کا غم وہی جانتے ہیں جو اس حادثے سے گزرے ہوں۔ شوہر مر جائے تو بیوی بیوہ، بیوی مر جائے تو شوہر رنڈوا، باپ مر جائے تو اولاد یتیم اور ماں مر جائے تو اولاد دیسیر کہلاتی ہے۔ اولاد کے مر جانے کی کوئی اصطلاح نہیں، یہ غم اتنا بے پناہ ہوتا ہے کہ اسے لفظ یا ترکیب میں قید کرنا محال ہے۔ بہر حال استاد کو بیٹے کی موت کا غم یوں کھائے جاتا تھا جیسے تیزاب کم زور دھات کو کھا جاتا ہے۔ اتنے میں فسادات کے دوران اُن کی بیوی کیتھرائن کو اغوا کر لیا گیا۔ عرصے بعد جب وہ ملی تو بہت کم زور ہو چکی تھی۔ استاد نے بعد میں بتایا ''کئی برسوں بعد وہ ملی تو میں نے اُس سے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں تھی، نہ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اس عرصے میں میں کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس رہنے لگی۔ بہت نحیف ہو چکی تھی۔ میں ڈاکٹروں کے پاس لے گیا تو انھوں نے بتایا کہ اسے کینسر ہو چکا تھا۔ درندوں نے اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اُس کے پیٹ میں رسولیاں ظاہر ہو گئی تھیں۔ میں غربت کی وجہ سے اس کا صحیح طریقے سے علاج نہیں کروا سکتا تھا۔ تین مہینوں بعد وہ مر گئی۔ میری محبت، میرا پیار، میری محبوبہ مر گئی۔ میں پاگل ہو گیا۔'' استاد دامن کے رفیق عبدالرحمان نے سنایا ''بیوی کی موت کے بعد استاد میرے پاس آئے اور کہا کہ کفن کا بندوبست کرو۔ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا، سوائے شادی کی انگوٹھی کے چناں چہ میں نے وہ بیچ ڈالی۔'' ہائے رے قسمت، ہائے ستم ظریفئ حالات۔ عبدالرحمان دل گرفتہ کر دینے والی روداد کا انجام سناتے ہیں ''جنازے کو سوگوار لے کر نہیں گئے۔ ہم نے چار مزدور اجرت پر کیے جو لاش کو قبرستان لے کر گئے۔ پیچھے

پیچھے چند جنازہ پڑھنے والے بھی چلے آئے۔''

یہ استاد دامن ہی تھے جو پنجابی شاعری میں اپنے دور کے نمایندہ شاعر ٹھہرے، جو پنڈت جواہر لعل نہرو کے جلسوں میں اشعار پڑھتے تھے، بعد ازاں ظہور الٰہی کے مقرب ٹھہرے، ذوالفقار علی بھٹو کے عتاب کا شکار ہوئے، فیض احمد فیض کے قریبی دوست ہوئے، مختار مسعود اور دیگر دانش وروں اور قلم کاروں کے دل بر تھے، جنرل ضیاالحق مشتاقِ ملاقات رہتے اور بیمار پڑے تو طاقت ور گورنر غلام جیلانی عیادت کو لپک کر آئے۔ یہ وہی استاد دامن تھے جو شاہ حسین ایسے پنجابی صوفی شاعر کی اُس کوٹھڑی میں عمر بسر کر گئے جس میں اس نے کبھی چلّہ کاٹا تھا، زنانِ بازاری کو رحم کی نظر سے دیکھا اور محنت کشوں کے درمیان ایک غریب آدمی کی زندگی گزار گئے۔

عرصہ پہلے مجھے ایک مہربان بزرگ شفقت پرویز بھٹی صاحب کا فون آیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ استاد دامن کی ہمہ جہت اور رنگا رنگ شخصیت پر لکھا جائے۔ وہ استاد کے ارادت مند تھے اور ان کے ساتھ خاصا وقت گزار چکے تھے۔ بعد ازاں اُن کا ایک مکتوب ملا جس میں اُن کے استاد کے حوالے سے براہ راست تجربے میں آنے والے دل چسپ واقعات، مکالمات اور مشاہدات تھے۔ مجھے استاد میں کچھ دل چسپی پیدا ہوئی۔ اتفاق سے پنجابی میرا التعلیمی مضمون بھی رہ چکا تھا سو اس میں ایک کشش بڑھ کر تھی۔ خاصا وقت گزر گیا۔ ایک روز فخر زمان صاحب سے رسمی گفت گو کے دوران تنویر ظہور صاحب کا تذکرہ ہوا جنھوں نے استاد پر خاصا کام کر رکھا تھا۔ تنویر صاحب اور امجد سلیم صاحب سے رابطے کے نتیجے میں تنویر ظہور صاحب کے شان دار کتاب ''استاد دامن۔ حیاتی، شاعری تے وچار'' کا برقی مسودہ ہاتھ لگا تو گویا ایک چمنستان کا در وا ہو گیا۔ استاد کی رنگین و پرکار شخصیت، اصلی خالص لہور کی فضا اور اس دور کا ساج تصویری معمے کے حصوں کی طرح اپنی جگہ بیٹھتے چلے گئے۔ بعد ازاں ڈاکٹر امجد علی بھٹی کی کتاب 'استاد دامن: شخصیت اور فن' تک رسائی ہوئی، متفرق تصانیف، مضامین اور انٹرویو سامنے آئے۔ کنول مشتاق کا استاد دامن پر کتابچہ ایک انمول تحفہ ٹھہرا۔ اسی جست جو کے دوران بعض احباب نے اُن کی شاعری پر اوزان اور تکنیکی حوالوں سے صائب اور برحق اعتراضات بھی کیے۔ اُن کی مطبوعہ شاعری ''دامن دے موتی'' کے نام سے کتابی صورت میں نظر کے سامنے آئی۔ بعض مرتبہ ایک نغمہ سن کر دل کو چھو لینے اور جذبات کے دھارے بدل دینے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ البتہ وہی نغمہ لکھا ہوا سامنے آئے تو خاص اثر نہیں ہوتا، جذبات میں سننے والی سی لہر جنم نہیں لے پاتی۔ ایسے ہی استاد کی شاعری زیادہ سماعت والی ہے۔ البتہ استاد دامن کی شخصیت ایسی رنگا رنگ ہے جیسے میٹھا لچھا اور مقامی ثقافت میں ڈوبی ہوئی ہے جیسے پرانی انار کلی کی کشمیری چائے میں گوال منڈی کا کلچہ۔

استاد دامن چوک متی لاہور کے ایک درزی میراں بخش کے ہاں مون سون اور خزاں کے بیچ

1911 کے سرخ اناروں والے ستمبر کے مہینے کی 4 تاریخ کو پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام کریم بی بی تھا، ایک بڑا بھائی اور ایک بڑی بہن تھے، نام چراغ دین رکھا گیا، والد کی درزی کی دکان لوہاری دروازے کے باہر تھی۔ ایک نیم خواندہ گھرانے کے اس لڑکے کی یادداشت غضب کی تھی اور حاضر دماغی کمال کی۔ قدرت اُسے اس جیسے ہزاروں لاکھوں لڑکوں میں سے عزت وشہرت کے لیے چن چکی تھی۔ بچپن میں کسی حافظ وقاری سے درس نہ لیا اور خود ہی پڑھ کر قرآن پاک حفظ کرلیا۔ دیوسماج اسکول لاہور سے تعلیم حاصل کی، جب والد کے پاس سلائی کا کام زیادہ ہوجاتا تو بیٹے کو اسکول سے اٹھا کر اپنے ساتھ کام پر لگا لیتے۔ جب کام تھم جاتا تو واپس اسکول داخل کروادیتے۔ والد کی خواہش تھی کہ بچہ ہنر سیکھ کر اُن کا ہاتھ بٹائے۔ ٹیلر ماسٹر وہاب کی شاگردی میں اُسے دیا جہاں اُس نے کوٹ پتلون سوٹ، شلوار قمیص، شیروانی اچکن سینا سیکھا، ٹیلرنگ میں ڈپلوما لیا، بورڈ وغیرہ کی پینٹنگ کا تجربہ حاصل کیا، لوہے کے کام کی سن گن لی، شاعری میں باؤ ہمدم کی شاگردی اختیار کی اور دم دم کا شعری نام اختیار کیا۔ والد کو شاعری سے شغف تھا اور انھیں ہیر وارث شاہ کے بہت سے حصے یاد تھے۔

اسکول میں انھیں اساتذہ مار پیٹ بہت کرتے تھے، اس لیے دل تعلیم سے اُچاٹ ہوتا گیا۔ گھر میں بھی مار پڑ جاتی تھی۔ ''ایک مرتبہ میں ایک پیر میں جوتی پہنے اور دوسرے ننگے پیر سے چلتا ہوا کلچہ لے کر گھر آرہا تھا کہ ایک چیل جھپٹ کر میرے ہاتھ سے کلچہ لے گئی اور اسے اوپر کھانے لگی۔ میں نیچے کھڑا رونے لگا۔ جب میں گھر پہنچا تو خوب پٹائی ہوئی۔ مجھے آج بھی وہ مار یاد ہے۔'' استاد حسرت سے بتاتے۔

بچپن میں استاد نے سائیکل کی گدیاں بنا کر بیچیں اور پکوڑے بھی بیچے، گلی ڈنڈا کھیلتے رہے اور پتنگیں بھی اڑائیں۔ یہ شاید بچپن کی پہلوانی کی مشق کا اثر تھا کہ بعدازاں شہرت مل جانے کے بعد بھی حلیے سے پہلوان لگتے۔ اُن کا رنگ گورا تھا، سر کو منڈوا کر رکھتے، دھوتی کُرتا پہنتے، کُرتے کے نیچے سلوکا پہنتے، سر پر پٹکا اور کندھے پر چادر رکھتے۔ بھاری ڈیل ڈول کے مالک تھے اور چلتے ہوئے تو ند نظر آجاتی۔ ایک مرتبہ بھارت گئے، وہاں امرت سر میں کوی دربار (مشاعرہ) کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک معاون جب استاد دامن کو اسٹیج پر لے گئے تو مشاعرے کا مہتمم دھیرے سے معاون سے بولا ''تمھیں شاعر لانے کے لیے کہا تھا، تم پہلوان لے آئے ہو۔'' یہ بات استاد نے سن لی۔ جب اُن کی اسٹیج پر باری آئی تو کہنے لگے ''دوستو! ابھی ایک سردار جی کہہ رہے تھے کہ ہم نے شاعر بلایا تھا، یہ پہلوان آگیا ہے۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں پنجاب کا شاعر ہوں، ہندوستان کا قلم دان نہیں۔'' اس پر پنڈال میں خوب قہقہے اُچھلے۔

زمانے کی رفتار تھمتی ہے اور وقت کا پہیہ پیچھے کی جانب کھسکتا ہے۔ ابھی استاد دامن دم نہیں بنے، فقط چراغ دین ہیں۔ اُن کے بڑے بھائی فیروز دین تیرہ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ اُنھیں اپنے

بڑے بھائی سے بے حد محبت تھی۔ یہ سانحہ اُن پر کاری ضرب لگا گیا۔ وہ دکھی اور اداس رہنے لگے۔ بھائی کی وفات کے بعد انھوں نے لاہور کی میونسپل کمیٹی میں ملازمت کی کوشش کی۔ بہت بعد میں جب بھی وہ سناتے تو رو پڑتے "ہم غریب تھے۔ میری ماں نے اُس نوکری کے لیے مجھے نئے کپڑے سلوا کر دیے اور نئے جوتے خرید کر دیئے۔ میرا قد چھوٹا تھا۔ اس لیے اونچے شملے والی پگڑی پہنا کر مجھے انٹرویو کے لیے بھیجا۔ میری سادہ محبت بھری ماں کو میری نوکری کی بہت امید تھی۔ مگر مجھے نوکری نہ ملی اور میری ماں کا خواب ٹوٹ گیا۔"

نوکری کے حصول میں ناکامی کے بعد اُنھوں نے جرمن کمپنی 'جان ولیم ٹیلرز' سے سلائی کا کورس کر کے باغبان پورہ میں اپنی دکان کھول لی۔

استاد دامن کی عمر ابھی انیس برس کی تھی، 1930 کا سن تھا کہ وہ سیاسی جلسوں اور مشاعروں میں متعارف ہو گئے۔ اس کے بعد انگریزی محاورے کے مطابق "سب تاریخ ہے۔" وہ سادہ زمانے تھے، عام زندگی کے وہ چٹکلے جو آج معمولی معلوم ہوئے ہیں، لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے تھے۔ دورِ حاضر میں برقی ذرائع کے بہ موجب طنز، مزاح اور پھکڑ پن کی مسلسل برسات کے باعث حسِ لطیف کند پڑنے لگتی ہے اور شائستہ شگفتہ بیانی بے معنی محسوس ہوتی ہے۔ تب فن کار اور مخاطب کا تعلق براہِ راست اور بالمشافہ ہوتا تھا، خواندگی و مطالعہ کم تھے اور بات زبان زد عام ہو کر پہنچتی تھی چناں چہ کوئی نیا پر مزاح شگوفہ حیرت و لطافت کا سامان رکھتا تھا۔ استاد دامن ظرافت، حاضر دماغی اور چست کلامی کے باعث اسٹیج پر خوب سماں باندھ دیتے، اپنی شاعری سنانے سے پہلے فضا بناتے اور لوگوں کو اپنی جانب مائل کر لیتے۔ لہٰذا ان کی شہرت جلسوں سے بڑھ کر پھیلنے لگی۔

ڈاکٹر امجد علی بھٹی نے مشتاق کنول کے حوالے سے استاد دامن کے ایک شاگرد سائیں حیات پسروری کا واقعہ کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"میں لاہور بلڈنگ کے قریب رہتا تھا۔ میں نے لاہور کی دیواروں پر پنجابی مشاعرے کے بڑے بڑے اشتہار دیکھے جن پر استاد ہمدم، استاد عشق لہر، کالی داس گوجرانوالیہ، ملکھی رام اور مولا بخش کشتہ ایسے نام وَر پنجابی شعرا کا نام درج تھا۔ میں بھی مشاعرے میں حصہ لینے کے لیے چلا گیا۔ مشاعرے کے اسٹیج سیکریٹری محمد حسین نیار یہ تھے، انھوں نے مجھ سے پوچھا آپ کا تعلق شاعری کے کس گھرانے سے ہے؟ میں نے کہا میں پیدائشی شاعر ہوں لیکن انھوں نے مجھے مشاعرہ پڑھنے کی اجازت نہیں دی کیوں کہ اس دور میں مشاعرہ وہی پڑھ سکتا تھا جس کا تعلق شاعری کے کسی نہ کسی گھرانے سے ہو۔ چناں چہ صبح میں نے اپنے ساتھی معراج دین سے "استاد ہمدم" کے ڈیرے کا پوچھا کیوں کہ رات کے مشاعرے میں مجھے ہمدم کے کلام اور پڑھنے کے انداز نے بڑا متاثر کیا تھا۔ معراج دین اَن پڑھ تھا، اس نے کہا "ہمدم" کو تو میں نہیں جانتا البتہ

باغبان پورہ میں دم دم کا ڈیرہ ہے۔

میں وہاں پہنچا تو ایک پہلوان نُما شخص اپنے دوست کا سہرا لکھوا رہا تھا۔ وہاں کا ماحول کسی قسم کے رکھ رکھاؤ اور تکلف سے بے گانہ تھا۔ بالکل درویشوں کے تکیوں کی طرح۔ میں وہاں ان کے درمیان ادب سے بیٹھ گیا۔ پہلوان نے پوچھا۔ "لڑکے کہاں سے آئے ہو؟" "مجھے باؤ ہمدم سے ملنا ہے۔" میں نے جواب دیا تو انھوں نے کہا "باؤ ہمدم سے ملنا ہے تو اکبری منڈی جاؤ اور اگر "دامن" سے ملنا ہے تو بیٹھے رہو اس لیے کہ میں ہی دامن ہوں۔" میں انھیں بہ غور دیکھتا رہا کیوں کہ وہ چند لمحے پہلے سہرا لکھوا رہے تھے، کسی سکھ کا سہرا تھا "جوڑی، جوڑی کہ ست کرتار جوڑی۔"

مصرع سن کر میں تو تڑپ اُٹھا تھا، ایک مصرعے میں تین بار "جوڑی" کا لفظ تین مختلف معنوں میں استعمال ہوا تھا۔ یہ خوبی تو صرف پیر فضل شاہ کے ہاں ملتی ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر انھوں نے دوبارہ پوچھا "ہمدم کو کیا کہنا ہے۔"

میں نے کہا "ان سے جو کہنا تھا میرا دل کہتا ہے کہ آپ سے کہہ دوں۔"

"کہو"

"آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔" انھوں نے میرا تعارف چاہا، میں نے اپنا تعارف شعروں میں کروایا تو انھوں نے کہا جذبات کا اظہار اچھی طرح کر سکتے ہو۔ جہاں تک شاگردی کا تعلق ہے تو تم یہاں چار پانچ ماہ رہو اس کے بعد فیصلہ کرنا۔ لیکن میں نے اصرار کیا تو انھوں نے کہا شاگرد بنانے کے تین سو روپے لوں گا۔

میرا بھائی، اس کا بیٹا اور میں انٹر لاک کمپنی (1939 سے 1946) میں درزی کا کام کرتے تھے۔ جب تن خواہ ملی تو میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو ان سے اور ڈیڑھ سو اپنے پاس سے لے کر پورے ساڑھے چار سو روپے لے کر دم دم کے ڈیرے پر پہنچا۔ انھوں نے کہا تین سو آپ کے اور ڈیڑھ سو میری طرف سے۔ استاد یہ رقم لے کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ان روپوں سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس سے استاد ہمدم، دھنی رام چاترک، نند لال نور پوری، تیجا سنگھ صابر، جسونت رائے سندر داس اور بہت سے شاعروں نے کلام پڑھا۔ اس طرح مشاعرے سے میرا تعارف ہوا۔"

ایک یادگار اور حیران کن لمحہ تھا جب سبھی دریا ایک سمندر بنے تھے۔ ایک ایسی آزاد فوج معرضِ وجود میں آئی تھی جس کا جھنڈا کانگریسی، ٹوپی گاندھی اور سینے پر آویزاں بیج مسلم لیگی تھا۔ اس فوج کا نام تھا "آزاد ہند فوج۔"

عوامی حافظہ کم زور ہوتا ہے، وہی ہندو، سکھ، مسلمان جو اک دوسرے کے درپے ہو گئے، ایک

دور میں، یہ زیادہ پرانی بات نہیں، فقط چند دہائیاں پہلے کا معاملہ ہے جب بھی تو میتیں اور مذاہب فرنگی راج کے خلاف یک جا ہوتے رہے ہیں۔

دسمبر 1939 میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو وائس رائے نے ہندستان کی جانب سے اپنے طور پر جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسی دور میں ایک لطیفہ مشہور ہوا۔ جنگ میں جبری بھرتی کے دوران ایک میراثی کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ اُس کی ماں روتی ہوئی انگریز افسر کے پاس آئی اور پوچھا ''بیٹا! یہ میراثیوں کا بچہ کدھر لے چلے ہو؟'' افسر نے میراثن میں فخر کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کہا ''تاجِ برطانیہ، شاہنشاہِ انگلستان کو جنگ میں آپ کے بیٹے کی ضرورت ہے، کیا یہ آپ کے لیے فخر کی بات نہیں؟'' یہ سن کر میراثن بولی ''بیٹا، اسے ضرور لے جاؤ پر اپنے بادشاہ کو ضرور کہنا کہ اگر نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ اسے جنگ میں میراثیوں کی ضرورت پڑ گئی ہے تو وہ دشمن سے صلح ہی کر لے تو بہتر ہے۔''

تفنن برطرف، وائس رائے کے اعلان کے خلاف کانگریس نے استعفادے کر سول نافرمانی کی تحریک ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک کا ظاہری مقصد ہندو مسلم اتحاد کی مدد سے ہندستان کی آزادی تھا۔ پنجاب میں حکم ران جماعت یونینسٹ کے لیڈر سر سکندر حیات نے مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کے خلاف بیان دیا۔ پنجاب کے بارے میں اُن کا کہنا تھا کہ پنجاب پنجابیوں کا ہے، ہندو پنجابی، سکھ پنجابی، مسلمان پنجابی، مسیحی پنجابی، سب پہلے پنجابی ہیں بعد میں مزید نظریے اور شناخت کا معاملہ آتا ہے۔ اس بنیاد پر ''رفاقت کمیٹی'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے اراکین میں مسلمان علما اور دانش وروں کے علاوہ جگن ناتھ آزاد (جنھوں نے پاکستان کا پہلا قومی ترانہ لکھا اور اقبالیات پر مستند و ثقہ حوالہ تسلیم کیے جاتے ہیں) ایسے جید ہندو اسکالر شامل تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہواروں اور مذہبی میلوں پر جاتے اور باہمی اتحاد کی تلقین کرتے۔ استاد دامن بھی اسی فکر و فلسفے کے موئد تھے (یاد رہے کہ قائدِ اعظم بھی ایک دور میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست وکیل رہے تھے، بعد کے تجربات نے انھیں اس فکر کے ابطلال پر آمادہ کیا)۔ ''آزاد ہند فوج'' جس کا جھنڈا کانگریسی، ٹوپی گاندھی اور بیج مسلم لیگی تھا، نے برطانوی سام راج کے لیے جدوجہد کی، ان کے سرکردہ اور متحرک کارکن ناکامی کے بعد گرفتار ہو کر پابند سلاسل ہوئے تو ان کی رہائی کے لیے قائدِ اعظم، جواہر لعل نہرو، گاندھی اور ابوالکلام آزاد ایسے جید راہ نما ایک پلیٹ فارم پر یک جا ہو گئے۔ جب یہ کارکن رہا ہوئے تو انھوں نے پنجاب بھر کا دورہ کیا اور ریلوے اسٹیشنوں پر رکتے عوام سے ملتے گئے۔ ایسے میں تمام جلسوں کے اسٹیج سیکریٹری استاد دامن ہوتے تھے۔

1946 کے کابینہ مشن کے بعد قافلہ آگے بڑھ گیا، دامن پیچھے رہ گئے۔ سر زمین ہند کی پیشانی پر خون کی لکیر دو ممالک تراشتی چلی گئی۔ آزاد پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو وہی لوگ جو دامن کو چومتے تھے اُن

کے درپے ہو گئے۔ اُن کی دکان کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ دامن کا دامن تار تار ہو گیا۔ اُن کی روزی کا وسیلہ چھنا تو وہ سڑک چھاپ تو نہ ہوئے چمن نشین ہو گئے۔ وہ لارنس گارڈن لاہور (موجودہ باغِ جناح) میں منتقل ہو گئے اور بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ معاوضے کے طور پر انھیں رقم نہ ملتی، البتہ طالب علموں کے گھروں سے کھانے پینے کا سامان آجاتا۔ ایک برس لارنس باغ کی رَوِشوں اور کونے کھدروں میں گزار کر دامن نے پرشکوہ بادشاہی مسجد کے برآمدوں میں ڈیرا ڈال لیا۔ وہاں دامن بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے اور معاوضے کے طور پر اُنھیں ''روٹی ٹکر'' مل جاتا۔

اس کے بعد وہ ٹیکسالی دروازے کے سامنے ایک حجرے میں منتقل ہو گئے۔ شنید تھا کہ اس حجرے میں مشہور پنجابی صوفی شاعر شاہ حسین نے چلہ کاٹا تھا۔ پس یہی کوٹھڑی، یہی حجرہ، یہی ڈیرہ استاد کا مستقل مستقر ٹھہرا تھا۔

شہرِ لاہور کا مزاج بدل رہا تھا۔ ثقافتی رنگا رنگی، گہما گہمی، مختلف مذاہب، فرقوں اور قومیتوں کی دیگ اُلٹ چکی تھی۔ شاہ عالمی کو آگ لگا دی گئی تھی، انار کلی کی بیش تر ہندو ملکیتی دکانیں اجڑ چکی تھیں، مندر گوردوارے، پاٹھ اشلوک کے ٹھکانے ویران ہو چکے تھے، اصل اصیل غیر مسلم لاہوریوں کی بڑی تعداد انتقالِ آبادی میں رخصت ہو چکی تھی اور ساتھ میں بہت سے میلے ٹھیلے، جشن تہوار بھی لے گئی تھی، اشنان تالاب اور حوض، منڈیروں کے بیچ اداس تھے۔ جس طرح پانی خالی برتن کو بھرتا ہے اسی طرح لاہور کے خلا کو مہاجرین کے علاوہ گردونواح کے قصبات و دیہات کے لوگ پُر کر رہے تھے۔ ایک نئی ثقافت وجود میں آ رہی تھی۔ اس ثقافت میں پہلی سی تاریخی، روایتی رنگا رنگی اور متنوع مہکار نہ تھی بلکہ یک رنگی تھی۔

دریائے اراوتی (راوی) کے کنارے آباد قدیم بستی لاہور کا تذکرہ کئی مستند تاریخی روایات میں موجود رہا ہے۔ ایک ہزار سال پرانی ''حدود عالم'' نامی دستاویز میں لاہور کو غیر مسلموں کا ایک ایسا شہر قرار دیا گیا جہاں ''متاثر کن مندر، شان دار منڈیاں اور وسیع و عریض باغات'' تھے۔ آنند پال کے دورِ حکومت میں لاہور پنجاب کا دارالحکومت رہا، سلطنت لوہانا (لوہار گڑھ) کا دارالحکومت بھی شہر لوہار (لاہور) رہا، اس کے وارث لوہانے، مسلمانوں کی فتوحات سندھ کے بعد یا تو مسلمان ہو گئے یا پھر کچھ، گجرات اور دیگر علاقوں میں بہ طور تاجر بس گئے۔ مغل دور میں لاہور سلطنت ہند کا سرمائی دارالحکومت ٹھہرا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ لاہور واپس صوبائی دارالحکومت کی حیثیت پر واپس آ گیا اور آزادی کے بعد قریباً گونگا ہو گیا۔ یہاں کی ماں بولی پنجابی کو ثانوی سے بھی کم تر حیثیت دے دی گئی۔ غالباً اس کے پسِ پردہ یہاں کے ساکنوں کی نفسیاتی پیچیدگیاں اور احساساتِ کم تری کارفرما تھے۔ اقوامِ متحدہ کے زیرِ انتظام ایک ادارے کی تحقیق (سن 2001) کے مطابق سندھ میں قریباً سینتیس ہزار (36750) سندھی زبان کے اسکول اور خیبر پختون خوا

میں قریباً گیارہ ہزار (10731) پشتو اسکول ہیں جب کہ پنجاب میں ایک اسکول بھی پنجابی زبان میں تعلیم نہیں دیتا۔ مشرقی پنجاب (بھارتی پنجاب) کا معاملہ دوسرا ہے کہ وہاں سکھوں کی مذہبی اور ابلاغ کی زبان پنجابی ہے۔

اُستاد دامن نے رومانی شاعری ترک کر کے عوامی، سیاسی شاعری اختیار کی۔ وہ اس روایت کا حصہ تھے جہاں باغات میں شعری داستان گوئی کی جاتی تھی۔ وہ سننے سنانے والی عوامی پنجابی شاعری کے اہم ستون بن کر اُبھرے۔

درویش وقلندر استاد دامن، دھوتی پہنے، بھاری بدن اور دیسی حلیے کے ساتھ سراپا لاہوری پنجابی علامت کے طور پر نظر آتے۔ وہی کشادہ دلی، ظرافت اور مخصوص مزاج۔ البتہ جابر حکم ران کے سامنے شمشیر برہنہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایوب، بھٹو اور ضیا دور میں صعوبتیں اٹھائیں۔ بازارِ حسن کی بغل میں اُن کا حجرہ مرجع خلائق ہوا۔ وہ خود تو جملہ تراش و جملہ باز تھے ہی البتہ بعض اوقات نٹ کھٹ دوستوں کے اپنے اوپر کسے گئے جملوں کا بھی لطف لیتے۔ ایک مرتبہ اُن کا ایک دوست اُنھیں ملنے آیا تو مسکراتے ہوئے ہیرا منڈی میں اُن کے حجرے کے حوالے سے بولا ''استاد جی آپ اس نکڑ پر اس طرح رہتے ہیں جیسے آپ ہیرا منڈی کے محصولیے ہوں۔''

وارث لدھیانوی فلمی دنیا کے معروف شاعر اور استاد جی کے شاگرد رہے ہیں۔ وہ بابا عالم سیاہ پوش کے ہم راہ دامن سے پہلی ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بابا عالم پوش کی زبانی استاد دامن کا کلام سن کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ سو دونوں ٹکسالی گیٹ میں واقع ان کی کوٹھڑی کو روانہ ہوئے۔ وہاں دامن بہت محبت سے ملے۔ ابتدائی تعارفی کلمات کے بعد استاد جی نے بابا عالم سیاہ پوش کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اُن کی قمیص میلی ہو رہی ہے، اسے اتار دیں تا کہ وہ دھو دیں۔ کچھ لیت ولعل کے بعد بابا عالم نے اپنی قمیص اتار کر استاد جی کو دے دی جو انھوں نے بالٹی میں دیگر بھیگے کپڑوں کے ساتھ ڈال دی۔ گفت گو جاری رہی اور کپڑوں کی دھلائی بھی۔ کپڑے دھونے کے بعد انھوں نے سڑک کے پار دھوپ میں دیوار پر ڈال دیے۔ بات چیت چلتی رہی یہاں تک کہ قمیص سوکھ گئی۔ استاد کی نظر قمیص کی ادھڑی سیون پر پڑی تو انھوں نے اسے سوئی دھاگے سے اپنے ہاتھوں سے بہت پیار سے سی کر بابا عالم کو پہنا دی۔ بابا ممنون ہو گئے۔ یوں استاد نے اپنے مشہور اور اہم شاعر ہونے سے بڑھ کر عمدہ انسان ہونے کا احساس وارث لدھیانوی کے دل و دماغ پر مرتسم کر دیا۔

ہندوستان کے مشہور صحافی سنتوش کمار کا دل چسپ واقعہ ہے۔

وہ دامن سے ملنے قدیم لاہور کی پُر پیچ گلیوں سے گزر کر ایک منہدم مکان کی کوٹھڑی کے سامنے

پہنچے اور دستک دی۔ اندر استاد نے دروازے کے ساتھ کتابوں سے اَٹی میز پر ٹیبل لیمپ روشن کیا ہوا تھا۔ انھوں نے روایتی پگڑی پہن رکھی تھی۔ جب سنتوش کمار نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ تقسیم سے پہلے کے جلسوں میں استاد کا کلام سنتے رہے ہیں تو وہ بغل گیر ہوکر آبدیدہ ہوگئے۔ خاصی دیر یوں بغل گیر رہنے کے بعد انھوں نے مہمانوں کو چار پائی پر بٹھایا اور کہنے لگے کہ ہزاروں پیغمبر اوتار آئے ہیں پر انسان، انسان نہ بن سکا۔ جب اسے موقع ملتا ہے درندہ بن جاتا ہے۔ استاد خاصی دیر بولتے رہے اور سامنے رکابی میں خشک میوہ جات انڈیلتے رہے۔ کسی کا ہاتھ لگا، رکابی اُلٹی اور میوہ جات گر کر بکھر گئے۔ جب سنتوش نے انھیں چننے کی کوشش کی تو بولے ''رہنے دو یار کھائیں گے۔''

''وہ یار کون ہیں؟'' سنتوش کے سوال پر استاد بولے ''چوہے'' مزید بولے ''کھانا نہ کھلاؤں تو یہ کتابیں کھائیں گے، روٹی بناتا ہوں تو انھیں روٹی کھلا دیتا ہوں، برفی لاتا ہوں تو وہ پیش کر دیتا ہوں، کوئی شاگرد بادام اخروٹ وغیرہ لے آئے تو انھیں بھی کھلا دیتا ہوں۔ ان کا پیٹ بھرا رہتا ہے، میری کتابیں بچی رہتی ہیں۔''

تنویر ظہور استاد دامن کے قلندرانہ مزاج اور بے نیازی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ استاد جی کے حجرے میں کتابوں کے انبار ہوتے تھے۔ ایک چار پائی، دو تین کرسیاں اور ایک میز رکھے ہوتے تھے۔ جب زیادہ لوگ ہو جاتے تو انھیں چار پائی پر بیٹھنا پڑتا۔ ایک مرتبہ انھیں بھی چار پائی پر بیٹھنا پڑا تو انھوں نے وہاں کھٹمل چلتے دیکھے۔ استاد سارا دن اسی چار پائی پر آرام سے بیٹھے رہتے۔ انھوں نے استاد جی سے پوچھا کہ کیا کھٹمل ان کا خون نہیں چوستے تو استاد کہنے لگے ''میرے خون میں اتنا نشہ ہے کہ کھٹمل اسے چوس کر خود نشئی ہو جاتے ہیں۔''

قیامِ پاکستان کے بعد استاد جی ہندوستان گئے تو ان کے بچپن کے دوست پنڈت کیشو رام نے اپنی پگڑی اُن کے قدموں میں رکھ دی اور کہنے لگا ''استاد جی یہ میرے گھر کی چابی ہے، آپ یہیں رہیں۔'' جب استاد کی باغبان پورہ میں درزی کی دکان تھی تو وہ وہاں کے اسکول کا استاد تھا۔ استاد اس کے خلوص اور محبت سے بہت متاثر ہوئے مگر یہ کہتے ہوئے حسبِ روایت معذرت کر لی ''میں پاکستان میں ہی رہوں گا، خواہ وہاں مجھے جیل میں رہنا پڑے۔''

جیل کی بات کا بھی قصہ سننے والا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں استاد دامن پر ایک جھوٹا کیس بنا دیا گیا جس میں ان پر الزام تھا کہ ان کے حجرے سے بم برآمد ہوا ہے۔

اس سے پہلے وہ ایوب دور میں بھی معتوب ٹھہرے تھے، اُن کی کئی مشہور نظموں میں سے حکومت

کے خلاف ایک نظم بہت معروف ہوئی تھی بلکہ اس کا ایک مصرعہ تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وچو وِچ کھائی جاؤ، اُتوں رولا پائی جاؤ۔ بھٹو نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے موقعے پر بھارت سے ہزار سالہ جنگ کا نعرہ لگایا تھا، بعد ازاں معاہدے کے لیے شملہ چلے گئے۔ چناں چہ استاد دامن نے ان پر چوٹ کرتے ہوئے نظم لکھی جس کے چند اشعار تو ایسے زبان زدِ عام ہوئے کہ آج بھی معروف ہیں۔ کدی شملے جانا ایں، لدی مری جانا ایں، ایہہ کیہ کری جانا ایں؟، ایہہ کیہ کری جانا ایں؟۔

بھٹو کی منتقم مزاجی سے ایک زمانہ واقف تھا۔ سو ایک روز چند پولیس کے اہل کار استاد دامن کی کوٹھڑی میں تلاشی کے بہانے داخل ہوئے اور وہاں سے بم کی برآمدگی کا جھوٹا مقدمہ بنا دیا گیا۔ اُنھیں گرفتار کر کے تھانہ ٹبّی کے حوالات میں قید کر دیا گیا۔

اس موقعے پر اپوزیشن کی کئی جماعتوں نے استاد کو اپنا آلۂ کار بنانے کے لیے رابطہ کیا۔ استاد نے اپنی آزاد طبیعت کے تحت اشعار کہے تھے اور فقط اپنے ہی ضمیر کو جواب دہ تھے سو انھوں نے تمام جماعتوں سے معذرت کر لی۔ فقط معروف سیاست دان اور سماجی شخصیت ظہور الٰہی سے تعاون قبول کیا۔ جب استاد جی کے پرستار اور دوست انھیں ملنے حوالات گئے تو وہ وہاں دیگر ملزموں کے ہم راہ ننگے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ خیر خواہوں کو دیکھ کر دامن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھیں تسلی دی گئی کہ اگلے روز ان کی ضمانت ہو جائے گی اور ایک ہم درد مشتاق بٹ نے گھر کا کھانا بھجوایا۔ اگلی صبح استاد دامن کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہاں اہم اور بڑے وکیل استاد کی معاونت کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ استاد سے پہلے لطیف مجسٹریٹ کی عدالت میں ماجھوڑا کو کو پیش کیا گیا جس کا ریمانڈ دے دیا گیا۔ جب استاد جی کی باری آئی تو مجسٹریٹ ان کا بھی پولیس کو ریمانڈ دینے لگا تو معروف وکیل ملک اسلم حیات بول اٹھے "کیا آپ ماجھوڑا کو اور استاد دامن میں کوئی فرق نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے ان کا ریمانڈ دیا تو تاریخ کے اوراق میں آپ کا نام سیاہ حروف میں لکھا جائے گا۔"

اس کے بعد اکبر لاہوری نے کمرا عدالت میں محمود غزنوی کے خلاف کہے گئے فردوسی کے فارسی اشعار سنانے شروع کر دیے۔ محمود غزنوی وہ اشعار سن کر ہنس پڑا تھا۔ قصہ مختصر، مجسٹریٹ نے استاد جی کی ضمانت منظور کر لی۔ جب استاد جی کو بار روم میں لایا گیا تو وکلا نے شرارتاً ان سے فیس کا تقاضا کیا۔ استاد دامن نے فیس کی رقم پوچھی تو ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ بہ طور فیس اپنے اشعار سنائیں۔ چاہنے والوں کی محبت دیکھ کر استاد جی دوبارہ آب دیدہ ہو گئے۔

یہ علیحدہ معاملہ ہے کہ بھٹو حکومت کے بعد، ضیا کے جبر کے دور میں بھی استاد نے اپنے ضمیر کی آواز پر حاکمِ وقت کو بلا تفریقِ سول و فوجی حکومت للکارتے ہوئے بانگ دہل اشعار کہے۔

سیاست دانوں میں چودھری ظہور الٰہی سے ان کا تعلق قلبی نوعیت کا تھا۔ وہ چودھری شجاعت

حسین کے والد تھے اور چودھری پرویز الٰہی ان کے بھتیجے ہیں۔ ان پر بھٹو نے بھینس چوری کا جھوٹا مقدمہ بنوادیا تھا۔ انھیں پنجابی لوک وصوفی شاعری اپنے والد سردار خان وڑائچ سے وراثت میں ملی تھی۔ استاد دامن سے اُن کے والہانہ لگاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے راوی روڈ لاہور میں اپنے کارخانے سے ملحقہ کمرا، غسل خانہ اور باورچی خانہ اُستاد جی کے لیے تعمیر کروایا اور ایک ملازم ان کی خدمت پر مامور کردیا۔ البتہ استاد جی نے شاہ حسین سے محبت کے باعث وہ کوٹھڑی نہ چھوڑی۔

عجب قیمتی دور تھا کہ اپنے وقت کے امرا اور سیاست دان، شعرا، ادبا اور فلسفیوں سے عقیدت بھری نیازمندی رکھتے تھے۔ سیاست دانوں میں قائداعظم شیکسپیئر کے عاشقِ صادق، پنڈت نہرو عمدہ اسکالر، گاندھی جی فلسفے کے پرچارک، بھٹو صاحب علم وصاحبِ کتاب، ان کی کابینہ کے بیش تر وزرا ادب وفنون کے دل دادہ اور بے شمار دیگر زعما تقاریر میں اقوالِ دانش واشعارِ پُرمعانی برمحل استعمال کرنے پر قادر تھے۔ استاد جی کے چاہنے والوں میں عام لوگوں کے علاوہ اہم صنعت کاروں، سیاست دانوں اور زمین داروں کے نمایاں نام شامل تھے۔ گو استاد دامن زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے پر مشاہدے اور مطالعے نے اُن کے اندر ایسا گداز اور زرخیزی پیدا کردی تھی جس سے خیال کی کونپلیں پھوٹتی تھیں۔

وہ کہتے تھے کہ ''اقبال کہتا ہے کہ جو چھین کر یا مانگ کر کسی کی روٹی لیتا ہے وہ گداگر ہے، چاہے بادشاہ ہو یا پیر، جو مرید سے نذرانہ لے کر کھاتا ہے دونوں گداگر ہیں۔''

کلبی صبح اٹھ کر کھڑا ہو کر زبان باہر نکال کر اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا بابا جی ایسا کیوں کرتے ہیں، کہنے لگا کہ میں اس زبان کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ سارا دن اچھے بول بولنا۔ اگر غلط بولوگی تو تم بول کر دانتوں کے اندر چھپ جاؤ گی اور مار سارے جسم کو پڑے گی۔ کبیر جی کہتے ہیں: جب لگ گھٹ میں پران ہیں تب لگ میٹھا بول، ہیرا تو داموں ملے بول کا مول نہ تول۔

کالی داس جی کہتے ہیں: مان گُنن سے ہوت ہے گن بِن مان نہ ہوئے، تو تا مینا ہر کوئی داکھے کاگ ندرا کھے کوئے۔

توتے اور مینا میں میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی صفت ہوتی ہے تو بادشاہ لوگ محلوں میں انھیں سونے کے پنجروں میں رکھتے ہیں۔ کوے کو ہر کوئی پتھر مار کر اُڑا دیتا ہے کیوں کہ وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ آخر میں اپنی رباعی سنائی جس کا پہلا شعر اسی کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ صرف چند غلط لفظ معمولی لگتے ہیں لیکن ان کا وزن منوں کے حساب سے ہوتا ہے۔ ایک آدمی اپنے ملازم دس بارہ سال کے بچے کو مار رہا ہے پاس سے علاقے کا طاقت ور انسان گزرا اس نے کہا ''کیوں مارتے ہو؟'' وہ بولا ''تم اس کے مامے لگتے ہو؟'' فرماتے ان دولفظوں سے اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ دوسرے مصرعے کا مطلب ہے ہیرا بھی کاربن ہوتا ہے کیونکہ

بھی کاربن ہوتا ہے۔اسے آگ کی تپش زیادہ لگ گئی وہ کوئلہ بن گیا۔میٹھی میٹھی تپش سے وہ ہیرا بن گیا۔اسی طرح تلخ گفت گو سے بات کوئلہ بن جاتی میٹھی گفت گو سے ہیرا بن جاتی ہے۔ساری دنیا میں عورت کی آزادی کی بات ہو رہی ہے کہ عورت کو گھروں میں قیدی بنا کر نہ رکھو اسے زندگی کی دوڑ میں شامل کرو: جگنو، دیوے، تارے، چن، سورج، ہون بتھیرے، اک گوری دے دو نیناں بن سارے کوڑھ ہنیرے۔

ایک مرتبہ دو چشم کشا واقعات کا ذکر کیا۔

پاکستان سے ایک دانش ور حج پر گیا۔واپسی پر اس نے دو ملاقاتوں کا ذکر کیا۔وہاں حمیدہ کور نامی عورت تھی، دوسرا جبار نام کا ایک کراچی کا سیٹھ تھا۔وہ دونوں وہاں روضہ پر جاروب کشی کر رہے تھے۔حمیدہ کور کی کہانی ہے کہ 1947 میں پٹیالہ کے کسی گاؤں سے سکھ اٹھا کر لے گئے پھر پاکستانی پولیس واپس پاکستان لے آئی۔گھر اور خاندان والوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لاہور ہیرا منڈی پہنچ گئی۔وہ جسم فروشی کرتی رہی۔رو رو کر پیسے جمع کرتی رہی۔جب پیسے پورے ہو گئے تو حج کی درخواست دی جو منظور ہو گئی۔حج کرنے کے بعد جب مدینے آئی تو مدینے کی حدود پر بیٹھ کر رونے لگی کہ میں یہ گندہ جسم لے کر اس پاک روضہ پر کیسے جاؤں۔دو تین دن بیٹھی روتی رہی۔تین چار روز بعد اس کے خواب میں حضورؐ آئے اور فرمایا ''حمیدہ! میں تم سے خوش ہوں میرے پاس آ جاؤ۔'' بس پھر اس دن سے یہ وہاں جھاڑو دیتی ہے۔جبار صاحب کراچی میں کئی ملوں کے مالک تھے اور ہر چھے ماہ بعد یورپ، امریکا عیاشی کے لیے جایا کرتے تھے۔ایک بار منیجر کو ٹکٹ لانے کو بھیجا۔وہ یورپ کے مختلف ملکوں کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کا ٹکٹ بھی لے آیا۔پوچھا ''یہ کیوں لائے ہو؟'' کہنے لگا کہ اس بار جناب عمرہ بھی کرتے آئیں۔جبار صاحب جانے لگے تو سوچا کہ پہلے عمرہ کر لوں پھر یورپ جاؤں گا۔جب روضۂ رسول پر پہنچے تو وقت پورا ہو چکا تھا لہٰذا بچوں کو فون کیا کہ سب کاغذات لے کر آ جاؤ دست خط کروا لو اور نصیحت کی کہ اپنی ماں کا خیال رکھنا۔اس روز کے بعد جبار بھی وہاں جھاڑو دیتے ہیں۔

ایک قصہ سنایا کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں ایک درویش بھگت تلسی داس نام کے تھے۔وہ ڈاکو تھے۔دن میں سادھو بن جاتے تھے، رات میں چوریاں کرتے، ڈاکے ڈالتے تھے۔باوا مکمل ہونے کے قریب تھا۔ایک دن صبح دریا پر جا رہے تھے، راستے میں بھنگن سڑک صاف کر رہی تھی۔یہ گہری سوچ میں چلے جا رہے تھے۔بھنگن بولی ''گورو جی ایک طرف ہو جاؤ۔'' انھوں نے گویا سنی ان سنی کر دی، چلتے گئے۔اس نے پھر کہا ''میں کہتی ہوں ایک طرف ہو جاؤ۔'' پھر چلتے رہے، جب قریب آ گئے تو اس نے جھنجوڑ کر کہا ''کیوں سر پر خاک ڈلوا رہے ہو ایک طرف ہو جاؤ۔'' وہ 'اچھا جی' کہہ کر واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔آ کر کنڈی لگا لی اور رونے لگ گئے۔شام کو ساتھی ڈاکو آئے۔انھیں کہہ دیا ''میں نے توبہ کر لی ہے گرو جی کا حکم

ہے۔''ایک طرف ہو جاؤ''لہٰذا میں ایک طرف ہو گیا ہوں اب تم جاؤ۔''

دیو جانس کلبی کے ساتھ اُن کی ایسی ذہنی و جذباتی وابستگی ہو گئی کہ جب اُن کا دمِ آخریں تھا اور اس وقت کے گورنر پنجاب جنرل (ر) غلام جیلانی اُن کے علاج کے لیے رقم کا چیک دے گئے تو انھوں نے فوری طور پر اُسے لوٹانے کا کہا۔ کہنے لگے کہ انسان کو رہنے کے لیے چھت، کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کو کپڑا چاہیے ہوتے ہیں، اس سے زائد اضافی ہوتا ہے۔ اگر یہ چیک واپس نہ کیا گیا تو مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ تب انھوں نے دیو جانس کلبی (جو کلبیت، سنک، Cynicism کا بانی و ترویج کار تھا) کا واقعہ سنایا''وہ دیوی ماں کے مندر کی سرنگ میں رہتا تھا۔ جب اُس سے سرنگ میں رہنے کی وجہ دریافت کی گئی تو وہ کہنے لگا کہ مرنے کے بعد بھی سرنگ ہی میں آنا ہے۔ میں لوگوں کا احسان نہیں لینا چاہتا کہ وہ میرے مرنے کے بعد مجھے اُٹھا کر سرنگ میں لے جائیں۔ سو میں اسی میں رہتا ہوں۔ وہ دن کی روشنی میں 'انسان' کی تلاش میں لالٹین لے کر پھرتا رہتا تھا اور رات کو جا کر سرنگ میں سو جاتا تھا۔ پس یہی سچ ہے۔ سو میں بھی کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا۔''

وہ مشہور ہندوستانی پنجابی شاعرہ امرتا پریتم کا بھی حوالہ دیتے تھے۔ اپنی شہرۂ آفاق نظم کے ابتدائی شعر سے بڑھتے ہوئے 'اج آکھاں وارث شاہ نوں ,کتوں قبراں وِچوں بول' میں اُس نے سکھ قوم کی فرد ہونے کے باوجود تقسیم کے فسادات میں عورت کی بے حرمتی پر بابا گورونانک کو نہیں پکارا بلکہ وارث شاہ کو آواز دی ہے۔ وہ اُنھیں ''دردمنداں دا دردی'' کہتے ہوئے قبر سے جگاتی ہے''اُٹھ تک اپنا پنجاب'' اور''اج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اِک ہور'' کہتے ہوئے وارث شاہ کو یاد کرتی ہے۔

استاد کا مسکن لاہور کا ایک ادبی مرکز بن چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر میں کافی ہاؤسوں، چائے خانوں اور اسٹوڈنٹ ہوسٹلوں میں سیاسی، فلسفیانہ اور ادبی مباحثے اور مناظرے ہوتے، نئے خیالات جنم لیتے اور تحریکوں کی بنیاد پڑتی۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ وہ سب رومان تلپٹ ہو گیا۔ وہ دوست جو کراچی کے زیلن ہاؤس اور ایرانی کیفے، لاہور کا پاک ٹی ہاؤس، سیال کوٹ کا امیلیا ہوٹل اور راول پنڈی کا برلاس ریستوران ایک دل پذیر خیالِ رفتہ کے طور پر یادداشت کے گنبد میں بہ طور فانوس روشن رکھتے ہیں چند حقائق بھول بھول جاتے ہیں۔ کیفے اور ٹی۔ ہاؤس کی وہ روایت جو ہندوستان آنے سے کئی صدیاں پہلے یورپ میں وجود پا کر پختہ ہو چکی تھی اور بیسویں صدی کے اوائل میں طلائی جوبن پر تھی دورِ حاضر میں وہاں بھی دم توڑ چکی ہے۔ پیرس کا''ارغوانی کیفے'' جہاں ہیمنگوے نے''دی سن آلسو رائزز'' ایسا شان دار ناول لکھا، جوژاں پال سارتر ایسے فلسفی، پکاسو جیسے مصور، جیمز جائس اور فٹز جیرلڈ کے سے ادیبوں کی آماج گاہ تھا، اطالیہ (اٹلی) کا سترھویں صدی میں قائم ہونے والا''پیڈروچی کیفے'' لارڈ بائرن ایسے دیو قامت

برطانوی ادیب، شاعر اور سیاست دان کے پاڈوا (اٹلی) میں پسندیدہ مقامات میں سے رہا، روس کے سینٹ پیٹرز برگ کا 'ادبی کیفے' دوستووسکی ایسے ناول نگاروں کی باقاعدہ نشست و برخواست کا مرکز ٹھہرا۔ دل چسپ بات ہے کہ یہ وہی کیفے ہے جہاں شہرۂ آفاق روسی شاعر الیگزنڈر پشکن نے آخری کھانا کھایا، اس کے بعد (Duel) دوبدو اعلانیہ مسلح مقابلے میں قتل ہوگیا، آج کے دور میں صرف سیاحوں کی دل چسپی کے مراکز ہیں۔ وہ ادبی بیٹھکیں اور مباحثے قصۂ پارینہ ہوئے، ختم ہوگئے۔ ایسے میں پاکستان کی چند ادبی بیٹھکیں اور کیفے وقت کے بہاؤ کے آگے کیا ٹھیرتے۔ ان کے نشانات اور باقیات توانا ادبی روایات کی موہوم یاد کے طور پر زندہ ہیں۔ یورپ میں 1945 کے بعد آنے والی ثقافتی موج نے اس روایت کے خاتمے کا آغاز کیا، صارفیت کے زور پکڑنے اور صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے تیز بہاؤ نے اسے جڑوں سے اُکھاڑا اور برقیاتی ترسیل وشہری رقبے کی غیر معمولی بڑھوتری اور فاصلوں کے اضافے نے اسے قریباً ایک از کارِ رفتہ یاد بنا ڈالا ہے۔ استاد دامن، شاہ حسین کا ڈیرا اور ہیرا منڈی کی چوکھٹ تو فقط بلبلے تھے جو وقت کے جوار بھاٹے کے سر پر اُٹھے، بکھرے، پھٹے اور معدوم ہوگئے۔ رہے نام اللہ کا۔

اُستاد کے ڈیرے سے بلاتفریقِ قومیت عوامی شاعری کی تانیں اُٹھتیں، لوک صوفی شاعری کے اشعار کی اشرفیاں اُچھالی جاتیں اور ذائقے دار رنگین فلمی شاعری کی گونج بھی سنائی دیتی۔ اُن کے معروف فلمی گیت سینماؤں، چائے خانوں، چوباروں، لاریوں، مکانوں، گلیوں اور بازاروں میں رنگوں کی پھوار کرتے: نہ میں سونے جئی نہ چاندی جئی، میں پتل دی بھاری پرات، مینوں دھرتی قلعی کرادے، میں نچاں ساری رات، کالا شاہ کالا، میرا کالا اے دلدار، گوریاں نوں پرانہہ کرو۔

استاد کو عمدہ پکوان اپنے ہاتھوں سے پکانے ہی کا شوق نہ تھا، دوسروں کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے کی خواہش اس سے بڑھ کر تھی۔ حکیم عبدالقدوس راوی ہیں کہ کبھی وہ ان سے نعمت کدہ ہوٹل سے دوپہر کا کھانا منگواتے تو کبھی مسجدِ شہدا کے قریب پٹواری مولا بخش کے نزدیک، ایک شخص بہت لذیذ کھانا فروخت کرتا تھا، سے بھی کھانا منگواتے۔ ایک روز حکیم صاحب سے کہنے لگے کہ وہ دو کلو چاول اور آٹھ کلو گوشت لے آئیں تاکہ سات منزلہ بریانی تیار ہو سکے۔ ابھی یہ معاملہ بیچ ہی میں تھا کہ پولیس استاد جی کو ''باغیانہ'' اشعار کہنے کی پاداش میں کسی اور بہانے گرفتار کرنے آگئی۔

استاد جی کے دوست محمد پرویز شفیع بتاتے ہیں کہ دامن اس اہتمام سے کھانا تیار کرتے کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ وہ بریانی، کھگے، کوفتے، گھیا گوشت، قورما، تیتر اور بٹیر بہت عمدہ بناتے تھے۔

ڈراما نگار، کالم نگار اور دانش ور منو بھائی رقم طراز ہیں کہ استاد جی سے آخری چند ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات ایک ''مرغ پارٹی'' پر ہوئی جس میں فیض احمد فیض بھی شریک تھے۔ وہاں استاد نے وعدہ کیا کہ وہ

منو بھائی کے گھر فیض صاحب کو ''بٹیر پارٹی'' دینا چاہتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے بٹیر پکائیں گے۔ اگلے روز اُنھیں ٹولنٹن مارکیٹ سے بٹیر لا دیے گئے جنھیں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پکانے سے پہلے رات بھر نچڑنے کے لیے اپنے حجرے میں لٹکا دیا۔ جب اگلے روز اُنھیں لے جانے کے لیے منو بھائی اور جاوید شاہین وہاں پہنچے تو استاد جی کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ انھوں نے درخواست کی کہ چوں کہ وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ کھانا پکا سکیں اس لیے وہ گھر پر کسی سے پکوا لیے جائیں۔ استاد جی بہ مشکل کھانے میں شریک ہوئے اور واپسی پر نڈھال ہو کر بے دم ہو گئے۔ پس منو بھائی کو اندازہ ہو گیا کہ استاد کا دمِ واپسیں ہے۔

کھانے، روایتی اقدار اور دامن کے سمبندھ کی ایک نکتہ خیز کہانی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ چوک متی، نواں بازار، اندرون لوہاری گیٹ میں بھی قیام پذیر رہے۔ وہ ناشتا کرنے ناولٹی سینما کے پاس ہوٹل چلے جاتے تھے جہاں ان کا ہوٹل کے ملازم کے ساتھ ادھار کھاتا چلتا تھا۔

کچھ عرصے پہلے ان کی باغبان پورہ والی دکان کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا، وہ ابتدائی طور پر لارنس گارڈن بعد ازاں بادشاہی مسجد کی عسرت آمیز رہائش سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔ جب مالک نے رجسٹر دیکھ کر ملازم سے اُدھار کھاتے کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ایک پہلوان نما شخص وہاں آتا ہے۔ اگلی مرتبہ استاد وہاں کھانا کھانے گئے تو مالک نے اُنھیں پہچان لیا، اُن کی تکریم کی اور اُن سے کہا کہ یہ اس کے لیے اعزاز کی بات ہے کہ وہ اس کے ہوٹل سے کھانا کھاتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ بغیر رقم ادا کیے وہاں سے ناشتا اور کھانا کھاتے رہیں۔ استاد مالک کے رویے سے بہت متاثر ہوئے اور ان دونوں کا ایسا تعلق قائم ہوا جو موت تک قائم رہا۔

اصل بات بعد میں آتی ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب ہوٹل مالک نے راوی پارک میں اپنا گھر بنایا تو استاد جی کو بہ اصرار وہاں منتقل کر دیا۔ مالک کے بیٹے اور بیٹی کو استاد نے اپنی اولاد قرار دیا اور ایسا حقیقی طور پر جانا بھی۔ وہ مالک کی بیٹی کو اپنی بیٹی اور بہو کو اپنی بہو کہتے تھے۔ جب بیٹی کا بیاہ ہو گیا تو استاد جی اپنے حجرے میں یہ کہتے ہوئے منتقل ہو گئے ''بیٹی اور بہو میں فرق ہوتا ہے۔ جب تک میری بیٹی بیاہی نہ گئی تھی وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ اب میں اس کی شادی کے بعد اپنی بہو کے گھر رہنا مناسب نہیں سمجھتا۔'' یہ وہ وضع داری تھی جو اس نسل کے بزرگوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔

روایتی وضع داری کے ساتھ ساتھ ان میں اندرونِ لاہور کے باسیوں کی سی حسِ مزاح اور شرارت بھی تھی۔ ایک پُرلطف ماجرا ہے۔

ایک دفعہ استاد ہندوستان میں مشاعرہ پڑھ کر پاکستان لوٹے تو بارڈر پر ان سے سوال کیا گیا کہ

کیا وہ بھارت میں پنڈت نہرو سے ملے تھے اور ان سے استاد کا کیا تعلق ہے۔ استاد جی نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ شاعر ہیں اور پنڈت نہرو نے بہ طور وزیر اعظم مشاعرے کی صدارت کی تھی۔ جب کئی مرتبہ سمجھانے کے باوجود اہل کار سمجھ نہ پائے تو استاد نے زچ آ کر کہا "میرا نہرو سے ناجائز تعلق ہی سمجھ لو۔"

دامن کی بے ریا طبیعت کا ایک اور ماجرا ہے۔ جب ان سے بار ہا پوچھا گیا کہ وہ اپنا مجموعۂ کلام کیوں نہیں چھپواتے تو انھوں نے یگانہ چنگیزی کا واقعہ سنایا "یگانہ چنگیزی ایک بڑا شاعر تھا۔ وہ ایسے شعر کہتا تھا جو لوگوں کو کم ہی ہضم ہوتے تھے۔ کسی کے ابھارنے پر اُس نے اپنا مجموعہ شائع کروا لیا۔ بس پھر کیا تھا، شہر بھر کے مسلمان اکٹھے ہو گئے، شاعر کو گھر سے نکالا، منہ کالا کیا اور گدھے پر بٹھا کر شہر بھر کا چکر لگوایا۔ اس واقعے کے بعد اُس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور دوبارہ کبھی گھر سے نہ نکلا۔ اُس کے گھر کا دروازہ اُس کی موت کے بعد ہی کھلا۔ میرے اشعار مظلوم عوام کے حق میں اور جابر حکم رانوں کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس لیے مجھ پر جھوٹے مقدمے قائم کر دیے جاتے ہیں۔ کیا اب تم لوگ چاہتے ہو کہ میرا حشر بھی یگانہ چنگیزی جیسا ہو؟ تمھارے پاس میرا کلام موجود ہے۔ اسے میری موت کے بعد شائع کروا لینا۔" استاد کی خواہش پوری ہوئی۔ ان کا کلام ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہوا۔ استاد نے ایک بہت پتے اور گُر کی بات بھی سمجھائی۔ شفقت پرویز بھٹی بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک امیر آدمی کو استاد جی کے پاس دکھی بیٹھا دیکھ کر، اُس کے چلے جانے کے بعد رئیس کے غم گین ہونے کی وجہ پوچھی تو استاد جی نے حسبِ معمول تاریخ، روایت، اساطیر، لوک دانش اور فلسفے کے حوالہ جات میں سے ایک کا تذکرہ کیا "مہاتما بدھ کی تعلیم میں خدا کا تذکرہ نہیں ہے۔ انھوں نے صرف انسان کے دکھ کو سمجھنے کے لیے تاج و تخت چھوڑے اور جنگل جا بسرام کیا۔ وہ غم کی ماہیت اور وجہ تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی جڑ تک پہنچ گئے کہ دکھ کہیں نہیں ہے۔ یہ لفظ انسان کی خواہشات، توقعات اور سوچ کا نتیجہ ہے۔ اگر خواہشات اعتدال کی حدود میں رہیں تو ٹھیک ہے۔ اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو انسان بے چین رہنے لگتا ہے، یہیں سے دکھ جنم لیتا ہے۔ خواہشات کو ختم کر دو، دکھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔" بہ ظاہر استاد جی نے ایک پیچیدہ معاملے کا سادہ حل تجویز کیا جو شاید پوری طرح اس مسئلے پر منطبق نہ ہو پر اہم وجوہات میں سے اہم ترین ضرور ہے۔

صلح جوئی، قلندری اور سادگی اس مردِ درویش کی پوستین تھی۔ وہ اسلحے کو "لوہا" کہتے تھے اور اسے رکھنے کے حامی نہ تھے۔ ایک صبح اپنے ایک ملاقاتی حواری سے کہنے لگے "لوہا کیوں اٹھائے پھرتے ہو، اسے دفنا دو، وگرنہ یہ تمھیں دفنا دے گا۔" اُس محبت کرنے والے نے استاد جی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اسلحہ رکھنا چھوڑ دیا۔

عوامی آدمی تھے، عام آدمی کی زندگی کے کڑوے سچ اور کھری زندگی کو خوب جانتے تھے، لہٰذا

اونچی سوسائٹی کی منافقت سے چڑتے ہوئے کہتے تھے کہ اس طبقے کے عورت اور مرد رات میں ایک دوسرے کے قرب میں فاصلۂ من و تُو مٹا کر ایک ہو جاتے ہیں اور صبح اُٹھ کر شور مچانے لگتے ہیں "بیگم، میرا تاول، ڈارلنگ، میرا تولیہ۔"

ترقی پسندانہ سوچ اور صحت مندانہ ذہن کی وجہ سے عورت کی از حد عزت کرتے۔ اگر ان کے پاس کوئی زن بازاری آجاتی تو عقیدت میں بچھ بچھ جاتی۔ وہ ایک شریف گھرانے کی پاک باز عورت کو حسب روایت عزت تو دیتے ہی تھے، طوائف اور مجبور عورت کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس کی ایک لڑکی اُس بازار کی عورتوں پر تحقیق کر رہی تھی۔ اُس نے ایک گانے بجانے والی عورت زرینہ کا انٹرویو کیا تو وہ جذباتی ہو کر بولی "اے لڑکی! ہم سے کیا پوچھتی ہو، وہ کوٹھڑی میں ہمارا بابا دامن بیٹھا ہے۔ اس سے پوچھ لو۔"

جنرل ضیا الحق سے استاد دامن کی ملاقات کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ان کی زبانی ایک روایت کے مطابق اُن کی ملاقات ہوئی تو ضیا نے ان سے شاعری سننے کی فرمایش کی، استاد جی نے حکومت کے خلاف کہی گئی نظم سنا ڈالی، جس پر جنرل ضیا کو غصے سے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ استاد جی بسا اوقات گفت گو میں مبالغے کا تڑکا لگا دیا کرتے تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ نظر آتا ہے۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ روسی، فرانسیسی، فارسی، انگریزی، ہندی، گورومکھی، اردو اور پنجابی زبانیں جانتے تھے۔ غالباً اس بات میں مبالغہ تھا۔ وہ اردو، گورومکھی اور پنجابی میں یقیناً مہارت رکھتے تھے، دیگر زبانوں کی فقط شد بد رکھتے تھے۔ گورومکھی کی تعلیم تو انھوں نے باقاعدہ طور پر کئی لوگوں، بشمول وارث لدھیانوی، کو دی۔ وہ "ہیر" کو اپنے انداز میں نئے سرے سے لکھ رہے تھے اور پنجابی زبان کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے گورومکھی سکرپٹ میں (جو مشرقی پنجاب، بالخصوص سکھوں میں رائج و مستعمل ہے) مہارت کو ضروری سمجھتے تھے۔

دوسری روایت زیادہ مستند اور ذائقے دار ہے۔ جنرل ضیا اور استاد دامن کی ملاقات ہوئی تو دونوں خاصی دیر 'باہمی دل چسپی' کے موضوعات پر بات کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ضیا نے استاد جی سے فرمایش کی کہ وہ اپنی کوئی نظم سنائیں، بھلے وہی سنائیں جو ضیا کے بارے میں تھی۔ استاد بھی گرگِ باراں دیدہ تھے، ضیا کے جھانسے میں کیسے آ سکتے تھے۔ لہٰذا کہنے لگے "جنرل صاحب یہ موقع نظم سنانے کا نہیں، ہم شادی کی تقریب میں آئے ہوئے ہیں، موقع ملا تو کسی جلسے میں سناؤں گا۔" توقف کر کے بولے "جنرل صاحب یہ ریڈیو نہیں، جب دل کیا، بٹن دبایا، لاہور ریڈیو لگا لیا اور دل چاہا تو جالندھر ریڈیو لگا لیا۔" یاد رہے، جنرل ضیا کا تعلق جالندھر سے تھا۔ اس جملے میں اُن پر لطیف چوٹ کی گئی تھی جو اُس دورِ آمریت میں دامن کی شانِ استغنا کی جانب اشارہ کرتی تھی۔

جب استاد دامن بسترِ علالت پر تھے، ضیاالحق نے ان کے لیے گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی کے ہاتھ گل دستہ اور دس ہزار روپے کا چیک اسپتال بھجوایا، جو انھوں نے فوری واپس کرنے کا کہا۔ لوگ اُن کے تکیے کے نیچے عقیدت سے پیسے رکھ جاتے، اُنھیں پتا چلتا تو وہ رقم ضرورت مندوں اور اسپتال کے عملے میں تقسیم کروا دیتے۔

وہ اسپتال میں داخل تھے کہ فیضؔ صاحب کی رحلت کی خبر آئی۔ غم سے نڈھال ہو گئے۔ ضد کر کے اسپتال سے اٹھ کر فیض کے جنازے میں شریک ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ فیض صاحب کی چار پائی کو پکڑ کر اپنے دوست کی میّت کو پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ اُس روز اُن کی حالت بگڑ گئی۔ واپس اسپتال آئے تو وصیت کی کہ اُن کی کتابیں دیال سنگھ لائبریری کو دے دی جائیں۔

جب استاد دامن کا آخری وقت آیا تو ان کے ایک عقیدت مند راجا ریاض نے اُن کا ہاتھ دبایا، اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جیسے خون کی سرخی آ گئی ہو، جواباً انھوں نے راجا ریاض کا ہاتھ دبایا۔ راجا صاحب بولے ''استاد جی لگتا ہے آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ہم جلد گھر واپس چلے جائیں گے۔'' استاد دامن نے کہا ''میں چلنے کے لیے ہی آیا ہوں۔'' یہ اُن کا آخری جملہ تھا۔

دیسی مہینے مگھر کی 18 تاریخ، 3 دسمبر 1984 کو ان کی میّت کو اُن کے قریبی دوست شیخ محمد رفیع کے گھر قلعہ گجھمن سنگھ لایا گیا، نمازِ جنازہ مینارِ پاکستان کے سائے میں بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد نے پڑھائی، باغبان پورہ کے قبرستان میں تدفین سے پہلے ان کی میّت بازار حسن کی بغل میں واقع ان کے حجرے کے سامنے لا کر رکھی گئی۔

دامن، جس کی بیوی اغوا ہوئی، پھر کینسر سے مری، بیٹا بازوؤں میں دم توڑ گیا، بڑا بھائی تیرہ برس کی عمر میں گزر گیا اور وہ وسیع دنیا میں یک و تنہا رہ گیا تھا، کی میّت ہیرا منڈی کی بغل میں شاہ حسین کے چلّے والی کوٹھڑی کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے پڑی تھی۔ آس پاس کی گلیوں سے پیشہ ور مجبور عورتوں کے رونے، دھاڑنے، بین کی آوازیں اُٹھیں، رنگ محل، پانی والا تالاب اور گرد و نواح کے گھروں کی گھریلو عورتوں کی سسکیاں پھیلتی چلی گئیں۔ اُس روز سب عورتوں، ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کا ''بابا دامن'' اور مردوں کا محبوب ''استاد دامن'' شاہ حسین کے حجرے کو ویران کر گیا تھا۔ بیوی کے مرنے پر وہ اکیلا رویا تھا، اُس روز ایک زمانہ اُس کے لیے آنسو بہا رہا تھا۔

یوں پنجاب کی، پنجابی زبان کی، پورے ملک کی مجبور و غریب عوام کی نمائندہ لوک، عوامی شاعری کا آخری بھاری بھرکم چاندی میں ڈھلا دروازہ بند ہو گیا۔

مہا منٹو

سعادت حسن منٹو

منٹو ابھی خوب صورت، گول مٹول معصوم کشمیری لڑکا ہی تھا تو اُس کا باپ اسے تھپڑوں سے پیٹتے ہوئے کہتا تھا "تُو جیل جائے گا یا پاگل خانے۔"

اُردو کے صفِ اوّل کے ادیب سعادت حسن منٹو نے دو عشق کیے، ایک محبت کی، ایک رومانی شیفتگی میں مبتلا ہوا، میٹرک میں دو مرتبہ اُردو کے مضمون میں فیل ہونے کے باوجود اُردو کا اہم ترین ادیب ٹھہرا۔ فلمیں لکھیں، سیکڑوں افسانے، خاکے، ڈرامے، کالم، مضامین اور خطوط تحریر کیے، خودکشی کی ایک ناکام کوشش کی، ہندوستان میں کسی قدر معاشی خوش حالی کے دن گزارے، تقسیم کے بعد ہندوستان میں قسمت آزمائی کے لیے رک گیا، چند ماہ میں حالات دگرگوں ہوتے دیکھ کر بمبئی سے سمندر کے رستے کشتی سے 1948 میں کراچی اور پھر لاہور پہنچ گیا، بٹوارے کے بعد پاکستان میں تنگ دستی کی زندگی لکشمی مینشن، مال روڈ، لاہور میں کاٹی، چند دوست بنائے، زیادہ مخالف اور حاسد۔ اپنی زندگی ہی میں شہرت کا عروج دیکھا، آخیر میں ایسے مواقع بھی آئے کہ بہ قول ابوالحسن نغمی اور محمد اسد اللہ، مال روڈ پر شراب کی خاطر راہ گیروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر ہم راہی دوستوں نے مجبور کیا، بیالیس برس کی جواں عمری میں وفات پائی، خوش حال گھرانے میں پیدا ہوا اور غریب ادیب کی موت مرا۔ بہ وقت نزع ناک مڑ چکی تھی۔ جنازے میں مٹھی بھر لوگ شریک ہوئے۔ وہی دوست جو سوئے مے کدہ لے کر چلے، بہ وقت وفات اور بعد ازاں منٹو سے بے پروا فحش لطائف، غلیظ قہقہے اور بدبودار حملے کسنے میں مصروف رہے۔

منٹو کے دو عشق تھے۔ ایک اپنے مرحوم بیٹے عارف سے، دوسرا اسد اللہ خاں غالبؔ سے۔

ایک مرتبہ منٹو نے معروف ادیبہ عصمت چغتائی سے اپنے بیٹے کے بارے میں کہا تھا "خدا کی قسم اتنا سا پیروں سے چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درزوں سے مٹی نکال کر کھالیا کرتا تھا۔ میرا بڑا کہنا مانتا تھا۔ آپ یقین کیجیے چھے سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سُلانے لگا تھا۔ میں اسے خود تیل مَل کر نہلاتا۔ تین ماہ کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو بس پڑی سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوا لیتا۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے یوڈی کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیے نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں۔" منٹو نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کی اور بولا "مگر وہ مر گیا۔ اچھا ہوا وہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو میں آج اس کے پوتڑے دھوتا ہوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا۔" یہاں پہنچ کر منٹو نے ضبط کرتے ہوئے کہا "سچ مچ عصمت بہن، مجھے اس سے عشق تھا۔"

منٹو کا دوسرا عشق غالبؔ تھا۔ اپنی وفات سے پہلے منٹو پہروں اکیلا بیٹھا غالبؔ کے اشعار پڑھتا

رہتا تھا۔ وہ شاعری کے متعلق کہتا تھا ''سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ شاعری کیوں کرتے ہیں۔ غالب کے بعد کسی کو شاعری کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔'' یہ جملہ منٹو کی حقیقی سوچ سے زیادہ غالب سے جذباتی تعلق کا عکاس نظر آتا ہے۔

ایک صبح اے حمید اور شاد امرت سر پاک ٹی ہاؤس کے باہر کھڑے تھے کہ ایک دمکتا ہوا صاف ستھرا تانگا اُن کے پاس آ کر رُکا۔ اس میں موٹی ذہین آنکھوں والا نکھرا نکھرا منٹو بیٹھا تھا۔ منٹو نے اُنھیں تانگے پر سیر کرنے کی دعوت دی۔ دونوں تانگے پر جم کر بیٹھ گئے تو منٹو نے کوچوان کو بازارِ حسن چلنے کا حکم دیا۔

شاد امرت سری نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''منٹو صاحب، صبح کے وقت ہیرا منڈی؟''

منٹو نے اسے سمجھاتے ہوئے ڈانٹا'' بکواس نہ کر۔ بزرگ فرما گئے ہیں کہ طوائفوں کے ہاں صبح کے وقت جانا چاہیے۔''

تانگے کو ٹیکسالی گیٹ پر رکوا کر وہ ہیرا منڈی کو چل دیے۔ منٹو نیم مخمور تھا۔ شاد امرت سری نے بھی موقع مناسب جانتے ہوئے رستے میں منٹو کی بوتل سے دو چار گھونٹ لگا لیے تھے۔

بازارِ شیخوپوریاں میں وہ ایک شناسا طوائف کے کوٹھے پر جا رُکے۔ طوائف منٹو کو دیکھ کر کھل اٹھی اور لکھنوی انداز میں بولی ''زہے نصیب، تشریف لائیے۔''

تینوں اس کی بیٹھک میں تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ منٹو نے اے حمید کی جانب اشارہ کر کے طوائف سے کہا ''اس سے بچ کر رہنا، تمھیں دیکھ کر رومانٹک ہو جائے گا۔''

رسمی گفت گو کے بعد طوائف نے منٹو سے کہا ''منٹو صاحب کیا پیش کروں؟''

منٹو بولا ''میری کوئی غزل سناؤ۔''

طوائف حیرت سے بولی ''منٹو صاحب آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟''

منٹو نے شاد امرت سری کی طرف دیکھا اور طوائف سے بولا۔

''کرتا تو نہیں ہوں۔ غزل لکھنی کون سی مشکل بات ہے۔ تم پانی اور گلاس منگواؤ۔ ابھی غزل ہو جائے گی۔''

پانی اور گلاسوں کا اہتمام ہو گیا اور دور شروع ہو گیا۔ منٹو مزید مخمور ہونے لگا۔ شاد امرت سری کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ''غالب کے بعد تم لوگوں کو ڈوب مرنا چاہیے۔ بڑا ہپ ٹلا شاعر تھا۔ سارے شاعروں کا دھڑن تختہ کر دیا۔''

اس دوران طبلے ہارمونیم والوں کو بہ طور خاص منٹو کی خاطر دن کے وقت بلا لیا گیا۔ منٹو نے

طوائف سے فرمائش کی۔

''غالبؔ کی وہ والی غزل سناؤ جس کا مطلع ہے۔نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی، مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی۔''

طوائف پر سکتہ طاری ہوگیا۔وہ ہاتھ جوڑ کر بولی ''منٹو صاحب یہ دو منزلہ غزل میرے بس کی بات نہیں۔کوئی غریبی دعوے کی آسان سی غزل بتائیں۔''

یہ سن کر منٹو کا مزاج بدل گیا اور وہ بولا ''اگر تم نہیں گا سکتیں تو ہم گائیں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے ہارمونیم اور طبلے والے کو سنگت کی ہدایات دیں اور گانا شروع کر دیا۔گاتے گاتے وہ مکمل مخمور ہوگیا۔شادامرت سری اور اے حمید نے منٹو کو سہارا دے کر تانگے پر بٹھایا۔گھر پہ صفیہ نے دروازہ کھولا اور شادامرت سری کو دیکھ کر ناک بھویں چڑھاتے ہوئے بولی ''تم پھر آ گئے؟''

منٹو کی زندگی جیل میں تو نہ گزری پر ذہنی شفاخانے میں اس کے دن ضرور گزرے۔وہاں ایک سنجیدہ اور بردبار مریض منٹو کا معتقد تھا اور اُسے بہت محبت سے ''ومٹو صاحب'' پکارا کرتا تھا۔وہ مریض سردیوں کی صبحوں کو صحن میں کرسی رکھ کر نہایت انہماک سے انگریزی اخبار کا مطالعہ کیا کرتا۔اس شفاخانے کے تمام مریض اپنا کام خود کرتے تھے۔ان میں اپنے کپڑے دھونا اور دھوپ میں سکھانا شامل تھا۔ایک مرتبہ منٹو نے اپنے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے دھوپ میں ڈالے۔شام کو انھیں اُتارنے کا وقت آیا تو منٹو کا زیر جامہ غائب تھا۔منٹو پریشانی میں زیر جامہ ڈھونڈنے لگا۔اسی دوران وہی مریض منٹو کے پاس آیا اور پریشانی کی وجہ پوچھی۔منٹو نے زیر جامے کی گم شدگی کا ذکر کیا۔وہ بھی منٹو کے ساتھ بہت توجہ سے زیر جامہ تلاش کرنے میں مصروف ہوگیا۔صحن کو اچھی طرح دیکھا گیا، برآمدے کے ہر کونے کھدرے میں تلاش کیا گیا اور ہر ممکنہ جگہ کی پڑتال کی گئی۔خاصا وقت بیت گیا اور زیر جامہ نہ ملا۔تھک ہار کر دونوں ایک جانب خاموش بیٹھ گئے۔کچھ دیر بعد اُس مداح مریض نے اپنا کُرتا اٹھایا اور منٹو سے پوچھا ''آپ کا زیر جامہ یہ تو نہیں؟''۔ اُس نے منٹو کا زیر جامہ پہن رکھا تھا۔

منٹو کی واحد محبت اُس کی بیوی صفیہ تھی۔صفیہ نہ ہوتی تو منٹو نہ ہوتا، صرف سعادت حسن ہوتا۔ صفیہ نے بدترین حالات میں بھی منٹو کا ساتھ نہ چھوڑا، دل جوئی کی اور ہر اعتبار سے اپنے شوہر کی خیرخواہ ہوئی۔اکثر و بیشتر وہ منٹو کی بے اعتدالیوں کے ہاتھوں افسردہ ہو جاتی، پھر وہی محبت عود کر آتی۔صفیہ اور منٹو کے تعلق میں چند دل چسپ باتیں ہیں۔دونوں 11 مئی کو پیدا ہوئے، منٹو 1912 اور صفیہ دین (بعدازاں صفیہ منٹو) 1916، دونوں سیاہ فریم کے چشمے لگاتے تھے، دونوں کشمیری النسل تھے، منٹو مکمل خاندانی آدمی تھا جو صفیہ کے کپڑے استری کرتا تھا، بہ وقت ضرورت باورچی خانے میں جا کر کھانا پکاتا تھا، صفیہ کی بیماری میں

اس کے بالوں میں کنگھا کر کے چٹیا بناتا تھا اور بیٹیوں کو سنبھالتا تھا۔ وہ آتشِ مزاج مشہور تھا اور غصے میں آ کر پھٹ بھی پڑتا تھا، البتہ ایک بھی شہادت میسر نہیں کہ اُس نے کبھی صفیہ کو ڈانٹا ہو یا اُس کے سامنے آواز بلند کی ہو۔ بلکہ معافی مانگنے میں وہ ہمیشہ پہل کرتا تھا۔ یہ علیحدہ معاملہ ہے کہ صفیہ بنیادی طور پر سادہ مزاج گھریلو عورت تھی جب کہ منٹو عمدہ ذوق کا مالک تھا جو صاف ستھرے لباس، عمدہ کاغذ، چاندی کے منقش شیفر پین اور سنہری کام والی چپلیں پسند کرتا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ میں مصروف رہتا تھا اور صفیہ کو بیوی کے علاوہ حقیقی معنوں میں اپنی رفیقِ حیات اور بہترین دوست و راز داں سمجھتا تھا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب منٹو کے دوست تھے اور دونوں میں خاصے قریبی مراسم تھے۔ اس کا ایک ثبوت وہ درجنوں خطوط ہیں جو دونوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے یہ بات خود مجھے سنائی اور کئی جگہوں پر مختلف انداز میں لکھی بھی کہ منٹو کی بسیار نوشی سے دل گرفتہ ہو کر وہ جہاں منٹو کو اس سے روکتے، وہیں صفیہ سے دلی ہم دردی رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ صفیہ سے اس بارے میں بات کر رہے تھے کہ وہ منٹو کو روکیں تو منٹو وہاں آ گیا اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا کہ بہن بھائی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ اُس نے اصل بات سنی تو غصے میں آ گیا اور بولا "احمد ندیم قاسمی تمھیں میرے ضمیر کی مسجد کی امامت کا حق کس نے دیا ہے؟" یہ سن کر قاسمی صاحب خاموش ہو گئے اور صفیہ نے افسردگی سے نظریں چرا لیں۔

احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنا ایک افسانہ منٹو کو اصلاح کے لیے بھیجا۔ منٹو نے اسے تین چوتھائی کاٹ دیا اور افسانہ راجندر سنگھ بیدی کو بھیج دیا۔ بیدی ایک پرچے کے مدیر تھے۔ بیدی نے قاسمی سے معلوم کیا کہ آیا منٹو کا تصحیح شدہ، کٹا ہوا افسانہ شائع کر دیا جائے یا انھیں لوٹا دیا جائے۔ اس پر قاسمی نے جواب لکھا "بالکل اسی طرح شائع کر دیا جائے جیسا منٹو صاحب نے مناسب سمجھا ہے۔"

رومانی شیفتگی کا معاملہ نتھرے مزاج اور تعلق میں بے ریا معصومیت کی جھلک اُسی طرح دکھا جاتا ہے جس طرح کشمیر کی ایک چرواہی کی کہنی۔

بیماری اور منٹو نے بیاہ رچا رکھا تھا۔ اوائل عمر سے منٹو کو کوئی نہ کوئی مرض لاحق رہتا تھا۔ ایک مرتبہ علاج کے لیے منٹو کو کشمیر کے پرفضا مقام پر سینی ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔ پس وہ وہاں سے نکل کر چہل قدمی کرتا ہوا بادلوں میں ڈوبی، سبزے کی مہک سے لدی پہاڑیوں اور مشامِ جاں کو تازگی بخشتی ہوا سے لطف اندوز ہوتا ایک گھاس کے قطعے پر کمبل لیے جا لیٹتا اور کانچ کے نیلے آسمان پر تیرتی روئی کی سی نرم و گداز بدلیاں تکا کرتا۔ وہیں ایک چرواہی بھیڑ بکریاں چراتی آ جاتی۔ وہ مویشی ہانکنے کے لیے لکڑی اٹھاتی تو اس کی سفید، مرمریں کہنی دکھائی دی جاتی۔ منٹو کا معمول بن گیا کہ وہ روز دم سادھے اُس لمحے کا انتظار کرتا تھا جب

وہ الھڑ دل کش چرواہی مویشی چرانے وہاں آئے اور منٹو اسے اور اس کی کہنی دیکھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ہوتی تھی۔ اُسے بھی منٹو کی دل چسپی کا احساس ہو گیا۔ وہ منٹو کی موجودگی میں جھجک سی اٹھتی۔ ایک روز منٹو کمبل پر لیٹا تھا کہ وہ اس سے کچھ فاصلے پر آ کر بیٹھ گئی اور اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ منٹو نے شرمیلی مسکراہٹ سے اُسے وہ چیز دکھانے کا کہا جسے وہ مٹھی میں چھپا رہی تھی تو شرم سے اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ وہ کچھ نہ بولی، البتہ حیا سے ہچکچانے لگی۔ منٹو کو ضد ہو گئی۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ جب تک وہ مٹھی نہ کھولے گی، وہ اسے جانے نہ دے گا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ خاصے اصرار کے بعد جب اُس نے ہتھیلی کھولی تو شرم سے گھٹنوں میں منہ دے دیا۔

اُس کی گلابی ہتھیلی پر مصری کی ڈلی برف کے ٹکڑے کی طرح جھلملا رہی تھی۔

منٹو دیکھتا رہ گیا۔

منٹو ابھی سوچ ہی میں گم تھا کہ وہ لڑکی اُٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور جا کر وہ پلٹ آئی اور مصری کی ڈلی منٹو کی گود میں ڈال کر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی وہاں سے چلی گئی۔ وہ اُس لڑکی کا اظہار التفات تھا جو منٹو کے دل کو چھو گیا۔

عصمت چغتائی راوی ہیں کہ جب منٹو نے اُنھیں اپنی محبت کی یہ سادہ سی داستان سنائی تو وہ باقاعدہ شرما گیا تھا۔

کوٹھے کی طوائفوں، بازارِ حسن کے دلالوں اور مشروباتِ خُمر پر بے دھڑک لکھنے والا سادہ دل پہلوان ہوا کے جھونکے کے ہاتھوں چت ہو گیا۔

منٹو کی زندگی میں سب سے اہم کردار باری علیگ کا تھا جن کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ اگر وہ اسے نہ ملتے تو شاید وہ ادیب نہ بنتا، مجرم بن جاتا۔

باری علیگ کون تھے اور منٹو سے ان کا کیا سمبندھ تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے عمر رفتہ کو آواز دینا ہوگی۔

منٹو کی شخصیت اور فن پر جتنا کام ہوا، شاید ہی کسی اور اُردو نثر نگار پر ہوا ہو۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا منٹو کی شخصیت پر قابلِ رشک دقیع کام ہو جس سے خاصا استفادہ کیا گیا، ثقہ نقاد، محقق اور ادیب مبین مرزا ہوں، اس پر مضامین اور خاکوں کو جاں فشانی سے مرتب و مدون کرنے والے احمد سلیم، مختصر مدت کے ہم راہی ابوالحسن نغمی، رازداں و ہم مشرب محمد اسد اللہ، امجد طفیل اور دیگر ہوں یا ممتاز ناقدین محمد حسن عسکری، مظفر علی سیّد، ممتاز شیریں، وارث علوی، جگ دیش چند رودھاون ہوں، یا اپنی محفلوں میں اس کا تذکرہ کرنے والے منٹو کے قریبی دوست احمد ندیم قاسمی ہوں جنھوں نے راقم کو اس سے متعلق بہت سے واقعات سنائے اور

تجزیے کیے، سبھی اُس راندۂ درگاہ، مجموعۂ اضداد اور بے مثل صنم گر کے اسیر نظر آئے۔ اس کی بادہ نوشی کا تذکرہ اس کے سوانح نگاروں نے بے پناہ کیا۔ بادہ کشی میں بسیار نوشی اُس کے لیے لطف و عیاشی کا درجہ نہ رکھتی تھی بلکہ واقعتاً ایک بیماری تھی، ایک فرار تھا، غالبؔ کے الفاظ میں گونہ بے خودی کے اسباب میں سے تھی، جو آخرِ عمر میں ناقابلِ علاج ہوگئی تھی۔ عظیم ادیب دستووسکی کو مرگی کے دورے پڑتے تھے، بورخیس کی کم زور بینائی بعدازاں اندھے پن میں متشکل ہوئی، لارڈ بائرن کا پیر ٹیڑھا تھا اور ہمارے بہت سے تخلیق کار ہکلے پن سے لے کر نفسیاتی عوارض کے شکار رہے۔ ان کی معذوری اور بیماری کو ان کی شخصیت پر مسلط کر دینا قرینِ انصاف نہیں۔

11 مئی 1912 کو لدھیانا کے قریب سمرالا نامی قصبے کے ایک کشمیری پنجابی گھرانے میں پیدا ہونے والا سعادت حسن منٹو اپنے کشمیری النسل ہونے پر اتنا نازاں تھا کہ کشمیری پنڈت جواہر لعل نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں دونوں کے پنڈت اور کشمیری ہونے کو برتر ہونے کے مترادف اور خوب صورت ہونے کے ہم معنی گردانا۔ منٹو وکلا کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس کے والد مولوی غلام حسین وکیل اور محکمہ انصاف میں ملازم تھے، انھوں نے دو شادیاں کی تھیں، بارہ بچے تھے، دوسری بیوی سے ایک بیٹی اور سب سے چھوٹا بیٹا سعادت حسن منٹو تھا۔ منٹو کا بچپن امرت سر میں گزرا، والدہ نرم دل، والد سخت گیر، مذہبی رجحان والے روایتی آدمی تھے۔ اُس نے اپنے والد کے حوالے سے آغا حشر سے متعلق خاکے میں ایک واقعے کا ذکر کیا ہے۔ منٹو اور اس کے اسکول کے دوستوں نے مل کر ایک ڈراما کلب تشکیل دیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ والد کو پتا چلا تو وہ بپھرے ہوئے وہاں آئے اور طبلہ، ہارمونیم اور دیگر آلاتِ موسیقی کو توڑ پھوڑ دیا اور غضب ناک لہجے میں اُن سب پر واضح کر دیا کہ وہ اِن مشغلوں کو قطعی طور پر غلط اور وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔

مبین مرزا کی تحقیق کے مطابق ایک دوسری تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ اُس دور کی اشرافیہ کی مانند اپنے بیٹے کو عملی زندگی میں کام یاب دیکھنے کے متمنی ہونے کے باعث اُس کے والد عمومی چلن کے مطابق درشتی اختیار کر لیتے تھے۔ اُن کے دیگر بیٹے انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بیرسٹر اور ڈاکٹر بنے، وہ منٹو کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ منٹو نے والد کی سختی کا تذکرہ ضرور کیا مگر اس میں دکھ تو در آیا، نفرت کا شائبہ تک نہیں آیا۔ اُس نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے 'آتش پارے' کا انتساب بھی 'والد مرحوم' کے نام کیا اور امرت سر میں اپنے کمرے میں بھی والد کی تصویر لگا رکھی تھی۔

بچپن سے اسے معدے کا مسئلہ رہا، مزاج میں اضطراب حد درجے تھا، ٹائی فائڈ بھی ہوا اور طبیعت میں رنگِ آتش دیگر رنگوں سے بڑھ کر تھا۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے دس برس کی عمر میں اسے مسلم اسکول اور بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول امرت سر میں داخل کروایا گیا۔ وہ تین مرتبہ سائنسی مضامین کے ساتھ میٹرک میں فیل ہوا، مضامین تبدیل کر کے تیسرے درجے میں پاس ہوا۔ وہ دو مرتبہ اردو کے مضمون میں ناکام ہوا تھا۔

عموماً سب سے چھوٹا بچہ گھر بھر کا لاڈلا ہوتا ہے۔ منٹو کو لاڈ ملا تو اپنی ماں سے یا بڑی بہن ناصرہ سے جو عمر میں اس سے خاصی بڑی تھی۔ سوتیلے بھائیوں سے رسمی بلکہ لاتعلقی کا رشتہ رہا۔ بہت بعد میں بمبئی میں رام کھلاون دھوبی نے جب اُس کی کھولی میں بیرسٹر سعید حسن کی تصویر دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا کہ وہ اس کا چھوٹا بھائی ہے جو کولابے کے اعلیٰ فلیٹ میں رہتا تھا اور منٹو ایک خستہ کھولی میں تو منٹو بولا ''دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی! کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔''

لڑکپن میں وہ بلا کا شرارتی اور پُر تخیل تھا۔ وہ پیشہ ور شعبدے باز کے ساتھ بھرے مجمعے میں دہکتے انگاروں پر چلا، امریکا کے تاج محل کو خرید کر منتقل کرنے کی افواہ اڑائی، اپنے آپ کو مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد جان بی۔ اے، بی ٹی (علیگ) کا بیٹا ظاہر کر کے کتب فروشوں سے کتابیں اُدھار لیں اور کڑا جیمل سنگھ میں فضلو کمھار کی دکان کی بالائی منزل کی بیٹھک میں جوئے اور فلیش کی بازیوں میں اس اشتیاق سے شرکت کی کہ بہ قول اس کے اُسے رات کو خواب میں بھی بازیاں نظر آتی تھیں۔

اُس کی شوخی اور شرارت کی عادت آخری عمر تک نہ گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور قیام کے دوران اُسے ترقی پسند مصنّفین کے ایک اجلاس میں افسانہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اُس کا تحریر کردہ افسانہ دو صفحات کا تھا۔ اُس نے شرکا کو چھیڑنے کے لیے دونوں اوراق سادہ کاغذوں کے موٹے سے دستے پر رکھ لیے اور مال روڈ پر نقی بلڈنگ پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے دستہ دکھاتے ہوئے حاضرین سے کہا کہ اسے سب سے پہلے پڑھوایا جائے کیوں کہ اس کا افسانہ خاصا طویل ہے اور دو گھنٹے میں ختم ہوگا۔ یہ دیکھ سن کر سبھی پریشان ہو گئے۔ اجلاس میں ایک شاعر کو اپنی غزل اور مقالہ نگار کو مقالہ بھی پیش کرنا تھا۔

بہر حال صدرِ محفل نے کہا ''جی منٹو صاحب، ارشاد۔'' منٹو نے پانچ منٹ میں افسانہ ختم کر کے اسے تنقید کے لیے پیش کر دیا۔ سب ہکا بکا رہ گئے۔

میٹرک کے دور کی بات ہے کہ امرت سر کے ہوٹل شیراز میں چائے پیتے ہوئے اُس کی پہلی ملاقات باری علیگ سے ہوئی۔ وہ روزنامہ ''مساوات'' کے ایڈیٹر مقرر ہو کر امرت سر آئے تھے اور حاجی لق لق کے ہم راہ وہاں چائے پینے آتے تھے اور اس دور کی سیاست اور ادب پر گفت گو کرتے تھے۔ وہاں منٹو چند ایک مرتبہ گفت گو میں شریک ہوا اور اپنی ذہانت و حاضر جوابی کے باعث باری علیگ کے دل کو بھا گیا۔ دونوں میں خوب بن آئی۔ منٹو کا بیش تر وقت ''مساوات'' کے دفتر میں گزرنے لگا۔

ایک دل چسپ واقعہ ہے، جس کے نتیجے میں منٹو تحریر کی جانب مائل ہوا اور بعد ازاں اہم ادیب بنا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز وہ باری صاحب کو ملنے مساوات کے دفتر گیا۔ وہاں ایک فلم کا پاس پڑا ہوا تھا۔ منٹو نے ان سے فلم دیکھنے کا پوچھا تو انھوں نے پاس منٹو کو دے دیا اور ایک شرط رکھ دی۔ اُنھوں نے کہا کہ منٹو فلم دیکھنے کے بعد اس پر تاثرات لکھ کر دے گا جو مساوات کے فلمی گوشے میں شائع ہوں گے۔ اس نے ہامی بھر لی۔ اگلے روز اخبار میں اُس کی تحریر موجود تھی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ یوں اس نے اخبار میں فلمی خبروں کا کالم لکھنا شروع کر دیا۔ چند ہفتوں بعد باری صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ طبع زاد مضمون لکھنے شروع کر دے۔

باری صاحب اشترا کی نظریات سے متاثر اور ان کے پرچارک تھے۔ اُن کے شاگرد کا ان کے خیالات سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ ایک کم معروف حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دنوں میں منٹو اپنے نام کے ساتھ 'مفکر' اور 'کامریڈ' لکھا کرتا تھا۔ اسی دوران اس نے وکٹر ہیوگو کے ناول کا ترجمہ ''سرگزشتِ اسیر'' کے عنوان سے کر کے باری صاحب کو دکھایا۔ باری صاحب نے اس ترجمے کی اصلاح کر کے منٹو کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ترجمہ تیس روپے میں فروخت ہو کر جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہو گیا۔ منٹو اس کم عمری میں ایک ترجمے کی بہ دولت صاحبِ کتاب ہو گیا اور خوب اِترانے لگا۔

اس نے مسلسل یورپی اور روسی ادب کے تراجم کرنے شروع کر دیے۔ اس بہ دولت اس کا نام چلنے لگا۔ بعد ازاں اس نے ''عالم گیر'' اور ''ہمایوں'' ایسے موقر رسالوں کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر مرتب کیے۔ اس وقت منٹو بائیس تیئیس برس کا تھا۔ باری علیگ کے مشورے پر منٹو نے ابو سعید قریشی اور خواجہ حسن عباس سے مل کر آسکر وائلڈ کے ڈرامے ''ویرا'' کا ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کی اصلاح اور درستی مشہور و معروف رومانی شاعر اختر شیرانی نے کی۔ یوں اسے ابتدائی راہ نمائی باری علیگ اور اختر شیرانی جیسے اہم لوگوں سے ملی۔

'ویرا' اشترا کی اور انقلابی نوعیت کا ڈراما تھا سو سرمایہ دارانہ نظام کی محافظ پولیس کی نظروں میں آ گیا، باری صاحب روپوش ہو گئے، منٹو کے بہنوئی اُس کے لیے مسیحا بن کر آئے اور اُس کی جاں خلاصی کروائی۔ چند روز سکوت رہا۔

یکا یک باری صاحب صحافتی و ادبی منظر پر نمودار ہوئے اور ایک منصوبہ ساتھ لے کر آئے۔ یہ منصوبہ تھا ہفت روزہ پرچے ''خلق'' کا۔ اس پرچے میں جلیانوالا باغ کے سانحے پر منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ شائع ہوا۔ افسانے کا نام 'تماشا' تھا اور یہ بات ہے اگست 1934 کی۔ یہ افسانہ منٹو نے فرضی نام سے لکھا تھا۔ تب اشترا کی بھی ''انتہا پسند'' ہوتے تھے اور جان پر کھیل کر نظریاتی مضامین تحریر کیا کرتے تھے۔ اشترا کیت میں اِک رومان تھا، اُمید تھی، سچائی اور آفاقیت نظر آتی تھی۔ اقبال نے مارکس کو ''نیست پیغمبر

ولیکن در بغل دارد کتاب'' (پیغمبر نہیں پر بغل میں کتاب لیے) اور اولاً دِ ابراہیم قرار دیا۔ابراہیم ذوق کے مصرع ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کے مصداق باری نے ایک مضمون ''ہیگل سے کارل مارکس تک'' کے عنوان سے لکھا، معتوب ہوئے اور ''خلق'' کے دوسرے شمارے کی اشاعت کے بعد دوبارہ روپوش ہو گئے۔

منٹو نے تعلیم کی رکی ہوئی ریل کو اگلے اسٹیشن تک لے جانے کی ٹھانی۔وہ ہندو سبھا کالج اور ایم اے او کالج امرت سر سے ایف اے کے امتحان میں بالترتیب دو مرتبہ بیٹھ کرنا کام ہو چکا تھا۔چناں چہ اس نے ریل کی پٹڑی بدلی اور علی گڑھ یونی ورسٹی کا رخ کیا۔آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے 'رستم وسہراب' کے ڈائلاگ ''شیر لوہے کے جال میں ہے'' کے مانند آزاد روا اور خود مگن منٹو کے لیے وہاں کے سخت قوانین اور آہنی قاعدے دیگر عوامل کے علاوہ بلائے جان ثابت ہوئے۔اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ایک روز سینے میں درد اُٹھا، ڈاکٹروں کے مشورے سے ایکس رے کیا گیا، پھیپھڑوں پر داغ کی وجہ سے تپ دق تشخیص ہوئی، بہ غرضِ علاج امرت سر واپسی ہوئی، صحت یابی کے لیے صحت افزا مقام بٹوت، کشمیر تجویز ہوا اور بڑی ہمشیرہ ناصرہ اقبال کی مالی معاونت سے روانگی ہوئی۔کشمیر ہی میں وہ ایک چرواہی سے تعلق خاطر میں مبتلا ہوا۔

یہاں چار قابل ذکر باتیں ہیں۔

منٹو عمدہ لباس، ذائقہ دار پکوان، نفیس لوازمات اور جان دار تحریر کے علاوہ زود اثر طبی ادویات پر خاصی معلومات رکھتا تھا۔ازلی بیمار تھا۔قیامِ پاکستان کے بعد کا واقعہ ہے۔اس کا دوست اسداللہ کسی مرض میں مبتلا تھا اور ڈاکٹر نذیر کو دکھا کر منٹو کے ہاں پہنچا۔منٹو نے پوچھا ''کہاں سے آرہے ہو؟'' اسداللہ نے بتایا ''ڈاکٹر نذیر کے پاس میو اسپتال سے۔'' اس پر بولا ''آیندہ جو بھی مسئلہ ہو مجھے بتا دیا کرو۔میں برسوں سے بیمار ہوں، ساری بیماریوں سے واقف ہوں اور ان کا علاج بھی جانتا ہوں۔میرے ہوتے ہوئے تمھیں ڈاکٹر کے ہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

رسمی تعلیم میں کمی کا احساس منٹو میں فزوں تر تھا۔شواہد کے مطابق علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو چھوڑنے کی دو بنیادی وجوہات خرابیٔ صحت اور مالی دشواریاں تھیں۔اس کے والد کی وفات فروری 1932 میں ہو چکی تھی، گھر کی کفالت سوتیلے بھائیوں کی معمولی مالی معاونت سے ہو رہی تھی، والد کی وفات کو تین برس گزر چکے تھے۔علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلے کے وقت اس کی عمر فقط تئیس برس تھی پر اپنے تراجم اور چند دیگر ادبی کاموں کی وجہ سے وہ اتنی اہمیت ضرور حاصل کر چکا تھا کہ وہاں کے اساتذہ جن میں اردو ادب کے اہم ادیب رشید احمد صدیقی شامل تھے، اس سے خاص شفقت سے پیش آتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ منٹو کا بہ قول خود، قریبی دوست اسداللہ ایک واقف کار ارشد کے ساتھ اُس

سے ملنے گیا۔ منٹو اور ارشد ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ تب ہجرت کے بعد منٹو لاہور میں قیام پذیر تھا۔ گفت گو کرتے ہوئے منٹو نے ارشد سے استفسار کیا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ارشد نے بتایا کہ وہ ایف سی کالج سے ایف ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ سن کر منٹو نے حسرت سے کہا "تم نے ایف ایس سی پاس کر لیا ہے، تین چار برس میں ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ مجھے دیکھو میں کیا ہوں، کچھ بھی نہیں، ایف اے فیل۔"

ارشد نے محبت اور عزت سے کہا "اگر میرے جیسے دس ہزار بھی روز امتحانات پاس کر لیں تو اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ آپ فن کار ہیں۔ فن کار بی اے، ایم اے نہیں ہوتا۔ فن کار فن کار ہوتا ہے۔"

منٹو نے جواب دیا "نہیں، فن کار وں کار کیا ہوں، کچھ بھی نہیں۔ اگر میں ایم اے ہی ہوتا تو کسی کالج میں لیکچرار لگ جاتا۔ پروفیسر ہو جاتا۔"

اس کے بعد منٹو نے اپنا حسب نسب بیان کرنا شروع کیا۔

اپنے بھائیوں جو بیرسٹر تھے، بھانجے سعد اللہ پی ایچ ڈی اور دیگر ایسے رشتے داروں کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور قابل رشک معاشرتی مقامات پر تھے۔ گویا منٹو میں باقاعدہ رسمی معاشرتی مقام اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک خاص عزت موجود تھی۔

قصہ مختصر، کشمیر میں تین ماہ نے منٹو کی صحت پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے۔ اس میں جہاں اس جنتِ ارضی کی حسین وادیوں اور دمکتے چشموں کا کردار تھا وہاں منٹو کی اپنے آبا کی سرزمین سے جذباتی لگاؤ بھی اہم عنصر تھا۔ وہ پنڈت نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے والد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وہ جب کسی ہاتو کو دیکھتے تو اسے گھر لے آتے۔ ڈیوڑھی میں بٹھا کر نمکین چائے پلاتے، ساتھ کلچا بھی ہوتا۔ وہ بڑے فخر سے اس ہاتو سے کہتے "میں بھی کاشر ہوں۔"

یہی عادت منٹو میں بھی ورثے میں منتقل ہوئی۔ جب وہ کسی کشمیری کو دیکھتا تو بے اختیار ہو کر اپنائیت سے اسے ملتا اور فوراً گھل مل جاتا۔

بعدازاں منٹو نے کشمیر کی خاک سے بہت مورتیں تراشیں جن میں قابلِ ذکر "مصری کی ڈلی"، "موسم کی شرارت" اور "بیگو" وغیرہ ہیں۔

معاشی آزمائش بڑے بڑے قارونوں کا سرنگوں کر دیتی ہے۔

کشمیر میں چند ماہ گزار کر امرت سر لوٹا تو ایک بے روزگار، ہنوز ابھرتا ہوا ادیب تھا۔ مرحوم والد کی جمع پونجی بہن کی شادی پر خرچ ہو چکی تھی، بھائیوں کی جانب سے ملنے والے کفالت کے چالیس روپے بہ قدرِ اشکِ بلبل تھے اور ملازمت کا کوئی سرا ہاتھ آتا نظر نہ آتا تھا۔

ناگاہ، مضطرب منٹو نے باری علیگ سے رابطہ کیا، ابتدائی طور پر اُدھر سے گرم جوشی کا خاص مظاہرہ نہ ہوا، بعدازاں انھی کی مدد سے لاہور کے ایک ڈولتے اخبار ''پارس'' میں ملازمت کا سلسلہ بن گیا۔ پارس فقط نام کا پارس تھا، درحقیقت ایک بددعا کی طرح تھا، جدھر جاتا تھا خاک کردیتا تھا۔ وہ کردارکشی پر پلتا تھا اور سنسنی خیز بلیک میلنگ سے توانائی پاتا تھا۔ چناں چہ جلد ہی اس کا سفینہ غرقاب ہوا اور اپنے مالک کرم چند کو بھی لے ڈوبا۔

منٹو کا حلقۂ احباب لاہور اور امرت سر میں تھا، پر جب اُسے بمبئی سے جاری ہونے والا ہفتہ وار 'مصور' کے مالک نذیر لدھیانوی کی جانب سے ملازمت کی دعوت آئی تو انکار نہ کرسکا۔ اس کی تن خواہ چالیس روپے تھی۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ کوئی بیوی ازدواجی مسرت کے ہم راہ خوش حالی لے کر آتی ہے اور کسی اولاد کی پیدائش خوش قسمتی کے دروازے کھول دیتی ہے اسی طرح ایک شخص کی زندگی کو ایک شہر بدل دیتا ہے۔ آدمی وہی ہوتا ہے، صلاحیتیں بھی وہی اور مزاج بھی یکساں، پر تبدیلیٔ مقام نصیب بدل دیتی ہے۔

بمبئی کا منٹو کی زندگی میں ایسا ہی کردار تھا۔ نذیر صاحب ایک ہم درد اور دانش مند آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک پردیسی کا اس تن خواہ میں گزارا نہیں ہوگا۔ چناں چہ انھوں نے اُسے امپیریل فلم کمپنی میں جزوی ملازمت دلوادی۔

یہ وہ کمپنی تھی جس نے ہندوستان میں پہلی بولنے والی فلم بنائی اور پہلی رنگین فلم کا منصوبہ بھی بنا رکھا تھا۔ سو یہ انکشاف انگیز حقیقت ہے کہ منٹو نے ہندوستان کی پہلی رنگین فلم کی کہانی لکھی۔ اس وقت تک منٹو فلمی دنیا میں نو وارد تھا اور ادبی لحاظ سے بھی قابلِ رشک مقام حاصل نہ کر پایا تھا۔ چناں چہ کہانی کار کے طور پر شانتی نکتین میں فارسی کے پروفیسر ضیا الدین کا نام استعمال میں لایا گیا۔ فلم کا نام کشن کنھیا تھا اور کمپنی کے مالک کا نام سیٹھ آردشیر تھا (بعدازاں تاریخی حوالہ جات کے لیے کہانی کار کا نام سعادت حسن منٹو کردیا گیا۔ ع۔ ج)

فلم بری طرح ناکام ہوگئی اور امپیریل کمپنی کے مالی حالات دگرگوں ہوگئے۔ نذیر لدھیانوی دوبارہ میدان میں اترے اور منٹو کو فلم سٹی میں اڑھائی گنا معاوضے پر ملازمت دلوادی۔ امپیریل کمپنی کے مالک سیٹھ آدشیر کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے امپیریل کمپنی کو مجبور کیا اور منٹو کو واپس آنا پڑا۔ البتہ اس کی تن خواہ دگنی کردی گئی۔ دگنی تن خواہ کے باوجود منٹو مالی تنگ دستی میں زندگی گزار رہا تھا۔

وہ ایک خستہ کھولی میں رہنے پر مجبور تھا، کھولی میں کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی، پرانا روغن جھڑتا رہتا اور ناگوار باس نوجوان ادیب کا محاصرہ کیے رہتی۔

اسی دوران رجحان ساز فلمی ادارہ 'بومبے ٹاکیز' وجود میں آیا۔ بعدازاں اس میں تین ایسے افراد

ملازم ہوئے جنھوں نے ہندوستانی (اور اس کے زیر اثر بعد ازاں پاکستانی) فلمی دنیا میں اہم ترین کردار ادا کرنا تھا۔ پہلا فرد ایک لیبارٹری اسسٹنٹ تھا جو بعد ازاں رجحان ساز اداکار ثابت ہوا۔ اس کا نام تھا اشوک کمار۔

دوسرا فرد ایک نوجوان لڑکا تھا جسے بہ طور اداکار مستقل بنیادوں پر ملازم رکھا گیا تھا۔ وہ لڑکا بعد کی فلمی دنیا کا اہم ستون ثابت ہوا۔ اس کا نام تھا دلیپ کمار (محمد یوسف خان)۔ تیسرے فرد کو ایک تالی بجانے والے معمولی معاون کے طور پر بھرتی کیا گیا۔ اس فرد کی بھی پردۂ سیمیں پر حکمرانی رہی ہے۔ اس کا نام تھا راج کپور۔

1921 کو ہونے والی مردم شماری کے مطابق بمبئی میں چوراسی فی صد لوگ اِرد گرد کے قصبات، دیہات اور نواح سے کام کرنے آتے تھے۔ ابتدائی طور پر یہ لوگ اس ارادے سے بمبئی آتے تھے کہ چند پیسے کما کر معاشی استحکام حاصل کریں گے اور اپنے آبائی علاقوں کو لوٹ جائیں گے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ اپنے اہل خانہ کو بھی شہر بلانے لگے۔ مختلف علاقوں کے لوگوں نے بمبئی کے مختلف حصوں میں اپنی بستیاں آباد کر لیں۔ جہاں ان بستیوں کا باہم ملاپ ہوتا تھا وہاں نئی ثقافت وجود میں آرہی تھی۔ اس نے برصغیر کے فلمی مرکز کو ایک نئے رنگ اور نئی زبان سے آشنا کرنا تھا۔ اسے بمبئی کی مخصوص زندگی اور زبان بننا تھا۔ اگر اُس پھلے دھڑکتے ہوئے شہر کو بلندی سے دیکھا جاتا تو وہ ایک ایسے کھیس کی طرح تھا جسے مختلف رنگوں اور نمونہ جات کی ٹکڑیوں سے سی کر بنایا گیا تھا۔ اگر بلندی سے دیکھا جاتا تو ایک نچلے متوسط طبقے کی ایک نو روپے ماہانہ کی کھولی میں، جس میں کھٹملوں کی برسات جاری رہتی تھی، ایک خوش شکل بڑی آنکھوں گول چشمے اور اکہرے بدن والا لڑکا سر جھکائے لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ وہ سعادت حسن منٹو تھا۔

صنعتی انقلاب کے اثرات ہندوستان میں داخل ہو چکے تھے۔ کپڑے کی کئی ملیں شہر میں اُگ آئی تھیں۔ ان ملوں نے اپنے ملازمین کے لیے تنگ اور گتھی ہوئی بیرکوں، فلیٹوں اور کوارٹروں پر مشتمل، رہایشی حصاروں میں چال بنا رکھی تھیں۔ چاوَل، چاولی یا چال فلمی اور غیر فلمی زبانوں میں معروف چلا آرہا تھا۔

منٹو کو ایک بہ یک وقت صنعتی اور ثقافتی شہر کا براہ راست مشاہدہ کرنے کا موقع تب ملا جب وہ ذہنی بلوغت کی منازل طے کر رہا تھا، اس کا ذہن کچی مٹی کی طرح نرم تھا اور اس پر جو بھی نقش ہوتا، سوچ اور شخصیت کے پکنے پر دیرپا ہوتا۔ انھی چاولیوں میں پہلی مرتبہ دو کرداروں نے ایسے حقیقی زندگی میں نمو پائی کہ وہ وہاں کی زندگی اور فلموں میں امر ہو گئے۔ ایک کردار تھا طوائف کا اور دوسرا موالی، غنڈے کا۔ زندگی گلیوں، محلوں اور سڑکوں پر اشرفیاں اچھال رہی تھی، غریب خلقت براتی بچوں کی طرح ان کے پیچھے لپک رہی تھی۔ ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی، ہاہا کار جاری تھا اور بے نشاں سڑک چھاپ مجسم پرتاپ کا روپ دھار رہے تھے۔

منٹو امرت سر، کشمیر، لاہور کی جانی پہچانی فضا کے تحفظ سے نکل کر ایک اَن جانی دنیا میں آیا تھا اور بائسکوپ سے آنکھ لگائے عجب دنیا کا نظارہ نہیں کر رہا تھا بلکہ حقیقی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ اس میں دلال،

طوائف، بدمعاش اور سیٹھ کے کردار واضح تھے۔ خاکستری اور سرمئی حصے کم کم تھے۔ اچھائی اور بدی کے خطوط واضح تھے اور روزمرہ کی مارا ماری میں منفی کرداروں کا پلڑا بھاری تھا۔

ان سب میں ایک کردار دیوی کا تھا، نور کا تھا، سراپا محبت و راحت کا تھا۔ وہ کردار تھا منٹو کی ماں کا۔

سات جزیروں پر مشتمل بمبئی، امرت سر سے بالکل مختلف تھا۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک بین الثقافتی شہر تھا جس پر پرتگیزی اور بعد ازاں برطانوی قبضے کے باوجود مراٹھی رنگ نمایاں تھا۔ وکٹورین طرزِ تعمیر کی پرشکوہ عمارات کے بیچ ٹرامیں چلتی تھیں، سمندر کنارے ناریل کا پانی بیچنے والے، تیل چمپی کرنے والے، ساڑھیاں، شلوار قمیص، اسکرٹ اور پتلونیں پہننے والی لڑکی بالیاں، عورتیں اور کوٹ پینٹ پہنے مرد، دھوتی، اچکن، شیروانی اور مختلف علاقائی ملبوسات زیبِ تن کیے مردوں کے بیچ چلتے تھے۔ نمکین سمندری ہوا کے بیچ پارسی، ہندو، سکھ، مسلمان، کرسچن، اینگلو انڈین اور یہودی زندگی بسر کرتے تھے۔ کھپریل کے ترچھی چھتوں، تین اطراف سے کھلے ورانڈوں والے خال خال مکانوں کے بیچ کھولیاں اور فلیٹ لوگوں سے بھنبھناتے رہتے۔ گرم دوسے سے لے کر پوری پانی اور سبزی بھات تھالی سے لے کر دال چاول سڑک کنارے ٹھیلوں پر بکتے۔ کسی کو کسی اور کی زندگی سے غرض نہ تھی۔

ایسے میں ٹھہرے ماحول اور یک رنگی ثقافت والے امرت سر سے منٹو کی ماں بمبئی سے آ کر بیٹی اور داماد کے ہاں ٹھہری۔ داماد نے بے اعتدالیوں کی وجہ سے منٹو کا داخلہ گھر میں ممنوع قرار دے رکھا تھا، پر ماں تو ماں ہوتی ہے۔ سو ماں نے اپنے بیٹے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، منٹو بہنوئی کے فلیٹ تک آیا، ماں نیچے اُتر کر باہر آ کر ملی اور ماں بیٹے کے بے قرار دلوں کو کچھ قرار آیا۔

اگلی مرتبہ ماں اکلوتے بیٹے کو ملنے اُس کی خستہ کھولی میں پہنچی تو دُکھی ہوگئی۔ کھولی میں کھانا بازار سے آتا تھا اور رہائش کا انتظام افسردہ کر دینے والا تھا۔ سادہ دل ماں کو ان مسائل کا ایک ہی حل نظر آیا، شادی۔ اس کا خیال تھا کہ بہو کے آنے سے گھر میں سلیقہ اور بیٹے کی زندگی میں ترتیب آ جائے گی۔ اس کے اصرار پر منٹو بیاہ کے لیے تیار تو ہوگیا مگر اُسے اپنی بے یقینی معاشی صورتِ حال اور غیر مستحکم معاشرتی مقام کے بہ موجب مناسب رشتہ ملنے کی توقع نہ تھی۔ اُسے حیرت ہوئی جب ایک شریف متوسط کشمیری خاندان نے معاملات آگے بڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ خاندان حال ہی میں افریقہ سے بمبئی آ کر آباد ہوا تھا، لڑکی کا والد وہاں پولیس کے محکمے میں ملازم تھا اور وفات پا چکا تھا، کفالت اب ایک بھائی کے ذمے تھی۔ منٹو کی ماں نے گھر کے حالات اور بیٹے کی افتادِ طبع ان لوگوں کے سامنے بلا کم و کاست لپٹی رکھ دی۔

اُن لوگوں کو سچائی کی یہ ادا بھا گئی۔ منٹو تک یہ خبر پہنچی تو اسے تشویش ہوئی۔ وہ تو اس معاملے کو غیر سنجیدگی سے لے رہا تھا۔ ابھی اُس کی ترپ میں ایک پتا موجود تھا۔

جب اُس کی ملاقات لڑکی کے چچا سے ہوئی تو اس نے دھڑلے سے نہ صرف اپنی معاشی بدحالی کا اعتراف کیا بلکہ ستے پہ ستا بھی کھیلا، اُس نے اعتراف کیا کہ ان حالات کے باوجود وہ ہر شام جرعے میں گھول کر پیتا ہے۔

اس انکشاف واعتراف کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ حیرت تو اُسے تب ہوئی جب لڑکی والوں نے انھیں دعوت پر بلایا۔ وہ تذبذب میں وہاں پہنچے تو انھوں نے منٹو کی والدہ کو رشتے کی قبولیت کی خبر دے دی۔ اب منٹو کے پاس کوئی چارا نہ تھا۔ چناں چہ نکاح کی تقریب ہوئی اور اس کے ایک برس بعد رخصتی عمل میں آئی۔

شادی کی تقریب سادگی سے ہوئی، بہن ناصرہ اقبال شوہر کی ممانعت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکی، سوسرال جاتے ہوئے گاڑی بہن کے گھر کے باہر رُکی، بہن نے بھائی کے سر پر ہاتھ رکھا، اُسے دعائیں دیں اور یوں وہ دلہن کے گھر روانہ ہوا۔

دلہن کے گھر آنے سے ماحول میں ٹھہراؤ اور زندگی میں قدرے توازن آ گیا۔ وہ ایک ہمدرد اور ذمہ دار شوہر کے طور پر سامنے آیا۔ گو ذرائع معاش محدود تھے، پر وہ کسی نہ کسی طرح چادر کو دیکھ کر پیر پھیلانے کے قابل تھے۔ شادی کے سال بعد بیٹا پیدا ہوا، اُس کا نام عارف رکھا گیا، والدہ علیل ہوئیں اور شادی کے دوسرے برس وہ فوت ہو گئیں۔ ایک جانب قلیل آمدنی، دوسری جانب ماں کی موت، اس پر مستزاد گھریلو ذمّے داری۔ یہ منٹو کے لیے اندوہ ناک زمانہ تھا۔

بمبئی میں حالات اُس کے موافق نظر نہ آ رہے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آل انڈیا ریڈیو دِلّی میں ملازمت کے مواقع نکلے تو اس نے بھی درخواست بھیج دی۔ وہاں سے اُسے پروانہ ملازمت مل گیا۔

1941 کے پہلے دن، یکم جنوری کو اُس نے ریڈیو میں بہ طور فیچر نگار اور ڈراما رائٹر ملازمت کا آغاز کیا۔ اُن دنوں ریڈیو نامی گرامی تخلیق کاروں کی آماج گاہ تھا۔ کرشن چندر، رفیع پیر، ن۔ م راشد، بہزاد لکھنوی، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ اس سے وابستہ تھے۔ منٹو نے کرشن چندر کے گھر پر قیام کیا۔ تب تک اُسے بہ طور ادیب ایک نمایاں پہچان مل چکی تھی۔ مزید یہ کہ یہ اس کا سب سے بارآور دَور تھا۔ اُس کے رواں قلم نے اُس کے بہترین تخلیقی فن پاروں کو وہیں جنم دیا۔

ایک جانب وہ شاہ کار تحریریں تخلیق کر رہا تھا، دوسری جانب ایک آزمایش اُس کی منتظر تھی۔ اُس آزمایش کا نام تھا 'اوپندر ناتھ اشک'۔ اشک نے منٹو کے مستقبل میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ دونوں متضاد مزاج کے مالک تھے۔ منٹو رندِ خرابات، اشک پانی کا حیوانِ ناطق، یہ بازارِ حسن کا راہ گیر، اشک زنانِ بازاری سے گریزاں، یہ تاش کا رسیا، اشک اس سے ناآشنا۔ بہ قول اشک کے، اُس کے والد نے تین نسلوں کی شراب اکٹھی ہی پی لی تھی۔ یہ بھی عجب معاملہ ہے کہ بہت سے شرابیوں کے ہاں صالحین اور صالحین کے ہاں شرابی

جنم لیتے ہیں۔ اشک کا کہنا تھا کہ ابتدائے تعلق ہی سے ان میں مغائرت دَر آئی تھی۔ اشک کے مطابق منٹو نے ابتدائی دنوں میں کہا تھا "جب اشک مرے گا تو اس کی کپال کریا (مردے کی کھوپڑی توڑنے کی رسم) میں کروں گا۔" دراصل اشک نے دلی ریڈیو میں ملازمت سے قبل ہی منٹو کے افسانے 'خوشیا' کے بارے میں راجندر سنگھ بیدی کو کہا تھا کہ یہ ایک غیر حقیقی کردار کا افسانہ ہے۔ یہ بات منٹو تک پہنچ گئی تھی اور اسے بُری محسوس ہوئی تھی۔

اشک افسانے کے میدان میں منٹو سے پہلے آیا تھا اور منٹو کو اُس کے ابتدائی زمانے میں مترجم ہونے کے سبب کم تر سمجھتا تھا۔

دِلّی ریڈیو میں ان میں چپقلش بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اشک اپنی میز اُٹھا کر دوسری منزل پر لے گیا۔ البتہ وہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ ان دنوں منٹو کرشن چندر سے پوچھتا تھا "بولو، کس موضوع پر ڈراما لکھا جائے؟" اور شام تک مسودہ ٹائپ کر کے اُسے دے دیا کرتا تھا۔

یوں نظر آتا ہے جیسے منٹو کے اندر ایک ٹکسال تھا جس میں سے ڈھلے ڈھلائے افسانے، ڈرامے کھٹا کھٹ نکلتے چلے آتے تھے۔

اشک منٹو کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ ایسے میں کرشن چندر ہمیشہ منٹو کا ساتھ دیتا تھا۔ اشک کے والد کے دو فلسفے 'کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے' اور 'سر قائم جنگ دائم' تھے۔ اشک نے پہلے فلسفے پر تو عمل نہ کیا بلکہ حد درجہ کنجوسی اختیار کی، دوسرے فلسفے پر ضرور عمل پیرا ہوا اور کش مکش حیات کے ہر معرکے کو آخری معرکہ سمجھ کر لڑا۔ اُس کی کنجوسی کے حوالے سے طنزاً منٹو نے ایک قصہ گھڑ رکھا تھا کہ اشک صبح سویرے اپنی بلی کو محلے میں روانہ کر دیا کرتا تھا۔ وہ بلی ہم سایوں کے دودھ کے برتنوں سے دودھ پی کر لوٹ آتی تھی۔ اشک بلی کو اُلٹا کر کے، اُس کا پیٹ دبا کر، اُس کا پیا ہوا دودھ نکال لیتا تھا اور صبح کی چائے بنا لیا کرتا تھا۔

اسی طرح منٹو نے ایک چٹکلا تراشا ہوا تھا۔ اشک کرائے کے تانگے پر دِلّی ریڈیو آیا کرتا تھا۔ دِلّی کے تانگے والے اسے پہچانتے تھے۔ اشک کو ہر کسی کو اپنا افسانہ سنانے کا شوق تھا۔ چناں چہ جب یہ کسی تانگے والے سے کرائے کا پوچھتا تو وہ بولتا "صاحب، اگر آپ راستے میں مجھے اپنا کوئی افسانہ سنائیں گے تو کرایہ ایک روپیا ورنہ آٹھ آنے۔"

منٹو چوں کہ بھی لڑنے والا بے ضرر فن کار تھا۔ ریڈیو میں ایک مرتبہ اُس نے ن۔ م راشد کی شاعری کی نادر تشبیہات کا مزاحیہ انداز میں تذکرہ کیا۔ راشد کو یہ حرکت ناگوار گزری۔ چند روز بعد منٹو نے ایک ڈراما ٹائپ کیا اور راشد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ منٹو نے رائے مانگی "کیسا ہے؟"

راشد نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔"

شومئی بخت، راشد کی ترقی بہ طور پروگرام ڈائریکٹر ہوگئی۔ اب یک نہ شد دوشد والا معاملہ ہوگیا۔ راشد نے آتے ہی کرشن کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا۔ اس کی جگہ ایک احمق قسم کا خوشامد پسند شخص پروگرام اسسٹنٹ بن کر آیا۔ اشک نے اُسے مٹھی میں کرلیا اور اس کے الفاظ میں۔

''میں اُن دنوں تیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوش نما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اُس لکھنوی احمق کو رج پر لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگا تار اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ کس طرح اُس نے ڈرامے لکھے، کس طرح جب صاحب نے کہا کہ ویسا اسکرپٹ ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح اُنھوں نے اُس کی سفارش کر کے اُسے پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ میں نے بھی اُسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اُس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اُسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اُس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اُس سے دب کر رہیں گے۔ یہ بھی کہا کہ پی اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈ کاسٹ ہوں اُنھیں اچھی طرح پڑھے، وِیٹ (vett) کرے۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور وِیٹ کیے بغیر براڈ کاسٹ نہ ہونے دے گا۔ ''اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں۔'' میں نے کہا ''تو میں آیندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لیے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی اُردو مسودے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سُن کر وِیٹ کیا کیجیے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈ کاسٹ کیجیے کیوں کہ خراب ڈراما براڈ کاسٹ ہو تو ذمّے داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔'' اس پر اس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔''

قصہ مختصر اشک نے اس اسسٹنٹ کی چاپلوسی کر کے اور اس کی نالائقی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، منٹو کے تحریر کردہ ڈرامے ''آوارہ'' میں تبدیلیاں کروا دیں۔ تبدیل شدہ ڈرامے سے ن م راشد نے بھی اتفاق کیا۔ جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اُس کی تحریر میں اس طرح تحریف کی جا رہی ہے تو وہ برداشت نہ کر پایا اور خاصا ناراض ہوا۔ ایسے چند اور واقعات نے منٹو کو دل برداشتہ کر دیا اور اس نے دلی ریڈیو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

ان واقعات کے دہائی بھر بعد جب منٹو فوت ہوا تو اشک ہندوستان میں تھا۔ اُس نے لکھا ''میرے والد نے میرے دیکھتے دیکھتے آنکھیں بند کی تھیں، میں نہ رویا تھا۔ والد سے تو خیر مجھے محبت نہ تھی، لیکن میری ماں جب مریں تو بھی آنسو میری آنکھوں میں نہ آئے اور اب کرشن چندر کے مضمون کو پڑھتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور منٹو میرا رشتے دار نہ تھا، بھائی نہ تھا، دوست نہ تھا...... میرا دشمن تھا۔''

کرشن چندر نے مضمون میں لکھا تھا ''ابھی منٹو کے کہنے اور سننے کے دن تھے۔ ابھی ابھی زندگی کے تلخ تجربوں نے، سماج کی بے رحمیوں نے، انفرادیت اور ناطرف داری ختم کر کے اُس سے ''ٹوبہ ٹیک

سنگھ'' جیسی کہانی لکھوائی تھی۔ غم منٹو کی موت کا نہیں، موت ناگزیر ہے۔ غم ان ناتخلیق کردہ شہ پاروں کا ہے جو صرف منٹو ہی لکھ سکتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو بھی کھلا ہے، میڈن ہوٹل کا بار بھی، اُردو بازار بھی، کیوں کہ منٹو ایک بہت معمولی آدمی تھا۔ وہ ایک غریب ادیب تھا۔ وہ وزیر نہ تھا کہ کہیں کوئی جھنڈا اُس کے لیے سرنگوں ہوتا، وہ ایک ستائی ہوئی زبان کا غریب اور ستایا ہوا ادیب تھا۔''

تین واقعات منٹو کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور کا واقعہ ہے۔ منٹو 'منشور' کے لیے کالم نگاری کر رہا تھا، ایک روز وہ ابوالحسن نغمی کے ہم راہ تانگے پر 'منشور' کے دفتر گوال منڈی کو روانہ ہوا۔ جب وہ میو اسپتال کے چوک پر پہنچے تو تانگے والے نے کہا کہ ریلوے روڈ کو یک طرفہ ٹریفک روڈ قرار دیا گیا ہے اس لیے وہ مزید آگے نہیں جا سکتا۔ منٹو نے تانگے والے کو وہیں ٹھہرنے کو کہا اور چند قدم دور 'منشور' کے دفتر چل دیا۔ دفتر بالائی منزل پر تھا اور اس کی چوبی سیڑھیاں تھیں۔ منٹو میں اوپر جانے کی ہمت نہیں تھی اس لیے اس نے نغمی سے کالم کا دس روپے معاوضہ لانے کو کہا۔ نغمی دفتر گیا اور منٹو کا پیغام پہنچایا۔ ادھیڑ عمر، سر پر جناح کیپ رکھے، شلوار اور اچکن پہنے، سنہری فریم کی عینک لگائے منشی و منتظم بابو مولا داد نے فوری معاوضہ دینے سے معذرت کی اور معاملہ اگلی مرتبہ پر ٹال دیا۔ منٹو کو معلوم ہوا تو بالائی منزل پر غصے میں پہنچا تو بابو مولا داد نے گھبرا کر فوری ادائی کر دی۔ جب منٹو اور نغمی واپس تانگے والے تک پہنچے تو دیکھا کہ ایک سپاہی تانگے والے کو مار رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''تُو یہاں تانگا نہیں کھڑا کر سکتا۔'' منٹو نے غریب کوچوان پر ظلم ہوتے دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا اور تانگے والے سے چابک لے کر سپاہی پر ٹوٹ پڑا۔ وہ سراپا غیظ وغضب تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم ہو گیا، منٹو برہنہ گفتاری نہ کرتا تھا، بے قابو ہو کر برہنہ گفتاری پر اُتر آیا۔ پولیس والا سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کوئی بے سہارا تانگے والے کی خاطر اُس کی وردی پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ لوگ اُسے کہہ رہے تھے ''یہ منٹو صاحب ہیں، انھیں کچھ نہ کہنا، ورنہ مصیبت پڑ جائے گی۔'' پولیس والا پِٹ پٹا گیا اور منٹو سے معافیاں مانگنے لگا۔

دوسرا واقعہ اُسی دور کا ہے۔ بہ قول محمد اسد اللہ، منٹو نے بہت خوبی سے گھر والوں سمیت ہم سایوں اور دوستوں کی خیر خواہی کے معاملات کا بیڑا اُٹھا رکھا تھا۔ بچوں کا جھگڑا ہو، لکشمی مینشن کے مہتر، مہترانی کے بگڑے تعلقات سنوارنے ہوں، دوست کے لیے ایمبولینس منگوانی ہو یا کسی کا الاٹ منٹ کا مسئلہ ہو، منٹو ہر جگہ مدد کو موجود ہوتا۔

اسد اللہ کراچی سے نیا لاہور آیا تھا، رہائش کا کوئی انتظام نہ تھا، پنجاب یونی ورسٹی میں داخلہ ہو چکا تھا اور وہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ تین چار روز بعد پرانی واقفیت کی بنا پر منٹو کے ہاں پہنچا اور مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج میں داخلہ تو لے لیا ہے، لیکن ہاسٹل میں کمرا نہیں مل سکا، کوئی صورت ممکن ہے؟''

منٹو نے پوچھا کہ کمرا کس طرح مل سکتا ہے۔

''کوئی پروفیسر وارڈن سے سفارش کرے'' اسداللہ نے بتایا۔

منٹو نے پروفیسروں کے نام پوچھے۔ جب ڈاکٹر محمد باقر کا نام آیا تو منٹو بولا۔

''باقر صاحب سے تو کام نکل سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر منٹو نے شیروانی پہن لی اور یونی ورسٹی چلنے کا کہا۔ اسداللہ نے بتایا کہ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے یونی ورسٹی بند ہے۔

''تو پھر باقر صاحب کے گھر چلو'' منٹو مدد کو تیار تھا۔

کوشش کے باوجود باقر صاحب کے گھر کا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ معاملہ اگلے روز پر ٹل گیا۔ اگلے روز اسداللہ منٹو کے ہاں پہنچا تو اُسے شدید نزلے اور بخار میں پایا۔ وہ چلنے کو تیار تھا پر اسداللہ نے اس کی صحت کی خرابی کی وجہ سے تردّد کیا۔ بالآخر منٹو نے ایک رقعہ ڈاکٹر باقر کے نام لکھ دیا۔ کسی وجہ سے وہ رقعہ ڈاکٹر صاحب تک نہ پہنچ سکا۔ اگلے روز منٹو، منیر نیازی اور اسداللہ ڈاکٹر باقر سے ملنے یونی ورسٹی پہنچے۔ وہاں منٹو نے پُرزور سفارش کی۔ ڈاکٹر باقر نے بھی خاص عزت دی۔ واپسی پر منٹو اسٹاف روم میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور مشرف انصاری سے ملا اور ان سے کہا کہ وہ اُس کی تحریر میں خامیوں سے ضرور آگاہ کریں۔ دوسرے دن ڈاکٹر باقر نے اسداللہ کو ہوسٹل میں کمرا دلوا دیا۔

تیسرا واقعہ بھی اسی دور کا ہے۔

لاہور میں منٹو کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیش تر لوگ منٹو کا احترام کرتے تھے۔ منٹو کے احباب میں بہت سے ڈاکٹر تھے۔ ایک مرتبہ منٹو ڈاکٹر پیرزادہ سے ملنے میو اسپتال گیا۔ اس کے ہم راہ اسداللہ تھا۔ میو اسپتال پہنچ کر پتا چلا کہ ڈاکٹر پیرزادہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لیکچر دینے گئے ہیں۔ سو منٹو اُدھر کو چل دیا۔ وہاں کی طالبات نے منٹو کو دیکھا تو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔ منٹو تھوڑی دیر صبر کرتا رہا پھر ان لڑکیوں سے بولا ''آپ میرے دوست سے باتیں کیجیے۔ میں ڈاکٹر پیرزادہ سے مل کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر منٹو وہاں سے چلا گیا۔ جب اُسے خاصی دیر ہو گئی اور لڑکیوں کی باتیں ختم نہ ہوئیں تو اسداللہ سمجھ گیا کہ منٹو غچّہ دے گیا ہے۔ اُس نے لڑکیوں کو اتوار کے دن منٹو کے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ منٹو اس دعوت سے بے خبر تھا۔ اتوار کو لڑکیوں کا گروہ اسداللہ کی راہ نمائی میں منٹو کے گھر پہنچ گیا۔

اُس روز منٹو بیمار تھا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر اُس نے مزید نقاہت طاری کر لی۔ سو لڑکیاں فقط اُس کی

مزاج پرسی کر کے آ گئیں۔

منٹو جو برہنہ قلم اور بے باک انداز کی وجہ سے زیادہ پہچانا گیا، عملی زندگی میں خواتین کے سامنے جھک جاتا تھا۔ اُس سے ملنے کوئی لڑکی آ جاتی تو وہ فوراً اپنی بیوی صفیہ کو آواز دے کر بلا لیتا۔ صفیہ آ جاتی تو وہ اسے اور لڑکی کو گفت گو کرتا چھوڑ کر اپنے دیوان خانے سے ملحق کمرے کے دروازے سے نکل کر چلا جاتا۔ گردشِ ایام اُلٹے پیروں پلٹتی ہے۔

منٹو کا جی دلی سے اوبھ گیا تھا۔ اوائلِ قیام کے دوران اس کا بیٹا اپنی پہلی سال گرہ سے چند روز قبل فوت ہو گیا تھا۔ لاہور سے شائع ہونے والے ادبِ 'لطیف' میں اس کے افسانے 'کالی شلوار' پر مقدمہ، ماتحت عدالت سے سزا اور سیشن کورٹ سے بریّت ہو چکی تھی۔ ابتلا در ابتلا موج در موج چلی آتی تھی۔

سیاہ بادل میں شگاف ہوا اور اُمید کی ایک کرن نے رستہ دکھایا۔ بمبئی میں 'مصور' کے مالک نذیر لدھیانوی نے منٹو کو شوکت حسین رضوی (شوہر میڈم نور جہاں) کی فلم کی کہانی لکھنے کی دعوت دی۔ شوکت صاحب کام یاب فلم ''خاندان'' کے ڈائریکٹر تھے۔

منٹو نے اس بلاوے کو غنیمت جانا، بمبئی پہنچا، اہلِ خانہ کو وہیں بلایا، مصور کی ادارت سنبھالی اور شوکت حسین رضوی کی فلم 'نوکر' پر کام شروع کر دیا۔

اُس نے اس سے پہلے کئی فلموں کی کہانیاں لکھی تھیں۔ بمبئی کا قیام اُس کے لیے معاشی بہتری کا باعث بنا۔

قبل ازیں دِلّی کے قیام کے دوران اس نے کرشن چندر کے ساتھ مل کر ایک فلمی کہانی ''بنجارہ'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کہانی کو لے کر وہ جگت ٹاکیز کے مالک سیٹھ جگت نارائن کے پاس گئے اور اس کے حسبِ خواہش اور اپنے خلافِ مزاج، کئی تبدیلیاں کی تھیں۔ منٹو طے کر چکا تھا کہ وہ ادب کو تسکینِ ذوق اور فلم کو وسیلۂ رزق کے طور پر اپنائے گا۔

البتہ اپنے کام میں غیر ضروری مداخلت کو وہ اپنی تخلیقی رو اور انا کے خلاف گردانتا تھا۔ شوکت رضوی کی فلم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اگر اس میں شوکت صاحب کی حد تک مداخلت اور مشاورت شامل رہتی تو شاید قابلِ قبول ہوتی۔ جب منٹو نے اس کا منظر نامہ اور مکالمے مکمل کر لیے تو شوکت رضوی صاحب نے بے شمار غیر متعلق لوگوں کو مشورے کے لیے شامل کر لیا۔ پس منٹو اس منصوبے سے خاموشی سے علیحدہ ہو گیا۔

اُس نے ''مٹی'' عرف ''اپنی نگریا'' نامی فلم کے لیے سنے ٹون فلم کمپنی کے لیے بھی تبدیلیاں کیں، البتہ یہ فقط ڈائریکٹر کی مشاورت سے کی گئیں۔ چناں چہ فلم مکمل ہوئی، ریلیز ہوئی اور کام یاب بھی رہی۔

ایک دل چسپ حقیقت کم معروف ہے۔ منٹو کے معروف فلمی شخصیت اشوک کمار سے اس درجہ

قریبی تعلقات تھے کہ وہ انھیں دادامنی (بڑا بھائی) کہتا تھا۔ اُس نے اشوک کمار کے لیے فلم 'آٹھ دن' کی کہانی لکھی اور اس میں ایک کردار پاگل کا رکھا۔ یہ کردار مکرجی کو کرنا تھا مگر وہ آخر وقت انکاری ہوگئے۔ یہ طربیہ کردار تھا۔ اشوک کمار نے منٹو سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خود یہ کردار ادا کرے۔ کچھ ردوقدح کے بعد منٹو نے یہ کردار بہ طور اداکار خوبی سے ادا کیا۔ یہ فلم بھی خاصی کامیاب رہی۔

منٹو نے اس دور میں خاصی فلمی کامیابیاں حاصل کیں۔

ایک ابھرتا ہوا لڑکا اُس کے جی کو اپنی شرافت اور وقار کی وجہ سے بہت بھاتا تھا۔ وہ دلیپ کمار تھا۔ منٹو کی اصل دوستی دلیپ کمار کے بڑے بھائی سے تھی جسے دلیپ کمار اور ناصر خان اپنے باپ کا مقام دیتے تھے۔ منٹو کی بڑے بھائی سے دوستی کی وجہ سے وہ اسے بھی بزرگ کا درجہ اور احترام دیتے تھے۔ منٹو کبھی دلیپ کمار کو آبِ جو کی دعوت دیتا تو وہ احتراماً وہاں سے اٹھ جاتا۔ وہ منٹو کے سامنے سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ منٹو کے نسیم اور نرگس سے گھریلو تعلقات تھے اور وہ صفیہ کے ہاں سہیلیاں بن کر آتی تھیں۔ جب منٹو کو بمبئی میں فلمی دنیا اپنا خاندان محسوس ہو رہی تھی تو تقسیم ہند عمل میں آگئی۔ وہ لوگ جو مثلِ برادر تھے، دشمنِ جاں ٹھہرے۔ ٹھہرے ہوئے ماحول میں ہل چل پیدا ہوئی۔ پرسکون سطحِ آب پر چند کنکریاں کیا پڑیں، ارتعاش آج تک ٹھہرنے میں نہیں آرہا۔ چند واقعات نے ہجرت وقتال کو مہمیز دی۔ منٹو نے اہلِ خانہ کو لاہور بھیج دیا اور خود بمبئی میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔

ایک روز اس نے اپنے دوست شیام کو چند سکھوں کی زبانی خون ریزی کے واقعات سن کر بے کل ہوتے دیکھا۔ جب وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تو اس نے شیام سے پوچھا "میں مسلمان ہوں! کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کردو؟" شیام نے جواب دیا "اس وقت نہیں، لیکن اُس وقت جب میں مسلمانوں کے ڈھائے مظالم کی داستان سن رہا تھا، میں تمھیں قتل کرسکتا تھا۔" یہ سن کر منٹو سناٹے میں آگیا اور اُس کو فسادات کا نفسیاتی پس منظر سمجھ میں آگیا جس میں بے شمار بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جارہا تھا۔

یہ وہ ملک نہیں تھا جس میں اُس نے اپنی جوانی کے ایام گزارے تھے۔ یہ ایک غیر ملک تھا۔ اُس نے پاکستان ہجرت کا ارادہ کیا اور چند ماہ میں براستہ سمندر کراچی سے ہوتا ہوا لاہور آن پہنچا۔

ہندوستان میں کرشن چندر، عصمت چغتائی اور دیگر کئی جغادری بیٹھے تھے۔ جب عصمت چغتائی نے منٹو سے پوچھا کہ "آپ پاکستان جاکے کیا کیجیے گا، وہاں آپ کی کیا حیثیت ہوگی؟" تو منٹو نے خوش خیالی میں ایک ایسا جواب دیا جو بعد ازاں آخرِ دم تک اُس کے حواس وگمان پر آسیب کا سایہ کیے رہا۔ اُس نے جواب دیا تھا "وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔"

پاکستان آنے کے بعد کا اُس کا ابتدائی دور گویا خواب وخیال میں تیرتے گزرا۔ کہاں بمبئی کی فلمی

دنیا، دوست احباب، قدرے معاشی استحکام اور کہاں لاہور میں حیاتِ مستعار کا آغازِ نو۔

لاہور کے ابتدائی دور میں منٹو نے لکھا ''تین مہینے تک میرا دماغ کوئی فیصلہ نہ کرسکا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پردے پر ایک ساتھ کئی فلم چل رہے ہیں۔ کبھی بمبئی کے بازار اور اس کی گلیاں، کبھی کراچی کی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار ٹرامیں اور گدھا گاڑیاں اور کبھی لاہور کے پرشور ریستوران۔''

ایک مرتبہ راقم نے معروف دانش ور و ادیب احمد ندیم قاسمی صاحب سے دریافت کیا تھا کہ پاکستان میں رواں معاشرتی تخریب کے ڈانڈے کدھر جا ملتے ہیں تو انھوں نے کہا تھا کہ اس کا آغاز قیامِ پاکستان کے فوری بعد جعلی کلیموں اور الاٹ منٹوں سے ہوگیا تھا۔ خرابی کا کثیف دھواں بوتل سے آہستہ آہستہ نکلتا رہا اور سقوطِ ڈھاکا کے بعد اس نے جناتی شکل اختیار کرلی۔ اُدھر ہندوستان میں نوابی ریاستیں ختم کرکے زرعی اصلاحات نافذ کی جارہی تھیں اور اِدھر اقتدار کی ڈگڈگی کے گرد کئی بچے جمورے ناچ رہے تھے۔

منٹو نے ایسی کسی بھی مہم جوئی کا حصہ بننے سے انکار کردیا۔ گو اُس نے محمد حسن عسکری کے ساتھ مل کر ''اردو ادب'' نامی پرچا نکالا جسے تاخیر سے اجازت نامہ ملا اور دو شماروں کے بعد یہ بوجوہ بند ہوگیا۔ بعد ازاں ہفت روزہ ''نگارش'' کی ادارت سنبھالی۔ کاروباری لحاظ سے یہ بھی سُودمند معاملہ ثابت نہ ہوا۔ درحقیقت منٹو کو اس دوران یکے بعد دیگرے مقدمات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

ایک جانب مصلحت اور پسپائی تھی، دوسری جانب داخلی اطمینان اور جراَتِ رندانہ تھی۔ بیچ میں معصوم صفیہ اور ننھی بچیاں معلق تھیں۔ منٹو پر احساسِ محرومی اور کچھ درجے احساسِ جرم حاوی ہونے لگا۔ وہ اب تک اپنی بیوی اور بچیوں کے لیے کچھ خاطر خواہ نہ کرپایا تھا۔ چناں چہ ان کی بہبود کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس نے آبادکاری کے محکمے میں درخواست جمع کروادی کہ اُسے کوئی پریس یا پریس کا حصہ الاٹ کردیا جائے تاکہ معاشی آزمائش سے نکلنے کی صورت پیدا ہو۔ بدنصیبی سے وہ درخواست مسترد ہوگئی۔ البتہ اُمید کی صورت تب بنی جب قدرت اللہ شہاب محکمۂ صنعت کے ڈائریکٹر تعینات ہوگئے۔ انھوں نے ایک برف خانے میں منٹو کا حصہ رکھوا دیا۔ یہ شہاب صاحب کا بےلوث اظہارِ سپاس تھا۔ منٹو کے ذمے برف کی فروخت کی پڑتال کے علاوہ ترسیل بھی شامل تھی۔ بہ قول خود ''سخت پتھر تھا، اُٹھ نہ سکا، چوم کے چھوڑ دیا۔''

ایک دن وہ شہاب صاحب کو اپنا حصہ تشکر کے ساتھ واپس کر آیا۔

مہدی علی صدیقی، کراچی درجہ اوّل مجسٹریٹ تھے، منٹو کے لیے اجنبی تھے، پر ایسے اُس کی زندگی میں داخل ہوئے جیسے بند گھٹے کمرے کی کھڑکی کھلنے پر باغ کی جانب سے خوش بودار تازہ ہوا کا ریلا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ 1944 کے ''ادبِ لطیف'' کے سال نامے میں منٹو کا افسانہ ''بو'' اور مضمون ''ادبِ جدید'' شائع ہوئے۔ دونوں قابلِ گرفت ٹھہرے اور پرچا ضبط کرلیا گیا۔ مقدمہ دائر ہوا۔ منٹو کی جانب

سے خان بہادر عبدالرحمان چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کنھیا لال کپور اور ڈاکٹر آئی ایل لطیف پیش ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ افسانہ بے ضرر ہے۔ مقدمے میں مصنف سعادت حسن منٹو اور مدیر احمد ندیم قاسمی کو بری کر دیا گیا، جب کہ ''ادبِ لطیف'' کے پبلی شر، پرنٹر اور پروپرائٹر چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کو فی کس ساٹھ روپے جرمانہ ہوا۔

1945 میں منٹو کی کتاب ''دھواں'' اور عصمت چغتائی کی کتاب ''چوٹیں'' (جس میں افسانہ 'لحاف' بھی شامل تھا) پر فحاشی پھیلانے کے الزام میں مقدمہ ہوا، دو سو روپے فی کس جرمانہ ہوا، سیشن کورٹ میں اپیل ہوئی، دونوں باعزت بری ہوئے اور جرمانہ لوٹا دیا گیا۔

''نقوش'' کے مدیر احمد ندیم قاسمی تھے اور منٹو سے افسانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ منٹو نے انھیں اپنا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' دیا، انھوں نے پڑھا، سراہا اور یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ''نقوش'' اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ خاصے دنوں سے افسانے کا تقاضا کر رہے تھے اور منٹو انھیں مایوس نہیں لوٹانا چاہتا تھا سو اُس نے قاسمی صاحب سے اگلے روز ایک اور افسانہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اگلے روز جب وہ منٹو کے پاس پہنچے تو وہ ایک اور افسانے کو اختتامی شکل دے رہا تھا۔ اُن کے بیٹھے بیٹھے اُس نے افسانہ مکمل کر کے اُنھیں دیا، انھوں نے پڑھ کر پسند کیا اور بعد ازاں نقوش میں شائع کر دیا۔

راقم کو احمد ندیم قاسمی صاحب نے بتایا تھا کہ اپنا شاہ کار افسانہ ''موتری'' منٹو نے آدھ پونے گھنٹے میں لکھ ڈالا تھا۔ منٹو کے حوالے سے اُن کی چند یادداشتیں اُن پر لکھے گئے خاکے 'پارس' میں موجود ہیں۔ عارف عبدالمتین نوجوان، پُرجوش اور متحرک ادیب و شاعر تھا۔ وہ ''جاوید'' کے نام سے ایک پرچہ نکالتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' اس کے پرچے کے لیے دیا جائے۔ چناں چہ منٹو نے اُسے اپنے ناشر چودھری نذیر کے نام چٹ لکھ دی ''یہ 'جاوید' والے اپنا پرچہ ضبط کرانا چاہتے ہیں، براہِ کرم انھیں ''ٹھنڈا گوشت'' کا مسودہ دے دیجیے۔'' سو 'ٹھنڈا گوشت'، 'جاوید' میں شائع ہو گیا۔ چند ہفتے خاموشی رہی۔ یک دم پریس برانچ میں جنبش ہوئی اور اس نے سارے پرچے ضبط کر لیے۔ مختصر یہ کہ، معاملہ نچلی عدالت تک گیا، منٹو کو سزا ہوئی، سیشن کورٹ سے بریت ہوئی اور لاہور ہائی کورٹ نے فی کس تین سو روپے جرمانہ کر دیا۔

کراچی میں صبح کا وقت تھا، مہدی علی صدیقی مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت کی کارروائی جاری تھی۔ اتنے میں موٹی آنکھوں، گول چشمے اور اکہرے بدن والا شخص مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ وہ کس لیے آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ادیب سعادت حسن منٹو ہے اور اپنے افسانے ''اوپر، نیچے اور درمیان'' پر مقدمے کے سلسلے میں آیا ہے۔ مجسٹریٹ نے اُسے غور سے دیکھا اور احترام سے ملائمت

بھرے لہجے میں کہا ''تشریف رکھیے۔''

منٹو کو کسی عدالت میں اتنی عزت سے نہ بلایا گیا تھا۔ وہ سمجھا کہ کسی اور کو کہا جا رہا ہے۔ مجسٹریٹ نے پھر دہرایا ''تشریف رکھیے۔'' تو منٹو بیٹھ گیا۔ اُس نے پوچھا ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' منٹو نے جواب دیا ''میں بہت بیمار ہوں، جلد لاہور واپس جانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے فارغ کر دیجیے۔'' مجسٹریٹ نے اب تک افسانہ نہیں پڑھا تھا سو اگلے روز کا وقت دے دیا تا کہ اُسے افسانہ پڑھ کر اس میں بے باکی کے عنصر کے تعین میں آسانی ہو۔ اگلے روز پیشی پر مہدی علی صدیقی مجسٹریٹ نے کہا کہ فیصلہ لکھ لیا گیا ہے اور ایک پرزہ جیب سے نکالا۔ اس کے بعد ریڈر سے تاریخ کا پوچھا۔ ریڈر نے بتایا کہ اُس روز پچیس تاریخ ہے۔ منٹو نے پوچھا ''جناب پچیس روپے جرمانہ؟'' یہ سن کر جج نے مسکرا کر پرچی پر لکھے پانچ سو روپے جرمانے کی رقم کو کاٹا اور اسے پچیس کر دیا۔ منٹو جرمانے کی رقم ادا کر کے چلنے لگا تو مجسٹریٹ نے اسے ایک روز مزید کراچی قیام کرنے کی درخواست کی اور اگلے روز زیلن کافی ہاؤس میں ملنے کی دعوت دی۔

اگلے روز جب منٹو زیلن کافی ہاؤس پہنچا تو مہدی علی صدیقی کو وہاں اپنا منتظر پایا۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہوا تھا۔ البتہ اُن کی نظر میں منٹو نہ صرف ان زبانوں کے اہم ادیبوں کے ہم پلہ تھا بلکہ کہیں کہیں بڑھ بھی جاتا تھا۔

منٹو نے اُن سے دریافت کیا کہ اُنھوں نے منٹو کو سزا کیوں دی۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا کہ اُن کی نظر میں وہ تحریر فحش تھی۔ جب منٹو نے فحش کی تعریف پوچھی تو انھوں نے کہا کہ وہ دو برس بعد ریٹائرمنٹ کے بعد بتائیں گے۔ مجسٹریٹ کا تعلق حیدر آباد سے تھا۔ منٹو کی نظر میں وہ حیدر آباد سے ابراہیم جلیس کے بعد دوسرے دوست ٹھہرے۔ بعد ازاں مہدی صدیقی نے 'افکار' کے منٹو نمبر میں ایک مضمون میں اس افسانے کو فحش سمجھنے کی وجوہات بیان کر دی تھیں۔ دونوں میں باقاعدہ خط کتابت بھی رہی اور منٹو نے اپنے افسانوی مجموعے کا انتساب بھی مہدی علی صدیقی کے نام کیا۔

منٹو اور برہنہ بیانی کے حوالے سے ایک واقعہ اُس کے مزاج پر روشنی ڈالتا ہے۔

ایک مرتبہ ابوالحسن نغمی اور منٹو لکشمی مینشن سے مال روڈ کی جانب جا رہے تھے۔ نغمی نے منٹو کو اپنی زندگی کے ایک واقعے پر مبنی روداد فرضی نام سے سنائی تا کہ اس پر افسانہ لکھا جا سکے۔ اس قصے میں پانچ سال کے بچے سے اُس کی محلے دار چودہ پندرہ برس کی لڑکی بہت محبت سے پیش آتی ہے۔ ایک روز موقع پا کر وہ اسے اپنے گھر کی نیم تاریک کوٹھڑی میں لے جاتی ہے اور چند ایسے حقائق سے آگاہ کرتی ہے جو اتنے سے بچے کے لیے قبل از وقت ہوتے ہیں۔ وہ بچے کو تاکید کرتی ہے کہ ان دونوں کے بیچ ہونے والے معاملے کو راز رکھے ورنہ اُس کے پیٹ میں بہت درد اُٹھے گا۔ جب نغمی نے منٹو کو یہ روداد سنائی تو منٹو نے صاف انکار

کرتے ہوئے کہا ''نہیں، میں یہ کہانی نہیں لکھوں گا۔'' یہ زندگی کا ایسا واقعہ ہے جو فقط سستے جذبات برانگیختہ کرتا تھا، اس میں کوئی نکتہ، کوئی گہری بات نہ تھی۔ سو منٹو نے اسے فقط لذت کوشی کے مقصد کے تحت لکھنے سے واضح انکار کر دیا تھا۔

منٹو کی مے کشی کے حوالے سے چند واقعات صراحت سے اس کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔

گیت نگار فیاض ہاشمی کی زبانی، منٹو جس دور میں لاہور میں فلموں کے مکالمے لکھ رہا تھا، اُن دنوں ایک فلم پر دن رات کام جاری تھا۔ ہر فن کار، تخلیق کار، تکنیک کار اپنے اپنے کام میں جُتا ہوا تھا۔ ایک رات کام میں تیزی اور ماحول میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے ڈائریکٹر نے وھسکی منگوالی۔ سب کے سامنے جام رکھے گئے، بیش تر لوگوں نے پیش کش خوشی سے قبول کر لی۔ منٹو کی باری آئی تو وہ مکالمے لکھنے میں منہمک تھا۔ اُس نے جام کو ایک نظر دیکھا اور بولا ''نہیں، یہ کام کا وقت ہے۔ میں کام کے وقت نہیں پیتا۔''

دوسرا واقعہ منٹو کے بمبئی قیام کا ہے۔ ایک مرتبہ قریبی دوستوں کی محفل خرابات تھی۔ وہاں ایک گلوکارہ بھی موجود تھی۔ وہ مختلف گیت سنا رہی تھی۔ اتنے میں ایک شریکِ محفل کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اُس نے مغنیہ سے نعت کی فرمائش کر دی۔ اس پر منٹو نے مداخلت کی اور کہا کہ اس ناپاک محفل میں اُس پاک ہستی کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ تو ایک معروف حقیقت ہے کہ منٹو اپنی کسی بھی تحریر سے پہلے کاغذ پر بہت نفاست سے 786 (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) لکھا کرتا تھا۔ ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ محفل نائونوش میں بیٹھے زاہدِ خشک سے رندانِ فلک پیما تقاضا کرتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔ عام زندگی کا قلیل ظرف بھی ایسے میں سخی ہو جاتا ہے۔ اس چلن کے برعکس منٹو کا ایک بھی ایسا واقعہ یا شہادت نہیں کہ اُس نے کسی کو مے کشی پر مجبور کیا ہو یا اس کی جانب ملتفت کیا ہو۔

منٹو نے پاکستان کی فلمی صنعت میں قسمت آزمائی کی، اپنے بھانجے مسعود پرویز کے ساتھ مل کر ''بیلی'' نامی پنجابی زبان کی فلم بنائی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ بالآخر اُس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا اور وہ تھا افسانے تحریر کر کے فروخت کرنے کا۔ ان سے اس درجے قلیل معاوضہ حاصل ہوتا تھا کہ وہ بہ مشکل زندگی کی ضروریات پوری کر پاتا تھا۔ منٹو کو اپنے قریباً ہم عمر بھانجے حامد جلال کے بہ موجب اُس کے الاٹ شدہ مکان کی نچلی منزل، بہ موقع 'لکشمی مینشن' پر جگہ مل گئی تھی۔

آہستہ آہستہ غمِ روزگار منٹو کے اعصاب پر سوار رہنے لگا، اس پر مستزاد تقسیم کے اندوہ ناک فسادات اور اس کی حساس طبیعت۔ وہ حقائق سے فرار کے لیے بسیار نوشی کی جانب راغب ہو گیا۔

لکشمی مینشن کی بالکونی پر گرمیوں کے اواخر شام کی ہوا بہہ رہی تھی۔ سڑک کے نکڑ پر آلو کی ٹکیوں

اور سموسوں کی دکان پر چند خریدار کھڑے تھے۔

اس دکان کے ہال کی شہتیروں والی چھت سے ملحق عمارت کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مخمور منٹو بیٹھا تھا۔ شام گہری ہو کر رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اندر باورچی خانے میں صفیہ کھانا پکا رہی تھی۔ پکوان کی مہک سارے میں پھیل رہی تھی۔

اسپرنگوں والے جالی دار دروازے کے باہر منٹو کا ہم سایہ جی ایم اثر سیاہ چشمہ لگائے آیا اور منٹو کو اشارہ کیا۔ منٹو نے اندر باورچی خانے کی جانب دیکھا کہ کہیں صفیہ نے جی ایم اثر کو دیکھ تو نہیں لیا اور دروازے کے قریب جا کر سرگوشی کی۔ اثر سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

منٹو کے فلیٹ کے قریب ہی چند مے خانے اور ہوٹل تھے۔ اِن میں اسٹینڈرڈز سب سے معروف تھا۔ یہاں اینجلا نامی کرسٹائن چھوکری خوب ناچتی تھی۔ ان جگہوں پر شراب گراں قیمت کی تھی۔ بیرٹ نامی پارسی کی بیکری میں پیسٹریاں نگینوں کی طرح سجی رہتی تھیں، بغل میں ایڈل جی کی شراب کی دکان تھی جہاں کے نیم تاریک ماحول میں نیلے، پیلے، سرخ، سبز، سفید اور دیگر رنگوں کی خوش نما بوتلیں یوں چمکتی تھیں جیسے اندھیرے کمرے میں رنگین زیرو بلب۔ ان میں کم قیمت شراب بھی با آسانی میسر تھی۔ منٹو اندھیرے میں بصارت مکمل طور پر کھو بیٹھتا تھا اسی لیے تانگے پر روشن و نیم روشن رستوں پر سفر کرنا پسند کرتا تھا مبادا کسی گڑھے میں گر کر حادثہ ہو جائے۔ ایڈل جی کے اندھیروں میں اُسے وِھسکی، جِن، واڈکا، بیئر کی بوتلیں خوب نظر آتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ منٹو کے فقط بے راہ دوست ہی رہ گئے تھے۔ آغا خلش کاشمیری صاحب تھے جو کیلے، مالٹے، کینو ایسے پھلوں کو ناممکن طریقے سے چھلکوں سمیت کھا جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اِن پھلوں کی صحیح تاثیر ان کے چھلکوں میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ داستانوی ''لیموں نچوڑ'' کرداروں کی طرح کھانے کے بیچ یہ کہہ کر شریک ہو جاتے ''کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں، تمھارا ساتھ دینے کے لیے شریک ہو جاتا ہوں'' اور دس بارہ چپاتیاں کھا جاتے۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب ہر شخص کا منفرد کردار اور جدا شخصیت تھی، ایک ہی ماحول اور یکساں ذرائع سے متاثر ہو کر لوگ برائلر مرغیوں کی طرح پھیکے میکانکی اور یکساں نہ ہوئے تھے۔

ایک صبح کی بات ہے، منٹو خوب نہا دھو کر، ناشتا کر کے، صاف ستھرے کپڑے پہنے اپنے لکشمی مینشن والے فلیٹ میں کھڑکی کے ساتھ ایک کرسی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اُس نے گھٹنوں پر کلپ بورڈ رکھا ہوا تھا جس پر سفید کاغذوں کا ایک دستہ لگا تھا۔ اُس نے صاف ہاتھ سے ایک پیراگراف لکھا اور اس کے نیچے اُفقی لکیر لگا دی۔ تپائی پر نفاست سے ترشی پنسلیں، قلم تراش اور ربر دھرے تھے۔ آرائشی آتش دان پر اردو ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔

اُس نے کلپ بورڈ اور کاغذ تپائی پر رکھ دیے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ منٹو نے جالی دار دروازے سے باہر کی جانب دیکھا اور مہمان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اٹھارہ بیس برس کا لڑکا اندر آیا، منٹو نے گول عینک کے پیچھے سے موٹی موٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور سنجیدگی سے کہا ''آؤ نغمی آؤ۔''

چند لمحے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

منٹو کی آنکھوں میں تھکاوٹ اور سرخی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

''پرسوں میں صفاں والے چوک گیا تھا۔ وہاں افیون کے ٹھیکے کی دکان سے افیون کا گولا خریدا۔ سنا تھا کہ اگر کوئی شخص کڑوے تیل میں افیون کا گولا ڈال کر نگل جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں مطلوبہ مقدار میں افیون کو کڑوے تیل میں ڈال کر نگل گیا۔ وہ نہ تو حل ہوا اور نہ ہی ہضم۔ میں بہت دیر تک مرنے کا انتظار کرتا رہا مگر موت نہیں آئی۔ میں کس قدر سخت جان ہوں۔''

منٹو کو دو مرتبہ ذہنی شفا خانے میں داخل کرنا پڑا۔ یہاں اسے کسی نفسیاتی عارضے کے علاج کے لیے داخل نہ کیا گیا بلکہ شراب کی لت چھڑانے کے لیے داخل کیا گیا۔ ابتدائی دنوں میں وہ اس لت سے دُور رہا پر دوست نُما دشمنوں کے اُکسانے پر دوبارہ اس جانب مائل ہو گیا بلکہ مائل بہ پرواز ہو گیا۔ بہ قول اس کے بھانجے حامد جلال ''اوائل 1952 سے اگست 1953 تک شاید ہی کوئی ایسا وقت گزرا ہو جب وہ نشے میں نہ رہے ہوں۔''

اگست 1953 میں اسے یرقان ہوا اور میو اسپتال کے اسی وارڈ میں رکھا گیا جہاں اُس کے پہلے استاد باری علیگ کا انتقال ہوا تھا۔ اسے بیڈ نمبر 24 دیا گیا جہاں اُس کے دوسرے استاد اختر شیرانی نے وفات پائی تھی۔ اتفاقاتِ زمانہ کہیے یا حوادثِ زمانہ!

اسپتال میں ڈاکٹر محمد اسلم پیرزادہ اس کے محسنین کی فہرست میں شامل تھے۔ وہ ذاتی توجہ اور انہماک سے اس کا علاج کرتے۔ یہاں تک کہ منٹو تن درست ہو گیا اور گھر لوٹ آیا۔ ڈاکٹر صاحب اُسے گھر بھی دیکھنے چلے آتے تھے۔ منٹو نے آخری کوششوں میں سے ایک کوشش مکتبۂ منٹو نامی اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھ کر کی۔ وہ مسلسل بیمار تھا، نڈھال رہتا تھا، جانتا تھا کہ اُس کا دمِ واپسیں آیا ہی چاہتا تھا، سو اپنی کتب کے حقوق اپنی بیوی صفیہ کے نام کرنا چاہتا تھا۔

آخری کوشش کے طور پر اُس نے وزارتِ کشمیر کے ہفتہ روزہ 'آزاد کشمیر' کی ادارت کے لیے درخواست دی۔ اُسے بلا لیا گیا۔ یہاں اُس نے اپنے افسانوں کی طرز کا ڈراما کھیلا۔ انٹرویو راول پنڈی میں

تھا۔ وہاں اس کی ملاقات یوسف ظفر سے ہوئی۔ یوسف ظفر نے اپنی ضرورت اور پریشانی کا تذکرہ کچھ ایسے دل گیر انداز میں کیا کہ منٹو کا دل پسیج گیا۔ وہ واپس تو نہ جا سکتا تھا۔ البتہ اُس نے یوسف ظفر کے حق میں دست بردار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ انٹرویو میں قصداً میلے کپڑوں اور بڑھی شیو کے ساتھ شریک ہوا۔ نتیجتاً اُسے منتخب نہ کیا گیا۔ وہ یوسف ظفر کو احسان جتائے بغیر اپنے من چلے اور بہ ظاہر بے پروا انداز میں لوٹ آیا۔

17 جنوری 1955 کو سارا دن شہر گھوم کر جب وہ گھر لوٹا تو اسے خون کی قے ہوئی۔ یہ قے حامد جلال کے چھے سالہ بیٹے نے دیکھ لی، پر منٹو نے اُسے بتایا کہ یہ پان کی پیک ہے اور گھر والوں سے تذکرہ کرنے سے منع کر دیا مبادا وہ پریشان ہو جائیں۔ رات کو معمول کے مطابق وہ کھانا کھا کر لیٹا، جگر میں درد کی شکایت ہوئی۔ جب یہ درد حد سے گزر گیا تو اس نے بیوی کو جگایا۔ اُسے مسلسل خون کی قے آ رہی تھی۔ بیوی صفیہ اسپتال جانے لگی تو منٹو نے روکا، بہن ناصرہ اقبال نے دلارے بھائی کو مالٹے کا رس دیا۔ بچیوں کو اس کے اصرار پر اسکول روانہ کر دیا گیا۔

جوس سے جسم میں غیر معمولی ٹھنڈک دوڑ گئی۔ منٹو نے ٹانگیں سیدھی کیں، بہن نے اپنے حقیقی اکلوتے چھوٹے بھائی پر دو کمبل ڈال دیے تا کہ اسے گرمی پہنچے۔ منٹو نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''بس اب تو اللہ ہی اللہ ہے۔ اللہ ہی اللہ۔''

صفیہ جلدی سے ایمبولینس لے آئی، بہن سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہی تھی۔ بیوی سے شوہر کی حالت نہ دیکھی جا رہی تھی۔ اُس نے سمجھا کہ شاید شراب کی طلب نے منٹو کا یہ حال کر دیا ہے۔ اُس نے خود شراب کا ایک چمچ منٹو کو پلانے کی کوشش کی لیکن قطرے گالوں پر بہ گئے۔ ایمبولینس میو اسپتال پہنچی تو ڈاکٹروں نے منٹو کی موت کی تصدیق کر دی۔

اُس وقت اسپتال کا گھڑیال صبح کے ساڑھے دس بجا رہا تھا۔ اُردو کا نابغۂ روزگار ادیب اسپتال کے باہر کھڑی ایمبولینس ہی میں مر چکا تھا۔ منٹو نے اپنی قبر کا کتبہ خود تحریر کیا تھا ''یہ لوح سعادت حسن منٹو کی قبر کی ہے جو اَب بھی سمجھتا ہے کہ اُس کا نام لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر نہیں تھا۔ منٹو۔''

صفیہ، جو یتیم لڑکی تھی تو بیاہ دی گئی، باقی زندگی تنگ دستی اور شوہر کی بے اعتدالی کی نذر ہوئی، اکلوتا بیٹا بچپن میں فوت ہو گیا، تین بیٹیاں چھوٹی سی تھیں تو شوہر فوت ہو گیا۔ خواہش ہوتی ہے کاش کہ منٹو کی کہانی صفیہ کی نظر اور اُس کے قلم سے بھی لکھی جاتی۔

8:31
ا/ ر
سلمان اور انا سرار
پیوسٹ
8/3/2022
مورخہ منٹراں

جون صاحب

جون ایلیا

معروف شاعر، ادیب، فلسفی اور عجوبۂ روزگار شخصیت جون ایلیا کے بڑے بھائی رئیس امروہوی حادثاتی طور پر انتقال کر گئے۔ لوگ جون سے تعزیت کر رہے تھے، انھیں دلاسے دے رہے اور ہمت بندھا رہے تھے۔ خاصی دیر تک وہ لوگوں کا پُرسہ سنتے رہے، پھر لمبی آہ بھر کر بولے "ہاں جناب، ہمیں اپنے بھائی کے قتل کا کوئی تجربہ تو نہیں تھا۔"

اُن کے ابتدائی دنوں کے دوست اور غم گسار شکیل عادل زادہ رقم طراز ہیں "کسی دن گھریلو معاملوں کا قصہ چل رہا تھا۔ کہنے لگے 'یار شکیل! سنتے ہیں، پچھلے زمانوں میں بیویاں مر بھی جایا کرتی تھیں۔'"

منفرد شاعر عبیداللہ علیم اور جون صاحب میں اچھی دوستی تھی۔ علیم کی اچانک وفات جون کے لیے صدمے کا سبب تھی۔ جنازہ اٹھا تو ایک ہم عصر شاعر پچھاڑیں کھانے اور گریہ کرنے لگے۔ وہ ہر کسی سے لپٹ جاتے۔ جون بھی غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تدفین کے لیے جب میت کو بس میں رکھا جا رہا تھا تو کسی دوست نے اُس ہم عصر شاعر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جون کے کان میں کہا "اس کی تو حالت دیکھی نہیں جاتی۔" یہ سن کر جون صاحب ادھر دیکھتے ہوئے ہونٹ سکوڑ کر بولے "ہاں جانی! وہ ہم سے بازی لے گیا۔"

یارِ خاص تو صاحبِ طرز ادیب اسد محمد خان بھی تھے۔ دونوں میں خوب بنتی تھی۔ ایسی بے تکلفی کہ آدابِ برطرف کرتے ہوئے دونوں بے خود و بے خبر سے ہو جاتے۔ اسد صاحب کو دیکھ کر جون خوب نخرے میں آ جاتے، بولتے "ارے دیدی! کہاں رہ گئی تھی نامراد، کتنی دیر کر دی۔ کب سے راہ تک رہی ہوں۔ گھڑی دیکھی ہے۔ اب کیا خاک جانا ہوگا۔"

اسد محمد خان اُسی انداز میں جواب دیتے "کیا بتاؤں بھنّو! سمجھو، بس خیر ہوگئی۔ خدا جانتا ہے، کس مشکل سے پہنچی ہوں۔ کم بخت بس رستے میں تین مرتبہ ٹھپ ہوئی۔ معلوم تھا، تجھ سے تو انتظار برداشت ہی نہیں ہوتا۔ گھول رہی ہوگی..... تُو تو۔"

جون صاحب جواب دیتے "میں تو ہول رہی تھی۔ زمانہ برا آ گیا ہے۔ جانے کیسے کیسے وہم آ رہے تھے۔"

ایسا نہیں تھا کہ جون شعوری طور پر بنتے ہوں۔ یہ کجی کہیے یا قلندری اُن کی شخصیت میں یوں جذب تھی جیسے نمکین سمندری پانی آبی گھاس میں۔

دنیا دو قطبی دیوؤں کے بیچ تقسیم تھی۔ امریکا نے سرمایہ دارانہ نظام اور سوویت یونین نے سوشلزم کا جھنڈا اتھام رکھا تھا۔ جون صاحب کا واضح طور پر ذہنی جھکاؤ سوشلزم اور کمیونزم کی جانب تھا۔ دنیا کی چند بڑی کتابوں میں ایک "داس کیپیٹال" کا مصنف ایک جرمن عالم، فلسفی اور معیشت داں کارل مارکس! اُس کے پاس اپنی بیٹی کے علاج کے پیسے بھی نہ تھے۔ داس کیپیٹال کے فلسفے پر وجود میں آنے والے نظام نے تیسری دنیا

کے بہت سے دانش وروں کو اپنے رومان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پاکستان کے دائیں بازو کے دانش ور اس ہمہ جہت نظام کے فقط ایک پہلو، یعنی دین سے دوری سے خوف زدہ تھے اور اسی کو مشتہر کر کے لوگوں کو اس سے برگشتہ کرتے تھے۔ بہر حال یہ معاملہ اب بحث طلب ہے اور بحث بڑی حد تک فرسودہ بھی کہ اس کے معاشی نظام ہی کو اپنا لیا جاتا اور مذہب سے متعلق پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا تو دنیا کس قدر مختلف ہوتی۔ اسی اِزم سے متاثر ہو کے بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا تھا۔

ایک رات جون ایلیا گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے۔ اُدھر ماسکو میں گورباچوف کے زیرِ انتظام سویت یونین کا اِنہدام عمل میں آ رہا تھا۔ ماسکو میں فوج داخل ہو گئی تھی اور لوگوں نے لینن کا مجسمہ گرا دیا تھا۔ یہ سب پاکستان میں سی این این پر دکھایا جا رہا تھا۔

جون کے ہم دم اور دانش ور انیق احمد اُس وقت ٹی وی پر یہ تاریخ ساز لمحے دیکھ رہے تھے۔ رات کے دو، اڑھائی بجے کا عمل ہوگا۔ انھوں نے جون کو یہ بڑی خبر سنانے کے لیے فون کیا۔ گھر والوں نے بتایا کہ وہ سو چکے ہیں۔ انھوں نے جون کو جگانے پر اصرار کیا۔ گھر والوں نے جون کو اٹھایا اور انیق کے فون کا بتایا تو جون انکار نہ کر سکے اور آنکھیں ملتے ہوئے فون سننے نیم خوابیدگی میں چلے آئے۔ انیق نے بتایا ''بھائی جون! روسی باغی فوج ماسکو میں داخل ہو گئی ہے اور لینن کا مجسمہ روندا جا رہا ہے''

جون ہڑبڑا گئے۔ انھوں نے بے یقینی سے انیق احمد سے کہا ''نہیں جانی، نہیں جانی۔''

انیق نے بتایا کہ وہ بہ چشمِ خود سی این این پر یہ ناقابلِ فراموش مناظر دیکھ رہے ہیں۔ جون چپ ہو گئے۔ انیق نے دوبارہ مناظر کی روداد سنائی تو جون گرفتہ آواز میں بولے ''ہاں جانی، فوج کہیں کی بھی ہو، ہوتی پنجابی ہے۔''

انیق احمد ہی کے ساتھ اُن کا ایک دل چسپ واقعہ ہے۔ انیق ٹھہرے زاہدِ خشک اور جون رندِ بلانوش۔ ایک مرتبہ جون صاحب رات گئے انیق کے ہم راہ رکشے میں جا رہے تھے۔ جون صاحب اپنے حال میں تھے۔ رستے میں خداداد کالونی کے نزدیک حساس ادارے کے اہل کاروں نے انھیں روک لیا۔ انیق نے جون سے درخواست کی کہ وہ کچھ نہ بولیں ورنہ اُن کی خمارزدگی کی بات کھل جائے گی اور خواہ مخواہ کوئی پیچیدگی ہو سکتی ہے۔ جون صاحب نے کہا ''ٹھیک ہے جانی، میں چپ بیٹھا رہوں گا۔'' اہل کاروں نے پوچھا کہ وہ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں۔ انیق نے کچھ بتایا کہ جون صاحب یکا یک رکشے کے دوسرے دروازے سے نکل آئے اور سینہ تان کر بولے ''شراب پی کر آ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر جون صاحب نے جیب سے بوتل نکال کر بھی اہل کاروں کو بہ طور ثبوت دکھائی۔ انیق یہ سب ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔ جون صاحب نے اعترافی بیان دینے کے بعد سڑک پر رقص کے انداز میں ہاتھ لہرانے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی وہ اپنا قومی نغمہ بھی ترنم

سے سنانے لگے: ''ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔'' اپنے بڑے بھائی رئیس امروہوی کے لکھے ملی نغمے کے چند اشعار بھی سنائے اور گائے۔ اہل کار حیران و پریشان تھے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے جانے کی اجازت دے دی۔ انیق صاحب ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے رکشے میں بیٹھے تو جون صاحب فخریہ لہجے میں اُن سے بولے ''دیکھا؟ تیرا بھائی اتنا بھی بے ہوش نہیں۔''

ڈاکٹر توقیر ارتضٰی مستند شاعر اور منجھے ہوئے بیوروکریٹ ہیں۔ وہ اپنے آبائی شہر ایبٹ آباد میں طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو خبر اُڑی کہ جون ایلیا وہاں ایک مشاعرے کی صدارت کرنے آ رہے ہیں۔ وہ جون کی شاعری کے مداح تھے سو مقررہ تاریخ کو مجوزہ مقام پر مشاعرے میں بہ طور سامع پہنچ گئے۔ مشاعرہ خوب جما اور جون نے تو گویا محفل لوٹ لی۔ اسی دوران جون کچھ زیادہ ہی خمار میں آ گئے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو توقیر صاحب صدرِ مشاعرہ جون سے اظہارِ عقیدت کے لیے آگے بڑھے۔ تب تک اسٹیج خالی ہو چکا تھا اور جون کرسیِ صدارت چھوڑ کر اسٹیج پر قلابازیاں لگا رہے تھے۔ وہ ایک کونے سے قلابازی لگانی شروع کرتے اور دوسرے کونے تک چلے آتے۔ یہ معمول دوسرے کونے سے تیسرے کے لیے شروع ہو جاتا۔ توقیر صاحب بہت صبر سے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے۔ جون صاحب لوٹنیاں لگاتے ہوئے وہاں پہنچے اور اگلے مرحلے کے لیے تیار ہونے لگے تو توقیر صاحب نے انتہائی عجز و ادب سے انھیں بتایا کہ وہ جون صاحب کے بہت مداح ہیں۔ یہ سن کر جون کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور وہ بولے ''جانی! اگر اتنے ہی مداح ہو تو آؤ میرے ساتھ قلابازیاں لگاؤ۔''

توقیر صاحب مداح تو ضرور تھے پر اتنے بھی نہ تھے۔ بہ قول اُن کے ''جون صاحب تو کراچی لوٹ جاتے۔ میں لوٹنیاں لگا کر ایبٹ آباد کے دوستوں کو کیا منہ دکھاتا'' سو وہ وہاں سے خاموشی سے کھسک لیا۔

یہ روپ جون صاحب طاری کرتے تھے، ڈراما سجا لیتے تھے یا ان کی عادات و حرکات مصنوعی ہوتی تھیں سمجھنے کے لیے ایک حقیقت مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ جون بہت سی زبانوں کے عالم، کئی علوم پر قادر اور نفسیات کی گتھیوں کے شارح تھے۔ وہ زندگی کی بے معنویت اور کائناتی وسعت میں انسان کی بے اہمیتی سمجھ چکے تھے۔ شاید زندگی کو ایک کھیل تماشے سے زیادہ نہ لیتے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی بھی حقیقی صاحبِ علم و ادراک متکبر نہیں ہو سکتا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ جون دانائے راز تھے سوخ رو تھے۔ وہ پیچیدہ اور مجموعۂ اضداد بھی تھے۔ رقیق القلب تھے اور آمادۂ پیکار بھی۔ عجب آدمی تھے۔ اپنے گرد فسوں کا ایک ہالہ رکھتے تھے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ جون ایلیا 14 دسمبر 1931 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ زاہدہ حنا کا خیال ہے کہ اُن کا سنِ پیدائش 1928 ہے۔ جب کہ شکیل عادل زادہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں کچھ وثوق

سے نہیں کہا جاسکتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ جون صاحب کو کم عمر نظر آنے اور کہے جانے کا جنون تھا اس لیے اپنی عمر چند برس کم لکھوائی۔ جب شکیل عادل زادہ مراد آباد میں ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے تو جون صاحب وہاں امروہہ سے تقریری مقابلے میں بہ طور مہمان آئے تھے۔ یہ 52-1951 کی بات ہے۔ مراد آباد امروہہ سے قریباً بیس میل کے فاصلے پر ہے۔

تقریری مقابلے میں ایک مقرر یعنی نوعمر شکیل عادل زادہ کو جون صاحب نے پہلے انعام سے نوازا تھا۔ بعد میں مقابلے کے مہتمم مولوی عتیق الرحمان نے شکیل کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ عادل ادیب مرحوم کے فرزند ہیں۔ عادل ادیب کا نام سن کے جون صاحب اُچھل گئے اور جوش و جذبے سے شکیل کو گلے لپٹا لیا۔ ''ارے، تم عادل بھائی کے بیٹے ہو۔''

جون ایلیا نے مولوی عتیق الرحمان سے کہا ''آپ کو معلوم ہے، یہ کون ہے؟ یہ ہمارے خاندان کا فرد ہے۔'' شکیل کے والد نام ور ادیب شاعر اور صحافی عادل ادیب ہی رئیس امروہوی کو امروہے سے مراد آباد لائے تھے اور اپنے علمی و ادبی ماہ نامے 'مسافر' کی ادارتی ذمے داری سونپی تھی، یعنی رسالہ مسافر کے ذریعے رئیس امروہوی عملی طور پر صحافت سے وابستہ ہوئے تھے۔ مسافر میں اُن کا نام 'رئیس التحریر' کے لقب کے ساتھ شائع ہوتا تھا (رسالہ مسافر کے چند شمارے کراچی کی بیدل لائبریری میں محفوظ ہیں)۔ رئیس امروہوی نے پھر بیوی اور بچوں سمیت مراد آباد ہی کو مسکن بنا لیا تھا۔ جون صاحب کے بہ قول، ہم پیشگی، دوستی کے علاوہ خاندانی قسم کا تعلق عادل ادیب اور رئیس امروہوی کے درمیان بہت گہرا تھا۔ 1944، دوسری جنگ عظیم کے دوران کاغذ کی نایابی سے 'مسافر' کو بند کرنا پڑا تھا۔

جون صاحب نے آہ بھر کے کہا ''اور اسی سال کے آخر میں عادل بھائی کا انتقال ہو گیا۔ لوگ تو بہت کچھ کہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں، 'مسافر' کے بند ہو جانے کا صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔''

52-1951 کے اُس تقریری مقابلے میں یوں جون اور شکیل صاحب کے خاندانی مراسم کا اعادہ ہوا۔ بعد میں دونوں کی قربت کے احوال سے بے شمار ادب دوست واقف ہیں۔

شکیل صاحب کہتے ہیں ''جون صاحب اس وقت باقاعدہ جوان مرد تھے، پھر 1931 کی پیدائش کیسے تسلیم کی جائے۔''

جون ایلیا کی بھتیجی شاہانہ رئیس ایلیا اپنی کتاب چچا جون (مطبوعہ، ورثہ پبلی کیشنز: از عقیل عباس جعفری صاحب) میں اُس دور کی خوب صورت تصویر کشی کرتی ہیں۔

امروہہ میں بھوڑ ٹیلے آگ دھونکتے سورج کی تپش میں گرمیوں کی آندھیوں اور تیز ہواؤں میں مقام بدلتے رہتے تھے۔ گلی محلوں میں ریت کے بھنور بنتے رہتے تھے اور جھکڑ انھیں لیے پھرتے تھے۔ ان

کے بارے میں معروف تھا کہ ریت اور ہوا کے بگولوں کی شکل میں چڑیلیں ڈائنیں ہیں جو چھوٹے بچوں کو پکڑ لیتی ہیں۔ بچے دوپہروں میں گھروں سے باہر آوارہ گردی کرنے نہیں نکلتے تھے۔ وہاں کے مزار، ٹھنڈے سایوں والی اندھیریا مسجد اور عیدگاہ میدان تو گویا نیر مسعود کے کسی افسانے سے نکلے دکھائی دیتے تھے، پراسرار اور دھندلے۔

''جون کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا عالم تھے جنھیں فلکیات اور فلسفے سے خاص شغف تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اُن کی تصنیف ''حقیقت المسیح'' خاصے کی چیز تھی۔ امروہہ کے شیعہ سادات عموماً بہت پڑھے لکھے عالم فاضل لوگ تھے۔ ہندوستان میں تین مقامات کے سادات معروف تھے، سادات بارہ، ساداتِ بلگرام اور ساداتِ امروہہ۔ مصحفی جیسے استاد شاعر بھی امروہہ سے تھے۔ ایک پورا تہذیبی ماحول تھا''، شکیل عادل زادہ یاد کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

علامہ شفیق حسن ایلیا کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی، رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، سیّد محمد عباس، جون ایلیا اور سیّدہ نجفی۔ علوم وفنون خاندان کی گھٹی میں تھے۔ جون کے سگے چچا زاد بھائی کمال امروہی نے کئی باکمال فلمیں بنائیں اور کہانیاں لکھیں۔ اِن میں پکار، سکندر، محل، پاکیزہ، رضیہ سلطان کا شمار یادگار فلموں میں ہوتا ہے۔

شہر میں ایک پوری تہذیب زندہ تھی۔ ایسا تہذیبی ماحول تھا جو صدیوں کے ٹھہراؤ اور رچاؤ سے آتا ہے۔ جون کا خاندان حقیقی طور پر ایک خوش حال خانوادہ تھا جس کی مناسب آمدنی اور حویلیاں تھیں۔ چار بیٹوں میں سے تین کی عرفیت تھی، رئیس امروہوی اچھن، سید محمد تقی چھبن اور محمد عباس بچھن تھے۔ سُنا ہے، عرفیت کی نسبت سے بچے بچیاں محلے کی حویلیوں کے آنگن میں نعرے لگایا کرتے تھے۔ ''اچھن، چھبن، بچھن، جون ان چاروں میں اچھا کون؟'' پھر کسی بچے کی صدا بلند ہوتی ''جون''۔ جون کی کوئی عرفیت نہ تھی۔ وہ ابتدائی دنوں میں جون اصغر کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ جون بہ یک وقت شوخ اور غم گین آدمی تھے اور اپنے آپ کو 'ابوالحزن' (دکھ کا باپ) کہتے تھے۔ جون ایلیا نام کو غلط طور پر مسیحی یا مغربی نام بھی سمجھا گیا۔ اس نام کی ماہیئت اور معنی کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے میں جون حضرت عباس بن علی المرتضیٰؓ کا لقب تھا۔ جون کا خاندان شیعیت میں فکری و عملی طور پر سرگرم تھا چناں چہ یہ مفہوم برمحل نظر آتا ہے۔ 'ایلیا' کے حوالے سے شاہد شامیر صاحب کی رائے ہے ''جون ایلیا اور مرزا غالب کے ناموں میں ایلیا اور غالبؔ کا مفہوم ایک ہے۔ لفظ 'اسرائیل' حضرت یعقوب کا لقب ہے۔ جو ایک روایت کے مطابق انھیں پینیل کے مقام پر ملا تھا۔ اسرائیل میں ایل کا معنی ہے غالب آجانا۔ حضرت یعقوب کے غالب آجانے کی وجہ سے ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ انسانی جسم میں پینیل کا مقام پائنیل گلینڈ ہے جس

کے کھلنے ہے غلبہ پایا جاسکتا ہے۔ پینیل یا پائنیل گلینڈ کو تیسری یا شیو کی آنکھ بھی کہتے ہیں۔ ایل یا ایلیا کا مطلب وہ قوت ہے جو غالب آجائے۔ اس اعتبار سے حضرت علیؓ اور حضرت الیاسؑ کے ناموں کا مفہوم بھی یہی ہے۔''

شکیل عادل زادہ فرماتے ہیں ''جب میں نے جون صاحب سے اُن کے نام میں موجود لفظ ایلیا کے مفہوم پر بات کی تو انھوں نے بتایا کہ ایلیا فن کاروں اور دانش وروں کی اساطیری بستی تھی۔''

یہ بھی ممکن ہے کہ نام میں کثرتِ معانی کے لیے دونوں مفاہیم کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہو۔

جون صاحب ابتدا سے منحنی جثّے، معدے کی خرابی میں مبتلا اور کم خوراک تھے۔ انھیں دوسروں کو ستانے میں لطف آتا تھا۔ جون اور بہن بھائیوں کو صبح ناشتے میں چائے کے پیالے میں روٹی بھگو کر دی جاتی تھی۔ وہ شرارتاً بڑی باجی (ریحانہ، بنت رئیس امروہوی) کو کہتے تھے کہ اُن کی چائے میں مکھی گر گئی ہے۔ باجی ناراض ہو کر اُٹھ کر چلی جاتیں اور جون خوب لطف اٹھاتے۔

یہ بات اُن کی بھتیجی شاہانہ رئیس ایلیا نے اپنی کتاب ''چچا جون'' میں بیان کی ہے کہ جب جون پیدا ہوئے تو انھوں نے با قاعدہ قہقہہ مارا تھا۔ بعدازاں وہ اتنے خشک مزاج اور ضدی ہو گئے کہ اُن کی اماں مارتی بھی تھیں تو وہ کہتے تھے ''میری جان نکال دو، مگر میں بات نہیں مانوں گا۔''

رئیس امروہوی کی شادی ہوئی تو جون تین برس کے تھے۔ رئیس اپنی دلہن کے ساتھ کمرے میں چلے جاتے تھے تو وہ کمرے کے دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتے اور دلہن کو توتلی آواز میں برا بھلا کہتے، دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہتے ''دروازہ کھول، میرا گھی اندر رکھا ہے۔'' اب جو دروازہ نہ کھلتا تو اُسے زور زور سے پیٹنے لگ جاتے اور چیختے ''اس عورت سے کہو، میرے بھائی کو باہر بھیجے۔''

رئیس امروہوی مراد آباد منتقل ہوئے تو دس گیارہ برس کے جون اُنھیں ملنے دیگر اہل خانہ کے ہم راہ امروہہ سے آئے۔ ایک روز جون کو خیال آیا کہ بڑے بھائی کی مدد کی جائے۔ چناں چہ انھوں نے رئیس کی کاپیاں اور رجسٹر الماری سے نکالے اور بڑی احتیاط سے اُن کے لکھے ہوئے صفحات پھاڑ ڈالے۔ اُن صفحات پر اشعار اور دیگر تخلیقی کام لکھا ہوا تھا۔ یوں جون کی نظر میں لکھے ہوئے صفحات پھاڑ ڈالنے کے بعد کاپیاں صاف ستھری ہو گئی تھیں۔ جب شام کو رئیس واپس آئے اور جون نے اُنھیں شرماتے شرماتے یہ کارنامہ سنایا اور داد کے منتظر ہوئے تو رئیس نے اپنے کام کو ضائع دیکھ کر غیظ و غضب میں زندگی میں پہلی مرتبہ انھیں تھپڑ رسید کیا۔

جون کے مزاج میں ضد کے ساتھ طنز اور لا اُبالی پن نے کچھ ایسا رنگ جمایا کہ وہ اپنی ذات میں انجمن اور فردِ واحد میں افراد ہو گئے۔ لڑکیوں سے شرمائے رہنا، اُن سے توقع رکھنا کہ وہ ان کے سامنے کچھ

کھائیں پچیں نہیں اور تصوراتی دوشیزہ اور محبوبہ کی مانند بنی رہیں، لڑکے بالوں سے بے لحاظ ہو جانا، بے وجہ مسکرانا اور بے وقت رقت طاری کر لینا ان کے مزاج کا حصہ بن گیا۔ بعض اوقات ایسی بے مروّتی طاری ہو جاتی کہ ایک دفعہ کوئی لڑکا شاعری پر اصلاح لینے گیا تو اُس کی کاپی کا شاعری والا صفحہ پھاڑ کر بولے ''میاں بالے! بھول جاؤ، یہ تمھارے بس کا کام نہیں۔ جاؤ کرکٹ کھیلو، فلمیں دیکھو، لونڈیوں سے عشق لڑاؤ مگر شاعری پر رحم کرو۔ یہ ایرے غیرے کا کام نہیں۔'' اسی طرح ایک مرتبہ گھر پر منعقد ہونے والی ادبی نشست میں ایک نوآموز شاعر نے غزل میں لفظ ''کرچی'' استعمال کیا تھا۔ یہ لفظ سن کر جون نے تحکم سے اُسے بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا تو جون نے اپنی بھتیجی ریحانہ کو آواز لگائی۔

''ریحانہ بتا، جب امروہے میں کئی دن تک لگاتار بارش ہوتی تھی تو اماں ہم سے کیا کہلواتی تھیں؟''

ریحانہ نے جواب دیا ''چھلنی میں مرچیں، بادل کی کرچیں۔''

جون ترت لڑکے سے بولے ''بالے، سنا کچھ۔ ہماری اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر اردو غلط نہیں بولتی تھیں۔ کرچی غلط ہی نہیں، بالکل غلط ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ غزل پھاڑ کر پھینک دو۔''

جون کو لڑکپن ہی سے مطالعے کی لت اور فلسفیانہ موشگافیوں میں سر کھپانے کی عادت تھی۔ تجسس اور سیکھنے کا شوق ایسا کہ اردو، عربی اور فارسی میں حقیقی طور پر رواں، انگریزی اور عبرانی کی شُد بُد، ادب، فلسفے اور لسانیات میں مہارت، دیگر علوم پر مناسب دست رس رکھتے تھے۔ بچپن سے صحت ایسی تھی کہ ہلکا پھلکا سا کھانا بھی کھا لیتے تو معدے پر ایسی گرانی ہوتی کہ صحن میں تخت پر لیٹ جاتے۔ مزاج میں مبالغہ ایسا کہ اپنے لیے وہی تاریخ پیدائش منتخب کی جو حضرت علیؓ کی تھی، یعنی تیرہ رجب۔ خود شاعر تھے، شاعری سے محبت تھی پر شاعروں سے کد تھی۔ غالب کو پچیس اشعار کا شاعر سمجھتے تھے۔ یعنی غالب نے فقط پچیس قابلِ ذکر اشعار کہے تھے۔ البتہ میر تقی میرؔ کے عاشقِ صادق تھے۔ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتے تھے۔ اپنے والد کو اپنے آپ سے بھی برتر کہتے تھے۔ اداکاری تھیٹر میں بھی فرماتے تھے اور زندگی میں بھی۔ امروہہ میں تھیٹر میں باقاعدہ اداکاری کرتے رہے تھے، پہلوانی کا بھی شوق تھا۔

ایک مرتبہ امروہے میں مشاعرہ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے، رات کا وقت۔ ہوا تھمی ہوئی تھی، حبس کا عالم کہ دم گھٹتا تھا۔ مشاعرے کے لیے شاعروں کی آمد جاری تھی۔ نوجوان شاعر جون ایلیا کا انتظار تھا۔ اتنے میں عجب حلیے کے ایک صاحب پنڈال میں داخل ہوئے۔ اس گرم رات کو انھوں نے اوورکوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور شب کی تاریکی میں سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ انتہائی سنجیدگی اور متانت سے چلتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھ گئے۔ منتظمین نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ پراسرار اجنبی جون ایلیا صاحب ہی تھے۔

امروہہ کی بہت دل چسپ روایات تھیں۔

جب مہمان کسی شادی والے گھر کرائے کی سواری پر آتے تھے تو یہ میزبانوں کی ذمے داری ہوتی تھی کہ کرایہ دیں۔ اسے شگون مانا جاتا تھا۔ البتہ اگر کسی مرگ والے گھر جایا جاتا تو کرایہ خود ادا کیا جاتا تھا۔

شاہانہ رئیس ایلیا نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک شادی کے موقع پر دلہن کو ڈولی میں روانہ کرنا تھا۔ رخصتی کا وقت آیا تو دلہن کی ماں اور بڑی بہن کی کہاروں کے ساتھ کرائے پر بحث شروع ہوگئی۔ خوب گرما گرمی ہوئی، تب جا کر ڈولی اُٹھی۔ بعد ازاں یہ عقدہ کھلا کہ ڈولی اٹھتے وقت بحث ایک قاعدہ تھا۔ بھلے طے شدہ کرائے سے زیادہ پیسے دیے جائیں پر تکرار اس تقریب کا لازمی جزو ٹھہرا۔ امروہے کے لوگوں میں فن کاری کی پذیرائی حد درجے تھی۔ ہر شخص کے اندر کا فن کار نمایاں ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھریلو خواتین شادیوں میں سہاگ لکھ لیا کرتی تھیں۔ قصہ کاری کا یہ عالم کہ ان کے آبائی قبرستان میں جون کے والد کی قبر کے پاس ایک پیڑ نما پودا تھا۔ اسے بی بی بخوئی کی چوٹی کہا جاتا تھا۔ شنید ہے کہ جب بی بی بخوئی کے لیے کسی نواب کے بیاہ کا پیغام آیا تو وہ شرمندہ ہوگئیں کہ اُن کے والد شاہ ولایت تو درویش اور صوفی آدمی ہیں۔ ایک رئیس سے بیاہ اُن کے والد کی توہین ہے۔ یہ سوچ کر کہ پیغام خود بی بی کی وجہ سے آیا ہے، وہ بہت شرمندہ ہوئیں اور دُعا کی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ دعا قبول ہوئی، زمین پھٹی اور وہ اُس میں اس طرح سمائیں کہ چوٹی باہر رہ گئی۔ وہ درخت نما پودا بی بخوئی کی وہی چوٹی تھی۔ اُس پر ایک دَور میں الائچی دانے لگتے تھے۔

گرمیوں کی توے کی طرح گرم تپتی دوپہروں میں سینگی بائی کوٹ اور ہوڑے امروہہ کی گلیوں میں پھرا کرتے تھے۔ سیاہ رنگت، سرخ آنکھیں، گلے میں رنگ برنگے منکوں کی مالائیں ڈالے سینگی بائی کوٹ جونکیں لگاتے تھے تاکہ فاسد خون نکل جائے۔ جب لوگ لُو کے لپیٹوں سے بچنے کے لیے گھروں میں آرام کرتے یا سایہ ڈھونڈتے ہوتے تو ہوڑے خاموش گلیوں میں آوارہ گردی کرتے تھے۔

لڑکپن میں جون کا تخیل بھی تصور کی گلیوں میں پھرا کرتا۔ انھوں نے ایک تصوراتی لڑکی صوفیہ کا خیال تراش رکھا تھا۔ اُسی سے عشق میں مبتلا تھے اور باتیں کیا کرتے تھے۔ تصور کی رسائی کا یہ عالم تھا کہ پسندیدہ شعرا، میر تقی میؔر کے استثنا سے سوا، قدیم بابل، فارس اور جزیرہ نُما سے تعلق رکھتے تھے اور جون فکری طور پر تبھی سے ان میں زندگی بسر کرتے تھے۔

نوعمری ہی میں جون کو پریا نام کی ایک حقیقی لڑکی سے عشق ہوگیا۔ وہ گورے رنگ کی تھی، چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ جون سے اشعار سن کر لکھ لیا کرتی تھی۔ وہ جون سے عمر میں بڑی تھی اور ایک دوسرے لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی۔ سو اُس لڑکے کو جون سے سنے اشعار لکھ بھیجتی تھی۔ جون پر تو یہ راز تب

کھلا جب اُس لڑکی کی شادی اپنے محبوب سے ہوگئی۔

محلے بھر کی لڑکیاں، بالیاں جون سے سہاگ، قصیدے، غزلیں لکھوایا کرتیں۔ جون کو دوسری محبت ایک منگنی شدہ لڑکی سے ہوئی۔ وہ بھی جلد بیاہ کر چلی گئی۔ اب جون تھے، اُن کی یادیں، شاعری تھی اور غم غلط کرنے کے ذرائع۔

اُس معاشرے میں ذاتی ملکیت پر اجتماعی ملکیت کو فوقیت حاصل تھی۔ 'میں'، 'میرا'، 'میری' وغیرہ ایسے الفاظ غیر مہذب، کرخت، پرتکبر سمجھے جاتے اور 'ہم'، 'ہمارا'، 'ہماری' اور دیگر باہمی ملکیت کے الفاظ برتے جاتے تھے۔

جون نے لڑکپن ہی میں امروہہ میں بہ طور شاعر ایک پہچان بنانا شروع کردی تھی۔ دن کو پہلوانی اور تن سازی کرتے، رات کو مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ حلیے کے علاوہ مشاعرے میں حرکات بھی جدا ہوتی تھیں۔ کھچا کھچ بھرے مشاعرے میں اشعار سناتے سناتے رُک جاتے اور کسی سامع کو دیکھ کر آواز لگاتے "ارے نذر تم...... یہاں؟ پچھلی مرتبہ تمھارے ہاں خوب لطف رہا۔ بھئی میزبانی تو تم پر ختم ہے۔ کیا خوب آم کا اچار کھلایا تھا۔"

قیامِ پاکستان کے وقت وہ اور ان کی بہن ہندوستان ٹھہر گئے تھے۔ دیگر بھائی پاکستان چلے آئے۔ رئیس امروہوی "جنگ" اخبار میں قطعات، سیاسی، سماجی کالم لکھنے لگے۔ سیّد محمد تقی ادارتی شعبے کی سربراہی پر فائز تھے۔

رئیس امروہوی کا گاندھی جی کے قتل کے دن ایک فی البدیہ قطعے سے قطعہ نگاری میں شہرت کا آغاز ہوا۔ وہ نہایت قادرالکلام شاعر تھے۔ اُنھیں چلتے پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے شعر کہنے کی قدرت حاصل تھی۔ گاندھی جی کی موت پر قطعہ انھوں نے کہا، وہ کچھ یوں تھا۔ جس نے اُمیدِ زیست تھی باندھی، لے اُڑی اُس کو موت کی آندھی، گالیاں کھا کے، گولیاں کھا کے، چل بسے اُف، مہاتما گاندھی۔

روزنامہ جنگ کے مالک میر خلیل الرحمان جو خود بھی ایک بے پناہ صحافی تھے، نے رئیس صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ ملک کے سیاسی وسماجی واقعات پر روز ایک قطعہ لکھ سکتے ہیں۔ رئیس صاحب کے ہامی بھرنے پر یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ روز ایک قطعہ، ملک کے سیاسی سماجی حالات کی ترجمانی کرتا ہوا، کبھی طنز، کبھی مزاح سے مرصّع، ایسی کاٹ کہ اللہ اکبر، کوئی شبہ نہیں، سبھی ناقد اعتراف کرتے ہیں کہ رئیس امروہوی نے قطعہ نگاری کے فن میں کیا کیا تجربے کیے۔ انھوں نے کئی بے مثال قطعات کہے پھر جنگ کے ہم عصر اخبارات نے جنگ کی پیروی میں قطعہ نگاری کو مستقل جگہ دینی شروع کردی مگر کوئی بھی رئیس امروہوی کا ہم سر نہ ہوسکا۔ کسی فن کار، قلم کار کی وفات پر ایک رسمی جملہ ادا کیا جاتا ہے کہ اُس کے خلا کا پُر ہونا مشکل ہے۔

کھلا جب اُس لڑکی کی شادی اپنے محبوب سے ہوگئی۔

محلے بھر کی لڑکیاں، بالیاں جون سے سہاگ، قصیدے، غزلیں لکھوایا کرتیں۔ جون کو دوسری محبت ایک منگنی شدہ لڑکی سے ہوئی۔ وہ بھی جلد بیاہ کر چلی گئی۔ اب جون تھے، اُن کی یادیں، شاعری تھی اور غم غلط کرنے کے ذرائع۔

اُس معاشرے میں ذاتی ملکیت پر اجتماعی ملکیت کو فوقیت حاصل تھی۔ 'میں'، 'میرا'، 'میری' وغیرہ ایسے الفاظ غیر مہذب، کرخت، پرتکبر سمجھے جاتے اور 'ہم'، 'ہمارا'، 'ہماری' اور دیگر باہمی ملکیت کے الفاظ برتے جاتے تھے۔

جون نے لڑکپن ہی میں امروہہ میں بہ طور شاعر ایک پہچان بنانا شروع کر دی تھی۔ دن کو پہلوانی اور تن سازی کرتے، رات کو مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ حلیے کے علاوہ مشاعرے میں حرکات بھی جدا ہوتی تھیں۔ کھچا کھچ بھرے مشاعرے میں اشعار سناتے سناتے رُک جاتے اور کسی سامع کو دیکھ کر آواز لگاتے "ارے نذر تُم...... یہاں؟ پچھلی مرتبہ تمھارے ہاں خوب لطف رہا۔ بھئی میزبانی تو تم پر ختم ہے۔ کیا خوب آم کا اچار کھلایا تھا۔"

قیامِ پاکستان کے وقت وہ اور ان کی بہن ہندوستان ٹھہر گئے تھے۔ دیگر بھائی پاکستان چلے آئے۔ رئیس امروہوی "جنگ" اخبار میں قطعات، سیاسی، سماجی کالم لکھنے لگے۔ سیّد محمد تقی ادارتی شعبے کی سربراہی پر فائز تھے۔

رئیس امروہوی کا گاندھی جی کے قتل کے دن ایک فی البدیہہ قطعے سے قطعہ نگاری میں شہرت کا آغاز ہوا۔ وہ نہایت قادرالکلام شاعر تھے۔ اُنھیں چلتے پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے شعر کہنے کی قدرت حاصل تھی۔ گاندھی جی کی موت پر قطعہ انھوں نے کہا، وہ کچھ یوں تھا۔ جس نے اُمیدِ زیست تھی باندھی، لے اُڑی اُس کو موت کی آندھی، گالیاں کھا کے، گولیاں کھا کے، چل بسے اُف، مہاتما گاندھی۔

روزنامہ جنگ کے مالک میر خلیل الرحمان جو خود بھی ایک بے پناہ صحافی تھے، نے رئیس صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ ملک کے سیاسی وسماجی واقعات پر روز ایک قطعہ لکھ سکتے ہیں۔ رئیس صاحب کے ہامی بھرنے پر یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ روز ایک قطعہ، ملک کے سیاسی سماجی حالات کی ترجمانی کرتا ہوا، کبھی طنز، کبھی مزاح سے مرصّع، ایسی کاٹ کہ اللہ اکبر، کوئی شبہ نہیں، سبھی ناقد اعتراف کرتے ہیں کہ رئیس امروہوی نے قطعہ نگاری کے فن میں کیا کیا تجربے کیے۔ انھوں نے کئی بے مثال قطعات کہے پھر جنگ کے ہم عصر اخبارات نے جنگ کی پیروی میں قطعہ نگاری کو مستقل جگہ دینی شروع کر دی مگر کوئی بھی رئیس امروہوی کا ہم سر نہ ہوسکا۔ کسی فن کار، قلم کار کی وفات پر ایک رسمی جملہ ادا کیا جاتا ہے کہ اُس کے خلا کا پُر ہونا مشکل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ رئیس امروہوی کے انتقال کے بعد اُن جیسا باکمال قطعہ نگار سامنے نہیں آیا۔ اخبارِ جہاں نے رئیس امروہوی کی زندگی میں اُن کے قطعات کے تین مجموعے شائع کیے تھے جو اَب نایاب ہیں۔

بھارت میں جون کے دن تنگ دستی میں گزرے۔ سیّد تقی اور رئیس امروہوی اُنھیں اخراجات کے لیے پیسے بھیجتے تھے۔ اپنی تساہل پسندی کے باعث جون نے جم کر کوئی ذریعۂ روزگار اختیار نہ کیا۔ اُنھیں اپنی ماں اور بہن کے اخراجات بھی اٹھانا تھے۔ وہیں انھیں تپ دق نے آلیا۔ جب فروری، 1957 میں کراچی آئے تو بہت بیمار تھے، خالی نظروں سے گردونواح کو تکتے رہتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا جسم تو کراچی آگیا ہے پر وہ اپنی روح امروہہ چھوڑ آئے ہیں۔

پاکستان میں رئیس صاحب 'شیراز' نامی رسالہ نکال رہے تھے۔ میری ویدر ٹاور کے نزدیک نیو کلاتھ مارکیٹ میں دفتر ''شیراز'' واقع تھا۔ شکیل عادل زادہ بھی چند روز کے وقفے سے کراچی آئے تھے۔ جون، سیّد محمد عباس اور شکیل عادل زادہ شیراز کے دفتر میں سوتے تھے۔ ایک صوفے پر تو دوسرا تخت پر لیٹ جاتا تھا۔

جون کو قریباً سوا انجیکشن لگے تو تپِ دق سے ان کی صحت بحال ہوئی۔ اب جو روزگار کے وسیلے پر سوچ بچار کی تو اپنا ایک رسالہ شروع کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت معروف بیوروکریٹ اور صاحب علم الطاف گوہر کراچی میں کمشنر تھے۔ ان کے ہاں ماہ نامہ 'انشا' کا ڈکلیریشن داخل کیا گیا۔ جس کی اُسی روز اجازت مل گئی۔ فروری 1958 میں انشا کا اجرا ہوا۔ یہ سنجیدہ نوعیت کا ایک علمی پرچہ تھا۔ دورِ حاضر میں ادبی پرچے تو باقاعدہ نکلتے ہیں جن میں چند علمی مضامین بھی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس انشا ایک مکمل علمی پرچہ تھا۔ جون بہت عمدہ اداریہ لکھتے تھے۔ ان کی نثر بھی اعلیٰ پائے کی تھی جو حبیب اشعر، مولوی عنایت اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سی نثر کی جھلک دکھلا جاتی تھی۔ جون نے اپنی جداگانہ حیثیت منوائی۔ وہ رئیس اور تقی کے بھائی کے بجائے اپنے حوالے سے پہچانے جانے لگے۔

بچپن سے جون میں سرکشانہ خو تھی، بائیں بازو سے مجنونانہ تعلق تھا اور خودمختاری کا جذبہ فزوں تر تھا۔

کراچی میں جون کا ابتدائی قیام کھارادر میں بھائیوں کے ہم راہ تھا۔ ڈیڑھ کمروں پر مشتمل دو فلیٹوں میں دونوں بھائی اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک میں رئیس امروہوی، دوسرے برابر والے فلیٹ میں سیّد محمد تقی۔ بعدازاں پورا خاندان گارڈن ایسٹ کے علاقے میں 2700 گز پر محیط ایک وسیع کوٹھی میں منتقل ہوگیا۔ یہ کوٹھی اُنھیں کلیم میں ملی تھی۔ قریب میں خوجہ جماعت خانہ تھا۔ تب کوٹھیوں کے بھی دل کش اور پرمعانی نام رکھے جاتے تھے۔ ہر مکان و بنگلے کی اپنی انفرادیت ہوتی تھی۔ کوٹھیاں اپنے عددی پتّے کے بجائے ناموں یا علامات سے پہچانی جاتی تھیں جیسے گول بنگلا، باغ والی کوٹھی وغیرہ۔ اس کوٹھی کا نام

پہلے ارسطاطالیس پھر جون کی والدہ کے نام پر نرجس رکھا گیا۔ جلد ہی وہ بنگلا ایک تہذیبی اور ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ صادقین، جوش ملیح آبادی، مجنوں گورکھ پوری، عبدالعزیز خالد، شاہد احمد دہلوی، پروفیسر احمد علی، جمیل الدین عالی، احسن فاروقی، جی الانا، سیّد ہاشم رضا وغیرہ شاموں کو وہاں با قاعدگی سے اکٹھے ہوتے تھے۔ خوب محفل آرائی اور رونق ہوتی تھی۔

منفرد شاعرہ اور ادیبہ عذرا عباس نے اُس بنگلے کی لفظی عکس گری کی ہے۔

''دروازے ہی سے ایک راستہ شروع ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں پر ختم ہوتا تھا۔ برآمدے کی بائیں طرف کسی اجاڑ باغ کی سی کوئی چیز تھی۔ ادھڑی ہوئی گھاس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک مضبوط پرانے درخت کے نیچے ایک دبلا پتلا لمبا سا آدمی چوڑے پائنچے کا سفید پاجامہ اور کُرتا پہنے کھڑا کسی دکھائی نہ دینے والی چیز کو گھور رہا تھا اور اس سے قدرے فاصلے پر لکڑی کے ایک کم زور تخت پر ایک خوب رو بیٹھا تھا۔

'یہ میرے باپ ہیں، تم نے نام تو ضرور سنا ہوگا، رئیس امروہوی۔' اس نے تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے درخت کے نیچے کھڑے آدمی کی طرف آنکھوں ہی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دماغ پر زور ڈالا لیکن ابھی میں 'ہاں' اور 'نہیں' سے نکل بھی نہ پائی تھی کہ برآمدہ بھی ختم ہو گیا۔

اِدھر اُدھر کئی کمرے آئے لیکن ان میں سے کسی میں بھی مجھے لے جایا نہیں گیا، پھر ایک لمبا کمرا اور اس کے بعد باورچی خانہ، کھانوں کی خوشبوؤں سے بھرا ہوا۔ کوٹھی کا تصور اب ضائع ہو رہا تھا۔

ہر طرف کمرے، کمروں میں تخت، تختوں پر چاندنیاں اور چاندنیوں پر گاؤ تکیے، برآمدے کا تخت سب سے بڑا تھا اور اس پر ایک بھاری پان دان بھی رکھا تھا۔ اس پر ایک خاتون بیٹھی تھیں، ریشمی غرارے اور چوڑے ریشمی دوپٹے میں ملبوس۔ پان دان، تخت اور برآمدے کا ایسا میل میں نے نہ تو پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ پھر کبھی دیکھا۔

ساری فضا کہانیوں جیسی تھی لیکن میں اس سے مانوس نہیں ہو پا رہی تھی۔ اب ہم جس کمرے کے پاس تھے اس میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی لیکن دروازے تین تھے، انھی میں سے ایک کی طرف منہ کر کے مجھے کوٹھی لانے والی نے زور سے کہا ''جون جاگ رہے ہو؟''

''ہاں بالی، سوتا کب ہوں؟ مجھے تو یاد بھی نہیں کبھی سویا بھی تھا۔'' کمرے کے ملگجے اندھیرے سے ایک غیر مانوس سی کھنکتی ہوئی آواز میں، سر کو اس طرح حرکت دیتے ہوئے ایک سائے نے جواب دیا کہ بالوں کی ایک لٹ خود بہ خود ماتھے پر آ جائے۔

اب میں جون کے سامنے کھڑی تھی، جو مجھے کوٹھی لانے والی بالی کے چچا تھے لیکن چچا بھتیجی میں ایسا کوئی تکلف نہیں تھا کہ رشتہ آڑے آتا۔ 'یہ جون ہیں، شاعر ہیں، بہت مشہور شاعر' اس نے سامنے تخت

پر بیٹھے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح بیٹھا تھا کہ گھیردار پاجامے میں یہ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ کون سی ٹانگ سیدھی ہے اور کون سی الٹی ۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے جون بالی کو کوئی شعر سنانے لگے۔ شعر سناتے ہوئے انھوں نے دونوں انگلیاں بالوں میں پھنسا رکھی تھیں۔''

جون ایلیا کی شہرت کے تین مدارج ہیں۔

پہلے درجے میں انھیں ایک صاحبِ علم شاعر، مفکر اور ماہرِ لسانیات کے طور پر کراچی کے ادبی حلقوں میں جانا جانے لگا۔

اُن کے رفیقِ دیرینہ شکیل عادل زادہ بتاتے ہیں کہ جون کے اندر تجسّس کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ دوسروں کی محبت کی داستانیں اور گھریلو اسکینڈل خوب شوق سے سنتے اور مسالا لگا کر سناتے ،علمِ نجوم، ہندسہ، دست شناسی اور ماورائی علوم سے شغف تھا، سائنسی فکر کے حامل اور روایت شکن تھے۔ دیسی کھانے کے شوقین اور مغربی لباس کے دل دادہ تھے۔ کئی زبانوں پر دست رس تھی، انگریزی میں رواں نہ ہونے پر اُداس رہتے تھے ۔ بہ قول شکیل صاحب کے ''دوا خوری ایک مستقل مشغلہ اور ضرورت بھی۔ آیورویدک، یونانی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، نفسیاتی، روحانی، ایکوپنکچر، شمسی شعائیں، ہر طریق طب سے استفادہ۔ عام لوگوں کے مشوروں پر قسم قسم کے ٹوٹکے بھی آزمائے جاتے رہے۔ مہینوں تک کچی کلیجی نچوڑ کر عرق پیتے رہے۔ چار مغز، سچے موتی، زعفران، مشک اور سونے کے سفوف سے مرکب جوارشوں کے تجربے بھی کیے جاتے رہے۔ سر پر انڈوں، کبھی جسم پر سرسوں، زیتون اور روغنِ بادام کی مالش کی جارہی ہے۔ کسی حکیم ڈاکٹر نے نسخے پر ھوالشافی لکھ دیا یا نسخے پر پہلے ہی سے کندہ ہوا ہو تو مطب سے باہر نکلتے ہی بیزاری سے کہتے ''اسے تو خود پر اعتبار نہیں سارا ذمہ تو اس نے خدا پر ڈال دیا ہے۔''

معاشی مسائل اپنی جگہ، پر جون کے ہاں مختلف المزاج صاحبانِ سخن کے ہونے سے رونق لگی رہتی تھی۔ اُن کے برادرِ بزرگ رئیس امروہوی صاحب کا ایک معمولی سا واقعہ ان کے مزاج اور حیوانات کی فطرت کی خبر دیتا ہے:

شاہانہ رئیس ایلیا ''چچا جون'' میں ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات رئیس رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ گھر میں رات کا کھانا صحن میں ہوتا تھا۔ روز رات کو کھانے کے وقت ایک کتا آجایا کرتا تھا جسے رئیس صاحب بہت محبت سے کھانا ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک رات معمول کے مطابق وہ کتا کھانے کے وقت آیا تو رئیس صاحب کی اہلیہ کسی بات پر بھری بیٹھی تھیں، انھوں نے کتے کو ڈانٹ دیا۔

''کس قدر بے غیرت ہے۔ جانے کہاں سے یہ کھانے کے وقت آمرتا ہے۔''

اُس کتے نے اِس جانب دیکھا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔ یہ دیکھ کر رئیس صاحب سے رہا نہ گیا

اور وہ افسردگی میں روٹی لیے کتے کے پیچھے پیچھے باہر چلے آئے۔ باہر انھوں نے کتے کو شفقت سے روٹی دی اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ''تم میری بیوی کی بات کا برا مت مانو۔ اسے اندازہ نہیں کہ بھوک کیا بلا ہے۔''

کتے نے سر جھکا کر روٹی اٹھائی اور وہاں سے چلا گیا۔ اُس دن کے بعد وہ کتا دوبارہ ان کے گھر نہ آیا۔

چوں کہ انشا علمی نوعیت کا پرچہ تھا سو اس کی اشاعت بہ مشکل ایک ہزار سے بڑھ پائی، لاکھ جتن کر لیے، ٹائٹل پر ٹائٹل بدلے، حسین و جمیل عورتوں کی تصویر سجائیں، ساڑھے بارہ سو سے آگے اشاعت نہ بڑھ پائی۔ اس اشاعت میں معاشی استحکام ممکن نہ تھا۔ انھی دنوں ریڈرز ڈائجسٹ کی طرز پر اردو ڈائجسٹ نکالا گیا جو بہت مقبول ہوا۔ اردو ڈائجسٹ کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے انشا کو 'انشا عالمی ڈائجسٹ' کے نام سے بدل دیا گیا۔ نتیجتاً اس کی اشاعت کچھ عرصے میں چار ہزار ہوگئی۔ البتہ پھر یہ اشاعت وہیں پر رک گئی۔ مقابلتاً اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ کی اشاعت بہ تدریج بڑھ رہی تھی۔

جون صاحب کے مزاج میں کاروباری چمک نہ تھی۔ شاعری ہی ان کا مسئلہ تھی۔ رسالے کی اشاعت جم کے رہ گئی تھی اور اس جمود میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہو رہی تو وہ بددل ہوگئے۔

انشا عالمی ڈائجسٹ سے انشا کا لاحقہ ہٹا کر عالمی ڈائجسٹ بنا دیا گیا۔

اُس دور میں ڈائجسٹوں کو (اور کچھ حد تک آج بھی) سنجیدہ ادب سے نچلے درجے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ امر بھی جون کے لیے حوصلہ شکن تھا۔

اس سے ہٹ کر محبت کے معاملے۔

اور وہ ایک لڑکی! نام تو اُس کا کچھ اور تھا۔ فرض کر لیجیے ماریا۔ داستان ہر چند فرضی نہیں ہے۔ سانولی، سلونی، دل کش خال و خد، کسی قدر سنجیدہ و متین اور عمر کے سب سے قیامت دور میں۔ وہ جو جوش صاحب کا شعر ہے ۔ مہتران ہو کہ رانی، گنگنائے گی ضرور، یہ جوانی ہے جوانی، رنگ لائے گی ضرور۔

صورت یہ تھی کہ جون صاحب کی کوٹھی سے ملحق ایک بڑی کوٹھی کی انیکسی میں اینگلو انڈین خاندان مقیم تھا۔ انیکسی کی دیوار کے ساتھ عالمی ڈائجسٹ کا دفتر بنایا گیا تھا۔ انیکسی کی کھڑکیاں دفتر کی طرف کھلتی تھیں اور اینگلو خاندان کے لوگ تاک جھانک کرتے رہتے تھے۔ جانے کیسے، کیوں کر اور کب جون اور ماریا کی رسم و راہ ہوگئی۔ جون عام نوجوانوں کی طرح بھڑکیلے، من چلے اشاروں کنایوں کے متحمل تھے نہ انھیں جذباتی قسم کی شوخیاں شعبدہ بازیاں آتی تھیں، نہ خطوط کا تبادلہ ممکن تھا۔ ماریا کو اُردو صرف بولنا آتی تھی، لکھنا نہیں، لکھنا آتی ہوگی تو بہت واجبی، نہ دوسری لڑکیوں کی طرح جون کی شاعری سے متاثر ہو جانے کا کوئی امکان تھا۔

رئیس امروہوی اور سیّد محمد تقی کلیم میں ملی وسیع و عریض کوٹھی میں آ کے بس تو گئے تھے مگر ان کے رہن سہن اور ساز و سامان سے صاف ظاہر تھا کہ سفید پوشی کا بھرم قائم کیے ہوئے ہیں۔ سید محمد تقی نے پرانی فورڈ ٹائپ کار

خرید لی تھی جس کا پیٹرول وہ پھونک پھونک کے استعمال کرتے تھے۔ پڑوسی خاندان کی لڑکیاں کبھی کبھار جون کے گھر کی خواتین سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ اِن میں ماریا بھی ہوتی تھی مگر بھرے پڑے گھر کے سامنے اظہارِ عشق کے امکانات بھی بہت کم تھے۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ کس وقت جون نے ماریا کو اسیر کیا اور کس دن ماریا نے کھڑکی سے جون پر تیر برسائے۔ جون کی کون سی ادا اُسے بھا گئی۔ ایک روز یہ انکشاف کر کے جون صاحب نے شکیل عادل زادہ صاحب کو حیرت میں مبتلا کیا کہ ماریا سے ملاقات کے لیے انھیں خلوت کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ مراد یہ تھی کہ ہو سکے تو شکیل اِس بابت کوئی حل نکالیں۔ اصرار اِس قدر شدید تھا کہ شکیل کو اپنے ایک دوست سے مدد لینا پڑی۔ خوش قسمتی سے دوست کے والدین ہندوستان گئے ہوئے تھے۔ ایک بار نہیں، کئی بار جون نے استفادۂ خلوت کیا۔ پر ماریا سے تعلقِ خاطر میں جون کے اشتیاق کا عالم وہ نہیں تھا جو اُن کے احباب نے ایسے معاملات میں دیکھا اور سنا تھا۔ جون دنیا کی ہر لڑکی سے عشق کے آرزو مند تھے اور بیک وقت کئی لڑکیوں سے۔ ایسا نہیں تھا کہ انھیں موقع نہ ملے ہوں مگر یا تو کچھ عرصے بعد وہ ہچکچانے لگتے تھے یا پیروی کے لیے وقت نہیں دے پاتے تھے یا اُن سے عشق کے پیچیدہ مطالبے، تقاضے نبھائے نہیں جاتے تھے۔ جون کو کسی مثالیے کی تلاش تھی۔ کچھ عرصے بعد اُنھیں احساس ہوتا کہ یہ تعبیر تو ان کے خوابوں، خیالوں کی ضد ہے۔ کسی کو مثالیہ نہیں ملتا اور مل جاتا ہے تو مثالیہ نہیں رہتا۔ انھوں نے کہا تھا جون کرو گے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش، اَب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے۔

جون صاحب کے لیے کوئی پری بھی آسمان سے اُترتی تو وہ کچھ مدت بعد اس میں بھی عیب تلاش کر لیتے۔ کچھ اور نہیں تو جمالیاتی عیب۔ رفتہ رفتہ ماریا بھی دور ہوتی گئی۔ جون صاحب اور اُس میں ایسی کوئی نسبت بھی نہیں تھی۔ شادی وغیرہ کے تو شاید عہد و پیمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ یہ صرف دوستی تھی اور دوستی ہی رہا کرے تو کیا اچھا ہے لیکن یہ زن وشو کی دوستیاں عموماً بھٹک اور بہک جایا کرتی ہیں۔ ماریا کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ کنارہ کشی سے نہ کسی نے ماریا کو سرگشتہ و سرگرداں دیکھا نہ جون پر جاں سوزی و جاں کنی کی کیفیت طاری ہوئی اور ہوا یہ کہ اچانک ماریا کے غریب خاندان کو ٹیکسی چھوڑنی پڑ گئی۔ بے شک اِس دوری کی جون صاحب کو توقع نہ تھی۔ ماریا کے اس طرح بچھڑ جانے کے بعد بہت دنوں تک وہ خاموش اور اداس دیکھے گئے۔ اداسی اور شکایت کے بہانے تو خیر وہ ویسے بھی ڈھونڈتے رہتے تھے۔ خود مظلومی شعار تھی۔ کسی دوست نے مشورہ دیا تھا کہ ماریا کو تلاش کرنا چاہیے۔ وہ اِسی شہر کے کسی علاقے میں گئی ہو گی۔ جون نے مشورے پر عمل نہیں کیا اور آہ وزاری پر اکتفا کی۔

یہ 65-1966 کی بات ہے۔ ایک روز جون ایلیا کو ایک خط موصول ہوا۔ سادہ سے کاغذ پر ایک لڑکی کا خط، لکھا تھا کہ وہ جون کی شاعری کی دل دادہ ہے، اُن کے بیش تر کلام کی حافظ۔ جون بہت سرشار

ہوئے۔ اُس زمانے میں ان کے گہرے دوستوں میں اسد محمد خاں، محمد علی صدیقی، راحت سعید، حسن عابد، قمر ہاشمی، انجم اعظمی، یوسف ضیغم، سحر انصاری اور انور شعور وغیرہ شامل تھے۔ سب نہیں تو چند قریباً روز ہی گھر آتے تھے اور شکیل عادل زادہ تو گھر ہی کے ایک فرد تھے۔ جون بار بار احباب کو خط دکھاتے۔ انھیں خط کی تحریر میں نہاں اصل مقصد و منشا دریافت کرنے بلکہ سراغ لگانے کی بڑی بے کلی تھی۔ لڑکی کا نام افشاں تھا۔ تحریر سے خوش ذوق، شائستہ و سنجیدہ اور تعلیم یافتہ نظر آتی تھی۔ مسلم لیگ کوارٹرز کا پتا درج تھا۔ کسی ایک کوارٹر کا پتا درج نہیں تھا۔ اتنے بہت سے مسلم لیگ کوارٹرز میں افشاں کے گھر کی نشان دہی کیوں کر ہو پاتی۔ ابھی خط کے مندرجات پر تحقیق و تفتیش کے مراحل طے ہو رہے تھے کہ دوسرا خط آ گیا، دوسرا، تیسرا، چوتھا۔ یک طرفہ خطوط کے اس سلسلے میں جون ایلیا کی شاعری ہی موضوع ہوتی۔ چند خطوط کے بعد کچھ باتیں واضح ہو گئی تھیں کہ افشاں کا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ کسی کالج میں بی اے کے سالِ آخر میں ہے اور جون کی شاعری کی شیدائی ہے۔ 'یونی ورسٹی کے حالیہ مشاعرے میں آپ کا لباس خوب جچ رہا تھا۔ یہی لباس پہنا کیجیے، شیروانی کو تو ترک کر ہی دیجیے، صحت کا خیال رکھیے، مشاعروں میں کم جائیے' صرف بڑے مشاعروں میں شامل ہونے کے تبصروں، تاکیدوں کے علاوہ جون کی شخصیت کے بارے میں اشتیاق آمیز تجسّس سے یہ امر بھی واضح تھا کہ افشاں، ایک شاعر کی شیدائی ہی نہیں، ایک نوجوان کی بھی تمنائی ہے۔ ہر اگلے خط میں یہ فریفتگی فزوں ہو جاتی تھی۔ خطوط سے یہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ افشاں نے جون کو قریب سے دیکھا ہے اور اُن کی بہت سی عادتوں، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہے۔

جون تو پہلے ہی خط سے متزلزل ہو گئے تھے، ہر خط کے بعد ان کا اضطراب سوا ہو جاتا۔ ہر نیا خط دوستوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور ایک ایک لفظ، ایک ایک سطر کے معانی و مطالب پر غور و خوض ہوتا۔ احباب آسرا دلاتے کہ دیکھنا، کسی روز اپنے پتے سے بھی آگاہ کر دے گی۔ متوسط خاندان کی لڑکیاں اپنے آپ سے بھی ڈرتی ہیں۔ دس اطراف کا انھیں خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ کسی دن اپنی سہیلی کے ساتھ وہ خود ملنے چلی آئے۔ جیسے جیسے خط آتے گئے، افشاں معما بنتی گئی۔ جون صاحب کی بے چینیاں بڑھتی گئیں اور صرف اُنھی کے لیے نہیں، ان کے سبھی راز داں دوستوں کے لیے بھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جون پر والہ و شیدا، اتنی خوب صورت تحریر لکھنے اور جون کو اتنا جاننے والی لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ سبھی کا اتفاق تھا کہ تحریر لڑکی ہی کی ہے۔ یہ اسلوب کسی مرد کا نہیں ہو سکتا۔ افشاں کے کسی خط میں شیفتگی کا کھل کے اظہار نہیں ہوتا تھا۔ سارا اظہار بالواسطہ تھا جو اُس کی ذہنی بلوغت کا غماز تھا۔ جون کے آس پاس، نزدیک و دور ہر لڑکی کی ٹوہ لی گئی۔ کسی پر شک نہیں گزرا۔ دوست تسلیاں دینے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ اِس دوران جون صاحب سے کئی غزلیں نظمیں سرزد ہوئیں۔ یہ صدمہ مستزاد تھا کہ وہ یہ تازہ کلام افشاں کو نہیں بھیج سکتے

خطوط سنبھال کے رکھے اور عرصے تک وہ حسرت و یاس سے تذکرہ کرتے رہے اور یہ راز شکیل عادل زادہ، شاعر دوست اور اُس لڑکی کے درمیان ہی محدود رہا۔ جون صاحب کے علم میں آتا تو اُن کے غم و غصے کا کیا عالم ہوتا، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ غضب ناک بھی اتنے ہی تھے، جتنے جمالی، اتنے جلالی۔

پھر یہ ہوا، جیسا کہ بہت قریبی احباب بتاتے ہیں۔ عالمی ڈائجسٹ شائع ہو رہا تھا۔ جون کھارادر سے اب کراچی کے پوش علاقے گارڈن ایسٹ کی بڑی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔ عالمی ڈائجسٹ کے ساتھ وہ آغا خان انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر جواد المسقطی کے زیرِ نگرانی عربی اور فارسی کی کچھ نادر و نایاب کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اِس سے پہلے اردو کی سب سے بڑی لغت کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ کچھ عرصہ اُردو ڈکشنری بورڈ میں بھی کام کر چکے تھے۔ انشا اور عالمی ڈائجسٹ کے ذریعے اُن کی ادبی حیثیت مستحکم ہو چکی تھی۔ کراچی میں کثرت سے ہونے والے مشاعروں کے مقبول شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا تھا کہ ایک اسکول کے مشاعرے میں انھوں نے اسکول کی کارکن زاہدہ حنا کو دیکھا۔ زاہدہ تعلیم کے ساتھ ملازمت بھی کر رہی تھیں اور گھر بھی دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے والدِ گرامی ابوالخیر صاحب علالت کے سبب خانہ نشین ہو چکے تھے۔ بڑی وضع، نستعلیق قسم کے بزرگ تھے، طبی امور سے دل چسپی، علم و ادب کے دل دادہ۔ زاہدہ گھر کی بڑی تھیں، ایک بھائی، ایک بہن اور والدہ پر مشتمل اِس خانوادے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ زاہدہ نے زندگی میں بہت محنت کی اور محنت ہی سے مقام بنایا۔ تعلیم کے دوران اُن کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، قراۃ العین کی عاشق، ابتدا ہی میں اُردو کے نام ور ادیبوں، شاعروں کو پڑھ لیا تھا۔ سانولی، خوش چہرہ، خوش قامت اور خوش شعار زاہدہ اُن بہت سی لڑکیوں سے مختلف تھیں جن سے جون کا واسطہ ہوا تھا، یار ہا تھا۔ زاہدہ حنا سے پہلی ملاقات کے بعد بات بڑھتی گئی۔ زاہدہ کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقاتیں تو کم کم ہوتی تھیں، فون اور خطوط یہ کمی دور کر دیتے تھے۔ دونوں جانب سے خطوط کا سلسلہ معمول بن گیا تھا۔ جن چند قریب ترین احباب نے یہ خطوط پڑھے ہیں؛ اُن کی رائے ہے کہ اُردو میں گنتی کے خطوط کے مجموعوں میں زاہدہ اور جون کے خطوط بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہ وجوہ ان کی اشاعت ممکن نہیں۔

ایک مرتبہ عبید اللہ علیم نے جونؔ کو ایک اطلاع سنائی جس سے وہ حواس باختہ ہو گئے۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ کسی نے زاہدہ کو خبر سنائی تھی کہ جون کی مرضی اور خواہش کے مطابق ان کا رشتہ ایک لڑکی فیروزہ کو بھیجا گیا ہے۔ دروغ برگردنِ راوی، خبر اُڑی کہ پیام کی یہ بات سن کر اور جون کی بے وفائی و بے اعتنائی کا سوچ کر زاہدہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ ظاہر ہے، خبر بے بنیاد اور جھوٹی تھی۔ خدا جانے، یہ جون کی محبت تھی، اپنے اہم ہو جانے کا احساس کہ ایک لڑکی نے ان کی خاطر اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے یا دروغ گوئی کا معاملہ کہ جون نے مایوس ہو کر کہا "ایسا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔"

زاہدہ عالمی ڈائجسٹ میں باقاعدہ لکھنے لگی تھیں، ترجمے کرتی تھیں، مضامین بھی لکھتی تھیں۔ ان کی نثر شروع ہی سے پختہ، رواں اور دل کش تھی۔ کوئی آٹھ سالہ رفاقت کے باوجود اُن کی شادی بہرحال ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ رئیس امروہوی کا خاندان تو جون صاحب کی خوشی میں خوش تھا لیکن اُدھر زاہدہ کے گھر والے خصوصاً والد صاحب آمادہ نہیں ہو پا رہے تھے۔ بہت دنوں تک حجت ہوتی رہی۔ یہ مسلک وفرقہ کا قضیہ ٹلے کہ دونوں پرعزم تھے۔ 1970 میں زاہدہ جون کی دلہن بن کے گھر میں آبسیں۔ نومبر 1969 میں شکیل عادل زادہ کی علیحدگی کے بعد وہ عالمی ڈائجسٹ کی مدیر بن چکی تھیں۔

اس بیاہ نے بعد ازاں انھیں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کیا۔ زاہدہ حنا صاحبِ طرز ادیبہ جنھوں نے سفرِ حیات میں اب تک عمدہ فکشن اور مضامین کے دو ہزار سے زیادہ فن پارے تخلیق کیے ہیں، ایک بااصول اور نظریاتی تخلیق کار بھی ثابت ہوئی ہیں۔ کئی انعامات، اعزازات اور ایوارڈ حاصل کرنے کے علاوہ سب سے بڑھ کر انھوں نے ایک تمغہ، عزت ومنزلت کا حقیقی مرتبہ پایا ہے۔

ہمارے وطن میں ادیب، شاعر، تخلیق کار عمر بھر کی محنت کے بعد عزت اور گنتی کے چند ٹکے ہی کما پاتے ہیں۔ ایسے میں قومی اعزاز اُن کے لیے حوصلہ افزائی کا اَن مول تحفہ ہوتا ہے۔ حکومتِ پاکستان نے 2006 میں انھیں پرائڈ آف پرفارمنس دینے کا اعلان کیا جسے انھوں نے اس وقت کی فوجی آمریت کے خلاف احتجاجاً لینے سے انکار کر دیا اور رَد کر دیا۔ اُن سی اور سلیم الرحمان صاحب جیسی شخصیات ہی معاشرتی ضمیر کے ماتھے پر سونے میں ڈھلا جھومر ہیں۔

1971 جون کی زندگی میں شہرت کا دوسرا درجہ لے کر آیا۔ 16 دسمبر 1971 کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا الم ناک سانحہ ہوا۔ اس آنسوؤں میں بھیگی رات کو عبیداللہ علیم نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے ان سے نظم لکھوائی۔ نظم کا عنوان تھا ''استفسار''۔ اس کا شعر تھا ''کیا اِس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار، ہر شہر تم سے پوچھ رہا ہے، جواب دو!'' اس نظم نے لوگوں کے دل چھو لیے اور یہ عوام کے جذبات کی آواز بن گئی۔ پاکستان ٹیلی وژن سب سے مقبول ومعروف ذریعۂ ابلاغ تھا۔ جون ایلیا کی شہرت خواص کے دائرے سے نکل کر عوام کے بحرِ بیکراں میں موج در موج پھیلنے لگی۔

مبالغہ جون کی سرشت میں تھا۔ شاہ نامۂ فردوسی 60 ہزار اشعار پر مشتمل ایک عالم گیر شہرت و عظمت کا حامل رزمیہ ہے۔ جون نے فردوسی کے اتباع میں 50 ہزار سطروں پر مشتمل ''نئی آگ کا عہد نامہ'' لکھنے کا اعلان کر دیا۔ کئی برس گزر گئے۔ اس عہد نامے کے ہر حصے کو لوح اور ان کی جمع کو الواح کہا گیا۔ سال ہا سال بعد جون نے دکھ سے اعلان کیا کہ بہت سی الواح چوری کر لی گئی ہیں۔ بعد میں کہا گیا کہ کئی الواح کھو گئی ہیں۔ بالآخر پانچ ہزار سطروں کی بات ہوئی اور یہ بات بھی نامکمل رہ گئی۔

زاہدہ حنا ان الواح کے ابتدائی سامعین میں سے تھیں۔ وہ رقم طراز ہیں۔

''نئی آگ کا عہد نامہ'' کی ابتدائی الواح میں ن م راشد کی جھلک نظر آتی تھی۔ 'حسن کوزہ گر'، 'اسرافیل کی موت' بہ طور خاص 'دل مرے صحرا نورد' جس میں راشد نے آگ کا ذکر سورنگ سے کیا ہے۔ وہ آگ جو پرومی تھیس نے کوہ اولمپس سے چرائی اور اس نیم حیوان دو پایہ کو دی جس کے لیے دیوتاؤں نے آگ ممنوع کر رکھی تھی۔ اسی جرأت کے سبب پرومی تھیس معتوب و مقہور ٹھہرا اور 30 ہزار برس کی سزا کاٹی۔ اسی نے آگ سے انسان کو آہن گری سکھائی، شکار کے کچے گوشت کو بھون کر کھانے کا سلیقہ عطا کیا، آگ جو اندھیری رات میں اسے بھیڑیوں اور لگڑ بگھوں سے بچاتی تھی، وہ آگ جس نے خاک کے پتلے کو انسان بنایا، اسی آگ سے چراغ جلے اور انسان پر علم و ہنر کے دروازے وا ہوئے۔ آگ جس کی تعظیم کا حق زرتشتیوں نے ادا کیا۔''

وہ دور جون کی پرگوئی کا زمانہ ہے۔ ان کے ہاں خیال اور اس کی ترسیل جداگانہ اور حقیقی نظر آتے ہیں۔ جون نے اپنی شاعری سے سیکڑوں نئے خیالات، تشبیہات اور استعارے متعارف کروائے۔ اُنھیں قبل از اسلام کا عرب اپنی اور بلاتا تھا، وہ اُس دور کے کاہنوں سے تخلیقی تحریک حاصل کرتے تھے۔ اُن کے ہاں انجیلِ مقدس، قرآنِ کریم اور دیگر صحائف کے نشانات ملتے ہیں، معتزلہ فلسفیوں کے مباحث، کانٹ، نطشے اور سارتر کے خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس علمی مرتبے ہی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو ایسا متاثر کیا تھا کہ وہ جون کی نوجوانی ہی میں اُن کی آمد پر کھڑے ہو گئے تھے۔ جون خوب جانتے تھے کہ فلسفے کی ابتدا حیرت و استعجاب سے ہوتی ہے۔ اس میں تشکیک کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ کائنات وسیع ہے اور فہمِ انسان میں آنے والے سوالات بے شمار۔ قدم قدم پر الجھنیں انسان کے قدموں سے لپٹ جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی بھتیجی شاہانہ کو سقراط کے حوالے سے اُس کے دمِ آخریں کا جملہ سنایا تھا ''افسوس کہ پیچیدہ گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے وقت تمام ہو گیا۔ ہاتھ کیا آیا؟ کچھ بھی نہیں۔''

اُن کا اپنی بھتیجی کو فلسفے کا درس دیتے ہوئے مکالمہ اُن کی ذہنی پختگی کا عکاس ہے۔

''مذہبی لوگوں کو معلوم تو ہو کہ اسلام میں فلسفے کا کیا مقام ہے۔ جب فلسفہ یونان سے دنیائے اسلام میں پہنچا تو وہیں سے ان دونوں میں ٹھن گئی اور جب غزالی نے ابونصر فارابی، ابن رشد اور ابن سینا جیسے دیو قامت فلسفیوں کی تعلیم سے انکار کیا تو شدت سے آگ بھڑک اٹھی۔''

''مگر چچا آخر دنیائے اسلام کو فلسفے سے کیوں نفرت ہوئی۔'' اُس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں، تُو نے اچھا سوال کیا۔ ایک فرانسیسی دانش ور ارنسٹ رینان تھا۔ وہ کہتا ہے کہ سامی نسل یعنی عرب مسلمان اور یہودی ایک خاص مزاج کے حامل ہیں۔ وہ نظریہ توحید کے علاوہ اور کوئی نظریہ ایجاد نہ

کر سکے۔ رینان کہتا ہے کہ سامی نسل کے ذہن میں پیچ در پیچ مسائل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سامی لوگوں کی عقل بدوی اور صحرائی ہے۔ عرب مختلف چیزوں کے درمیان ربط پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ کمال آریائی قوم کا ہے۔"

"چچا جون! رینان نے صحیح تو کہا تھا۔ اب تک یہی لگتا ہے کہ وہ واقعی رینان کے مطابق بدوی اور صحرائی ہیں۔"

"نہیں بالی، اس طرح نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو ایک خول میں بند کر دیں، یہ غلط ہے۔ مزاجی کیفیات کوئی سائنس کا علم نہیں ہے جو دو اور دو چار کے اصول پر پرکھا جا سکے۔ رینان کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ میں تجھے بتاؤں کہ عربوں نے نظریہ توحید اور علم اصول فقہ میں تنظیم فکر اور تسلسل نظر کا بہت شان دار مظاہرہ کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس علم کے ذریعے مسلمانوں نے ایک منطقی فکر پیدا کی، جس سے فیض حاصل کر کے یورپ جدید ثقافت کا بانی بن گیا۔"

"چچا جون! ہم جو عصر حاضر میں عرب مزاج دیکھ رہے ہیں، وہ تو قطعی شان دار یا مرعوب کن نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ رینان کا تجزیہ صحیح تھا۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ عام عرب کے پاس صرف دولت کی ریل پیل ہے ورنہ باقی تو کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ چچا جون! نہ اس عہد میں وہاں کوئی غیر معمولی دانش ور پیدا ہوا۔ ہم نے جو دیکھا کہ وہاں دولت کے بل پر صرف ٹھٹھول ہوتی ہے۔ ابونصر فارابی، ابن رشد، ابن سینا تھے اور بہت اہم تھے مگر بہ قول تمھارے کہوں کہ غزالی نے ان کی دھجیاں اڑا دیں۔ بہر حال اب تک جو تم نے بتایا اور پڑھایا تھوڑی بہت آگہی سے میں رینان کے ساتھ ہوں۔"

"اب میں تجھے یہ بتاؤں گا کہ امام شافعی اور ان کے شاگردوں نے علم اصول فقہ کے اصول وضوابط بنائے اور خاص توجہ سے کام لے کر انھیں باقاعدہ علم کی حیثیت عطا کر دی اور جیسا میں نے تجھے بتایا کہ یورپ نے اس علم سے فیض حاصل کیا۔ اب بتاؤ کہ تمھاری رائے کیا ہے۔"

"چچا جون! کیا علم فقہ ایک مذہبی تفکر نہیں ہے۔ تو ایسی کون سی بڑی بات ہے، میں تم سے صرف اور صرف خالص فلسفے کی وضاحت چاہتی ہوں۔" شاہانہ نے جوش وخروش سے اپنا خیال پیش کیا۔

"چلو اچھا ہے کہ تو نے شک کرنا شروع کر دیا ہے۔ مگر کسی ایک شخص کی رائے نہیں ماننی چاہیے۔ ورنہ تو فلسفہ کم مذہب زیادہ بن جائے گا۔"

تفکر ان کے معدے پر اثر انداز ہوتا رہا۔ صحت بگڑتی رہی۔ آگہی کا بوجھ اُن کی کمر توڑتا رہا۔ وہ اس وزن سے نجات کے لیے چند پالتو خبطوں سے مدد لیتے رہے۔ اہلِ دانش میں سنک اور خبط عام رہے ہیں، بحیرۂ اسود کے یونانی دیوجانس کلبی سے لے کر آرمینیا اور دلی کے سرمد تک، مزنگ، لاہور کے میراجی

سے لے کر امروہے کے جون ایلیا تک سبھی اس قافلے میں شامل رہے ہیں۔ ویسے بھی ایک مفکر سے توقع کرنا کہ وہ ولی اللہ کی صفات کا حامل ہو، ایک کھلاڑی سے فلسفے کی اُمید کرنا اور شاعر سے انسان کامل ہونے کی خواہش کرنا ایسے ہی ہے جیسے شیر سے مور کا انڈا دینے کی توقع کی جائے۔

جون کے پیٹ کا عارضہ بڑھ گیا۔ طبیب سے باقاعدہ علاج کرواتے ہوئے ایسے جملے بولتے جو اُس کی سمجھ سے بالا ہوتے۔

''ڈاکٹر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے معدے کی چھت گر گئی ہے اور اس کے ملبے میں میری بھوک دفن ہوگئی ہے۔''

''ڈاکٹر میری نیندوں کے پرندے میری آنکھوں کے گھونسلوں سے اُڑ گئے ہیں۔ بہتیرا دانہ ڈالتا ہوں مگر کم بخت واپس ہی نہیں آتے۔''

ایک مرتبہ تو شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے کہنے لگے۔

''ڈاکٹر میرے ذہن میں یہ آندھیاں سی کیوں چلتی رہتی ہیں۔ یہ تو آندھیوں کا موسم بھی نہیں۔ ہمارے امروہے میں تو جب آم کا موسم ہوتا تھا تو آندھیاں چلتی تھیں اور ٹپ ٹپ آم گرتے تھے۔''

یہ باتیں سادہ مزاج طبیب کے سر سے گزر جاتیں۔ البتہ صاحبان ادراک پر ضرور کھل کھل جاتیں۔

مترجم، افسانہ نگار اور شاعر صغیر ملال نے جون پر لکھتے ہوئے ان کی بھید بھری شاعری اور خیالات کو انوکھے انداز میں تشبیہ اور مقولے کی مدد سے بیان کیا۔

''ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے جنگ ہار گیا۔ فتح مند بادشاہ نے شکست خوردہ حریف کو محل کے ستون سے باندھ دیا۔ جب اس کی ملکہ پابہ زنجیر اس کے سامنے سے گزری تو وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ملکہ کے بعد فتح کے نشے سے چور سپاہی اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کو بالوں سے گھسیٹتے لے گئے، تب بھی اس کی آنکھیں خشک رہیں لیکن کچھ دیر بعد جب اس نے دیکھا کہ اس کے غلام کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں اور جیت جانے والے، اسے بھی زدوکوب کرتے لے جا رہے ہیں تو اچانک وہ رونے لگا، چیخنے لگا اور اپنا سر ستون سے پٹخ پٹخ کر لہولہان کر لیا۔''

یہ قصہ آج تک مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہوا لیکن جب بھی یہ واقعہ ذہن سے گزرا ہر مرتبہ محسوس ہوا کہ اس میں اَن گنت پیغامات، معانی اور اشارے ہیں۔

نطشے نے زرتشت کی زبانی یہ بھی کہا ''مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ وہ اپنے پانی کو گدلا کر دیتے ہیں تا کہ تہ او جھل ہو جانے کے باعث وہ گہرے معلوم ہوں'' لیکن جون ایلیا کے خیالات تو مٹیالے بھی نہیں۔ اس کے سلیس الفاظ کی شفاف سطح سے، تہ میں پڑی سیپیاں جھل مِل کرتی نظر آتی ہیں مگر انھیں

چھونے کی کوشش کرنے والا لذت اور اذیت کے طوفانوں سے گزرتا ہے۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟۔

ایک مرتبہ جون ایلیا نے کہا کہ ''لکھنا لکھانا دراصل غیر فطری کام ہے۔ اس لیے تمام باشعور ادیبوں کو لکھنے سے دست بردار ہو کر محض بولنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔'' یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ منطقی اعتبار سے اس کی بات درست تھی۔ بولنا فطری اور لکھنا غیر فطری ہے۔ ٹالسٹائی بھی ''جنگ وامن'' جیسے ناول سے دنیا کو ششدر کرنے کے بعد کچھ اسی طرح کے خیالات میں ڈوب کر خاموش ہو گیا تھا۔''

دوستوں کی ایک محفل میں تہذیب وتمدن پر بحث جاری تھی۔ جون کہنے لگے ''سمندروں کے کنارے تجارت اور معیشت پروان چڑھتی ہے، دریاؤں کے کنارے تہذیب۔'' کیا بامعنی جملے میں پوری فکر سمودی۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ''ہم ایک ہزار سال سے تاریخ کے دستر خوان پر بیٹھے حرام خوری کر رہے ہیں۔''

نقرے بازی اور کلیے وضع کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ کیا چست اور شان دار فقرے اور کلیے تخلیق کرتے۔ ان کے نثری مجموعے 'فرنود' میں ایسے بے شمار جملے ملتے ہیں جو انھی کا خاصہ ہیں۔ لکھتے ہیں ''اگر آپ کامیاب عشق کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک غیر عاشق اور عاقل قسم کا آدمی ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت عیار اور گھٹیا شخص۔'' ایک پُرمعانی جملہ ہے ''کوئی جنازہ کبھی تنہا نہیں اُٹھتا، اُس کے ساتھ کئی جنازے اُٹھتے ہیں۔'' اسی طرح ایک پیچیدہ گتھی کو جملے میں بیان کر دیا ''اسلام ایک نظامِ حیات ہے اور فلسفہ وجود کی مطلق و مجرد بحث کا نام ہے۔ اسی لیے فلسفہ مسلمانوں میں آ کر فنا ہو گیا۔''

ایک جانب جون کی فکر جولانی پر تھی، دوسری جانب سنک بڑھ رہی تھی۔

اُن کے مزاج کی آزادروی، احباب کے ساتھ تسلسل سے بسر کی گئی شامیں اور معاشی ذمّے داریوں سے روگردانی شادی پر آنچ لے آئیں۔ بچوں کو نظر انداز کیے جانے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چشم کشا امر تو یہ ہے کہ تمام تر شاعرانہ مزاج اور دل پھینک اطوار کے باوجود شادی کے دوران جون زاہدہ سے مکمل وفادار رہے۔ اُن کا اور زاہدہ کا بیاہ آگ اور پانی کا ملاپ تھا۔ اب ایسا موقع آ گیا تھا کہ یا تو پانی نے آگ کو بجھا ڈالنا تھا یا آگ نے پانی کو خشک کر دینا تھا۔

بالآخر وہ وقت آ گیا جب زاہدہ نے جون صاحب سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ان کے احباب کا کہنا ہے، یہ مطالبہ جون پر بجلی کی کڑک کی طرح ٹوٹا۔ انھوں نے اپنی سی بھرپور کوشش کی، منت سماجت اور ناراضی اختیار کر کے دیکھ لی۔ پر یہ علیحدگی قسمت کے صحائف پر رقم ہو چکی تھی۔ اس طرح یہ جوڑی ٹوٹ گئی۔

طلاق کے بعد جون کی زودرنجی بڑھ گئی اور توہم پرستی بھی۔ توہم پرست تو وہ شروع سے تھے۔ اکیلے میں گھٹنوں کے بل کچھ پڑھتے رہتے، پھر کھڑے ہو کر زیرِ لب پڑھنے لگتے۔ لکھنے سے پہلے گیارہ کا ہندسہ لکھا کرتے تھے۔ غم گینی ان کی سرشت میں تھی۔

وہ اکثر رات کو جذباتی کیفیت میں رئیس امروہوی کی قدِ آدم تصویر کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے، روتے تھے اور اپنے بال نوچتے ہوئے بڑے بھائی کو ملامت کرتے ہوئے کہتے تھے" تو کیوں مر گیا، تو ڈراما باز ہے۔ جان کر ڈرامے کا اختتام ایسے کیا کہ سب تڑپ کر رہ گئے۔"

علیحدگی کے بعد جون نے مزاروں پر جانا شروع کر دیا۔ دِلّی میں نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر گئے تو دن بھر وہیں پڑے رہتے۔ کراچی سے لے کر سیہون تک اور لاہور سے لے کر دِلّی تک مزاروں کا طواف کرنا عادت سی بن گیا۔ پر دل کی بے قراری کو قرار نہ آتا تھا۔

ایک روز دن بھر شہر گردی کر کے جون گھر آئے تو اُن کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے جسم سے خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ کہنے لگے۔

"میرا بکسا تیار کر دے، میں جا رہا ہوں۔"

پوچھا گیا۔"کہاں جا رہے ہو؟"

انھوں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا"میں، میں امروہہ جا رہا ہوں۔ اماں اور ابا کے پاس۔ میں اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ میں برباد ہو گیا۔ مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔"

بہت دیر بعد جون کا یہ جنون تھما۔

چند برس آہ وزاری، کچھ سال اداسی اور مزید گنتی کے برس آس میں گزر گئے۔

یہ آس ایک اور بیاہ رچانے کی، ایک اور رومان لڑانے کی تھی۔

ہر دوسرے شخص سے درخواست، التجا، تقاضا کرتے کہ ان کا بیاہ کروا دیا جائے۔ جلد ہی ان کی یہ خواہش معروف ہو گئی۔ اُن کی چند مداح لڑکیوں، بالیوں اور خواتین نے اس خواہش کا فائدہ یوں بھی اٹھایا کہ شاعری کی اصلاح لی، اپنے وقت کے اہم شاعر کے ساتھ گپ شپ میں وقت بِتا کر یادوں کے تتلی گھر میں لمحات کی چند تتلیاں سجائیں اور اُڑن چھو ہو گئیں۔

اُن میں سے ایک لڑکی گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ کوئی اور بیچ میں آن بیٹھتا تو جون باقاعدہ شرما جاتے۔ آخر کو بڑی عمر کے لڑکے ہی تو تھے۔

آہستہ آہستہ وہ لڑکی ان کی زندگی میں پوری طرح داخل ہو گئی۔ جون کو زکام ہوتا تو ادرک اور دار چینی کی چائے بناتی، جون اُداس ہوتے تو دِل لبھاتی۔

اہلِ خانہ کا خیال تھا کہ وہ جون کے ساتھ اپنا نام منسوب کر کے مشہور ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن شاہانہ ٹہلتی ہوئی جون کے دفتر جا نکلیں تو وہاں اُس لڑکی کو جون کی کرسی کے پیچھے یوں کھڑا پایا کہ وہ ان کا سر دبا رہی تھی۔ بھتیجی نے چچا سے پوچھا کہ اُنھیں کیا ہوا تو وہ لڑکی بول اُٹھی۔

''جون صاحب کے سر میں درد ہے۔ باجی مجھے تیل لا دیجیے۔ میں ان کے سر میں مالش کر دوں۔''

بھتیجی اندر چلی گئی تو جون گھبرائے ہوئے پیچھے پیچھے آئے اور بولے ''باؤلی ہو گئی ہے، میرے سر میں تیل کی مالش کرے گی تو اُسے معلوم ہوگا کہ میرے سر میں جوئیں ہیں، تو واپس مت آنا۔''

وہ لڑکی جون کو اپنے گھر سے لائے ہوئے کھانے نوالے بنا بنا کر کھلاتی اور جون شرماتے ہوئے فرماں برداری سے کھاتے جاتے۔

دونوں خوب بن ٹھن کر ادبی محافل میں جاتے۔

جون جو ہر کسی سے اپنی شادی کا کہتے تھے، اس لڑکی سے بیاہ کا کسی کو نہ کہتے تھے۔ غالباً جون خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ تعلق کم زور پڑنے لگا۔ دونوں کی عمروں میں تیس برس کا فرق تھا۔ ابتدائی چمک ماند پڑی اور غیر محسوس انداز میں یہ تعلق دوستی سے ہوتا ہوا شناسائی تک آیا اور اجنبیت پر ختم ہو گیا۔

جون کی شہرت کا آخری درجہ ان کی شاعری کی پہلی کتاب ''شاید'' کی اشاعت کے ساتھ آیا۔ یہ تیسرا درجہ تھا۔ اب وہ صاحبِ کتاب تھے۔ اس سے پہلے ان کا کلام بکھرا ہوا تھا، سو اسے با قاعدہ تعارف مل گیا تھا۔ اُن کا پہلا مجموعہ کلام 1990 میں تب سامنے آیا جب وہ قریباً ساٹھ برس کے ہو چلے تھے۔

اس تاخیر کی بھی ایک وجہ تھی۔

جون نے اپنے والد علامہ شفیق حسن ایلیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بڑے ہو کر والد کی تخلیقات کو شائع کروائیں گے۔ والد کی وفات کے بعد، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے سارے مسودات کھو گئے۔ والد کی تصانیف نہ چھپوا سکنے کا جون کو بہت احساس تھا۔ ندامت کے اسی احساس نے جون کو ان کا اپنا کلام شائع کروانے سے روکے رکھا۔

چند ستم ظریف اس کا پہلوئے دیگر بھی کھوج نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جون نے والد سے وعدہ کیا تھا کہ بڑے ہو کر وہ ان کا کام شائع کروائیں گے۔ جون تو ساری عمر بڑے ہوئے ہی نہیں۔ وہی من چلے انداز اور بانکپن کی زندگی۔ سو اگر انھوں نے وعدہ ایفا نہیں کیا تو اس کی مدلل وضاحت موجود تھی۔ جون کے آخری ایام کے حوالے سے شکیل عادل زادہ فرماتے ہیں۔

''آخر میں شراب کی کثرت اور شراب بھی سستی یا جو بھی میسر آ جائے۔ ڈاکٹروں کی تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ سب کو یقین دلاتے تھے اور اپنے آپ کو بھی۔ ''بھیا! اللہ پاک کی قسم، ٹیسٹوں میں جگر ایسا صاف آیا ہے جیسے کسی بچے کا ہو۔'' اُن کی قریبی عزیزہ کا بیان ہے۔ ایک رات سردیوں کے موسم میں سلگتی

سگریٹ ہاتھ میں تھی۔ بستر پہ آئے تو نیند نے آلیا۔ گھر میں کپڑا جلنے کی بو پھیلی تو افراتفری سی ہوگئی۔ اُن کے کمرے میں جاکے دیکھا تو رضائی جل رہی تھی۔ دھویں سے کمرا اَٹا ہوا تھا۔ وہ تو جانیے، بس خیر ہوگئی۔ دمے کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ کبھی کبھی تو بڑی شدت ہو جاتی تھی۔ اِن ہیلر سے سانسیں بحال کرتے تھے۔ حساب کتاب میں صفر، پیسے پاس رکھنے سے بے نیاز۔ آخری برسوں میں جائداد کی فروخت سے ایک بڑی رقم ملی۔ رقم کی نگرانی کے لیے ایک دوست پر اعتماد کیا اور کچھ غلط نہیں کیا۔ ایک روز مجھے فون کیا۔ کہنے لگے" اِن دنوں تجھے کچھ پریشان محسوس کیا ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟" سب رنگ کی عدم تواتری سے اُس وقت میرا ہاتھ واقعی تنگ تھا۔ میں نے جھجک کی تو بولے" جانی! میری باری بھی تو آنی چاہیے۔ جلدی سے فرماؤ، سرِ دست کتنے میں کام ہوسکتا ہے؟" انھوں نے دوسرے دن مجھے چیک بھجوادیا۔"

آخری عمر میں جون کو دو بہت مخلص دوستوں کی قربت میسر رہی۔ یہ اُن کی خوش نصیبی تھی اور ان احباب کی بھی۔ ایک خالد احمد انصاری ہیں جنھوں نے جون کی وفات کے بعد ان کے تین شعری مجموعے "گمان"، "لیکن" اور "گویا" شائع کر کے ان کلام محفوظ کرلیا اور ان کی نثر کو بھی۔ جون کے شاہ کار مقالوں کی کتاب 'فرنود' کی اشاعت کا بھی خالد انصاری نے اہتمام کیا۔ ناقدین کی رائے میں یہ ایک بے پناہ نثری مجموعہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کردیا کہ مخلص اور جاں نثار دوست صدقۂ جاریہ ہوتے ہیں۔

دوسرے دوست علامہ کرار تھے جن کے گھر جون نے آخری ایام گزارے اور ایک طویل نظم 'نئی آگ کا عہد نامہ' پر مبنی کتاب 'راموز' نے وہیں تخلیق پائی۔ وہ جون کے عزیز تھے، بیماری میں اُن کا علاج کروایا، اُن کی دولت کی حفاظت کی اور جون کی وفات بہ روز 8 نومبر 2002 کے بعد جنازہ بھی ان کے ہاں سے اُٹھا۔

بعدازاں انھوں نے جون کی ایک ایک پائی اُن کی اولاد کو بہ حفاظت یوں سونپ دی جیسے ایک بھاری ذمے داری سے عہدہ برآ ہوئے ہوں۔

زمانۂ حال میں ایسے لوگ نایاب ہیں۔

جون صاحب جس دنیا سے تھے وہیں لوٹ گئے۔ 'گمان' ہوتا ہے، 'شاید' جون، رئیس، تقی اور عباس صاحب کے ہم راہ اوپر اندر سبھا سجائے بیٹھے ہوں۔ 'گویا' وقت تھم چکا ہو، کراچی کی کوٹھی 'نرجس' ہی میں وقت منجمد ہو 'لیکن' جب آسمانوں کے اس مقام پر ان کی محفل سے کوئی گزرے گا تو یقیناً جون اُسے پکاریں گے 'جانی! ذرا برف لے کر آنا'۔

یادگار

محمد منشا یاد
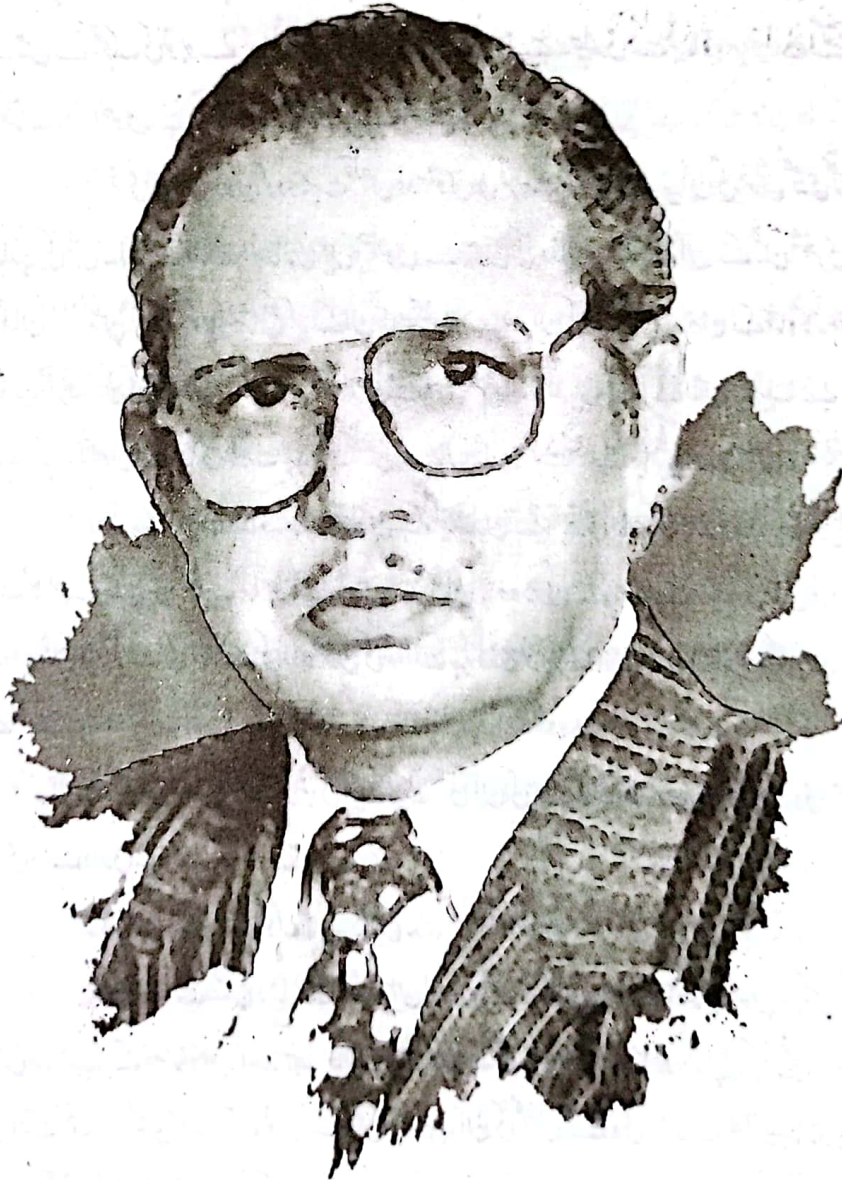
ایک طالب علم کو آرٹ اسکول میں داخلے سے انکار، تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی جنگ کا باعث بن جاتا ہے۔ طالب علم کا نام ایڈولف ہٹلر ہے۔ آرٹ کے شعبے میں ناکامی کے سبب وہ سیاست کی جانب آتا ہے اور دہشت کی علامت بن کر اُبھرتا ہے۔ ایک طالب علم معاشیات میں تعلیم حاصل کرنے برطانیہ جاتا ہے، یک دم ارادہ بدل کر والد کی خواہش کے برعکس قانون میں داخلہ لے لیتا ہے اور ایک مملکت کا بانی قرار پاتا ہے۔ اس طالب علم کا نام محمد علی جناح ہے۔ ایک جرنیل اور راہ نما تاش کی بازی کھیل رہا ہوتا ہے کہ اسے ایک دیہاتی ملنے آتا ہے۔ وہ شخص دیہاتی سے ملنے سے انکار کر دیتا ہے۔ دیہاتی کاغذ کے ٹکڑے پر شکستہ لکھائی میں ایک پیغام لکھ کر چلا جاتا ہے۔ جرنیل کاغذ کا ٹکڑا پرے پھینک کر تاش کے پتے پھینٹنے لگتا ہے۔ اُس رات غیر متوقع طور پر دشمن حملہ آور ہو کر فتح یاب ہو جاتا ہے اور تاریخ عالم کا دھارا بدل جاتا ہے۔ حملہ آور کا نام ابراہم لنکن ہوتا ہے اور اُس کاغذ کے ٹکڑے پر اُس کے حملے کی قبل از وقت اور ہم دردانہ خفیہ اطلاع ہوتی ہے۔

حیران کن حقیقت یہ ہے کہ ترپال کی چند چادروں کی عدم دست یابی ہندوستان کی تاریخ بدل دیتی ہے۔ انیس سالہ سراج الدولہ انگریز کی پیش قدمی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ فرنگی کو کلکتے میں قدم مضبوط کرنے، ٹھکانا بنانے اور کاروباری مرکز سے بڑھ کر عسکری مرکز بنانے سے منع کرتا ہے۔ وہ نہیں مانتے تو کلکتے پر بھرپور حملہ کر کے انگریز کو شکست دیتا ہے، اس کے 146 فوجی قیدی بناتا ہے اور انھیں چھوٹے سے قید خانے میں ٹھونس دیتا ہے۔ انتقامی طور پر پانچ سو انگریز فوجی، اڑھائی ہزار مقامی سپاہیوں اور آٹھ توپوں کے ہم راہ دوبارہ کلکتے پر قبضہ کرتے ہیں اور پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ کے مقابل ہوتے ہیں۔ سراج الدولہ کے پاس 35 ہزار پیادہ فوج، 7 ہزار گھڑ سوار مسلح سپاہی اور 53 توپیں موجود ہیں۔

جنگ سے ایک رات پہلے گرج چمک کے ساتھ بارش ہوتی ہے، انگریز بارود کو ڈھانپنے کے لیے ترپال کی چادریں لائے ہوتے ہیں، سراج الدولہ اس چھوٹے سے معاملے کی پیش بندی نہیں کر پاتا اور ترپال کی چادریں لانا بھول جاتا ہے۔ نتیجتاً اُس کا بارود پانی میں مل کر کیچڑ ہو جاتا ہے اور جنگ کے روز پھس پھسا جاتا ہے۔ جب کہ دشمن کی قلیل تعداد کی توپیں آگ اُگلتی ہیں۔ سراج الدولہ کی فوج ریت کی دیوار کی طرح ڈھینے لگتی ہے۔ سراج الدولہ کا جرنیل میر جعفر دس ہزار سپاہی کے ساتھ بنگال کی نوابی کے لالچ میں عین میدانِ جنگ میں انگریز سے جا ملتا ہے اور حقیقی معنوں میں مسلم اقتدار کے خاتمے کا آغاز ہو جاتا ہے۔

عالمی سطح کے معاملات برطرف، ایک خطے میں پرَ پھڑ پھڑاتی تتلی دوسرے حصے میں طوفان کا باعث بن جاتی ہے، اکلوتا بیج ایک پورے جنگل کی بنیاد رکھ دیتا ہے، اندھی گولی چلتی بس کے ڈرائیور کو زخمی کر کے بڑے حادثے کا باعث بن جاتی ہے اور پیامِ محبت غلط ہاتھوں میں پہنچ کر غارت گری پر منتج ہوتا

ہے۔ وہ تو پھر مقامی سطح کا ایک چھوٹا سا واقعہ تھا۔ ٹھانستر کے محمد جوگی کے بیٹے نذیر کے مویشیوں کا پاڑ کے پار دوسروں کی ملکیت ساگ کے کھیت میں چلے جانا ایک چھوٹا سا واقعہ تھا، روزانہ ہونے والے عام زندگی کے ہزاروں معمولی واقعات میں سے ایک، پر اس واقعے نے اردو ادب کو پہلے کی نسبت زیادہ بارآور اور باثروت کر دیا۔

ماجرا کچھ یوں ہے کہ خالص گوڑھی دیسی زبان میں ٹھٹھا گاؤں یا چھوٹی بستی کو کہتے ہیں، دو ٹھٹھوں کے درمیان خطِ تقسیم کو پاڑ کہتے ہیں۔ یہ دوسری جنگِ عظیم سے چند برس پہلے کی بات ہے کہ ضلع شیخوپورہ میں فاروق آباد کے نزدیک ٹھٹھا علی میں نذیر نامی ایک چرواہا مویشی چرا رہا تھا۔ اُس نے تیسری جماعت کے بعد تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا تھا، کھیتوں، کھلیانوں، چراگاہوں اور جنگل میں مویشی چراتا تھا، لوک گیت اور ماہیے ڈھولے گاتا تھا۔ ایک روز اتفاقاً اُس کا ایک مویشی پڑوسی کھیت میں بھٹک کر چلا گیا۔ وہاں دو جوان لڑکیاں ساگ توڑنے آئی ہوئی تھیں۔ وہ لاٹھی لیے جان وَر کو واپس ہانکنے کے لیے گیا تو اُن میں سے بڑی لڑکی اُسے بُرا بھلا کہنے لگی۔ دوسری چھوٹی لڑکی خاموش رہی۔ پس اُس نے اتنا کہا ''جانے دو آپا، اس بے چارے کا کیا قصور۔'' لڑکی کی آواز میں کچھ ایسا سلیقہ اور نرمی تھی کہ نذیر کے دل کو اپنی کومل پوروں سے چھو لیا اور یہ جملہ اُسے کئی روز تک سنائی دیتا رہا۔ خالص دیہی ماحول کے قدرتی کھردرے پن میں شائستگی کی یہ ریشم کم کم تھی۔

نذیر نے اپنی ماں سے اُس لڑکی کا تذکرہ کیا۔ ماں اُس خاندان کو خوب جانتی تھی اور پسند کرتی تھی۔ اُس نے بیٹے کی پسند پر صاد کیا اور رشتہ مانگنے چلی گئی۔ یوں کھیتوں کھلیانوں، سرسوں، بیری، آم، پیلو، شہتوت اور دیگر نباتات میں بسے، دیسی گھی اور گڑ کی مہک میں مہکتے گاؤں میں نذیر اپنی دلہن لے آیا۔ بعد ازاں اُن کے ہاں عیدالفطر کے روز ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام باپ اُس روز کی مناسبت سے عید محمد رکھنا چاہتا تھا پر ماں کے اصرار پر محمد منشا رکھا گیا۔ یہ وہی محمد منشا یاد ہے جس نے بعد ازاں دو سو سے زائد شان دار افسانے، ٹی وی ڈرامے، پنجابی ناول، لاتعداد مضامین اور غیر مطبوعہ خودنوشت لکھی۔ اس نے حلقۂ اربابِ ذوق اسلام آباد کی بنیاد رکھی اور شہرِ نو میں ادبی سرگرمیوں کا مدارالمہام ٹھہرا۔ تمغۂ حسن کارکردگی سمیت کم و بیش دو درجن اعزازات اپنے نام کیے۔ نام سے خیال آیا کہ اُسے ضمیر جعفری نے محبت سے ''حسبِ منشا'' کا نام دیا تو ایک اور دوست نے مصرع کسا ''منشا جی اٹھو اب کوچ کرو۔'' ایک بار شان دار افسانہ نگار نیلوفر اقبال کے ہاں احمد فراز نے مصرع پھینکا ''اللہ کی مرضی تھی کہ منشا نہ رہا یاد'' قریب میں بیٹھے احمد ندیم قاسمی صاحب نے درستی کرتے ہوئے کہا ''اللہ کی مرضی ہے کہ منشا ہی رہے یاد۔'' اس پر منشا یاد نے مسکراتے ہوئے گرہ باندھی ''فراز صاحب یہ فرق ہوتا ہے۔''

اُن کے افسانے ’تماشا‘ کے بارے میں معروف ثقہ نقاد مظفر علی سیّد نے کہا تھا کہ اسے پریم چند کے ’کفن‘، منٹو کے ’ہتک‘، ’بابو گوپی ناتھ‘، ’بُو‘ اور بیدی کے ’گرہن‘ اور ’الٰہ آباد کے حجام‘ کے ساتھ نہیں تو فوراً بعد ضرور رکھا جا سکتا ہے۔

بے مثال دانش ور سبطِ حسن نے منشا کے بارے میں کہا تھا ”کاش آپ یورپ کے کسی گم نام گوشے ہی میں پیدا ہوتے اور وہاں کی کسی معمولی زبان میں لکھتے تو صلہ اور ستائش دونوں اعتبار سے آپ کے لیے کتنا اچھا ہوتا، اور آپ لکھتے ہیں اُردو میں جو مشرق کے پس ماندہ ملکوں کی ”پس ماندہ“ زبان ہے لہٰذا ”مہذب اور ترقی یافتہ“ دنیا آپ کے فن پاروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھے، آپ کسی یورپی زبان میں یہی افسانے لکھتے تو اب تک درجنوں زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہوتے۔“

انتظار حسین اپنے مزاج کے برخلاف منشا کے بارے میں لکھنے پر مجبور ہوئے ”منشا یاد میں ایک بات ایسی ہے جو صرف اچھی لڑکیوں میں پائی جاتی ہے کہ ایک بار ملنے کے بعد دوبارہ ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔“

اشفاق احمد کے اندر کے داستان گو نے ان لفظوں میں پذیرائی کی ”ہمارے استاد بتاتے تھے کہ ہنچ بیک آف ناٹرے ڈیم کی کردار نگاری سب سے آسان ہے۔ وہ ٹیڑھا ہے، بدنما بھی ہے اور کم عقل بھی۔ احساسِ کم تری کا مارا ہوا اور حسرتوں سے بھرا ہوا۔ ایسے کردار پر جو بھی لکھو وہ درست ہوگا، صحیح بیٹھے گا۔ کچھ قاری کے تجربے سے گزرا ہوگا، کچھ اُس کے گمان میں آ جائے گا۔ پر آسان کرداروں کے بارے میں لکھنے اور پڑھنے والے کو ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل کام ہے۔ اس معاملے میں منشا بہت سمجھ دار ہے۔ وہ مشکل راستوں سے اِس طرح گزر جاتا ہے جیسے کائی لگے دریا کے کنارے سے مُرغابی گزر جاتی ہے، کبھی اوپر سے تو کبھی بیچ سے گلے ملتی ہوئی۔“

میری منشا صاحب سے چھے ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات اُن کے گھر پر ہندوستان سے آئے مہمانوں کے اعزاز میں دیے ہوئے عشائیے میں معروف و مستند ادیب محمد عاصم بٹ کے ساتھ ہوئی اور آخری اُن کے جنازے پر۔ پہلی ملاقات میں وہ بول رہے تھے اور میں خاموش بیٹھا رہا تھا اور آخری ملاقات میں وہ خاموش تھے۔

منشا صاحب بہ یک وقت قدیم و جدید کا امتزاج تھے۔ اُن کے دیہی پس منظر نے اُن کی شخصیت پر اَن مٹ چھاپ لگا رکھی تھی اور یہی تعلق ان کے افسانوں میں بار بار اُبھر آتا ہے۔ وہ سی ڈی اے اسلام آباد میں انجینئر کے طور پر ملازمت کرتے تھے، کوٹے میں ملے پلاٹ پر گھر قسط وار تعمیر کروایا اور اسے ایک طرح سے ادبی بیٹھک اور ٹی ہاؤس کا درجہ مل گیا۔ ابتدا میں گھر کی زمینی منزل تعمیر کروائی جہاں اہلِ خانہ مقیم تھے، بعد ازاں

خود اوپر کی منزل پر وسیع وعریض کمرے میں منتقل ہو گئے، جہاں ابتدائی دنوں میں سیمنٹ کے پلستر کی تعمیراتی بو فضا میں بسی رہتی۔ سامنے ایک بڑا جدید ٹی وی رکھا ہوتا جس پر درجنوں چینل آتے تھے، بہ یک وقت کئی چینل بھی اسکرین پر آ جاتے تھے۔ تہ بند میں ملبوس، سر پر صافہ رکھے یوں نیم دراز ہوتے جیسے ابھی کھیتوں سے آئے ہوں، کوئلے کی انگیٹھی دہک رہی ہوتی، ساتھ میں حقہ پڑا ہوتا، گڑ آمیز کڑوا تمبا کو منشا صاحب گڑ گڑاتے حقے کے کش پہ کش لگاتے جاتے۔ قریبی میز پر اسموکنگ پائپ بھی دھرے ہوتے۔

کبھی یوں بھی لگتا تھا، وہ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اُنھیں کس راہ کا انتخاب کرنا ہے۔ کمپیوٹر پر رواں تھے، اپنی ویب سائٹ بنا رکھی تھی، ایک معاون کو علمی وادبی کاموں، ڈاک کی ترتیب و ترسیل، خط و کتابت اور دیگر کاموں کے لیے باقاعدہ مشاہرے پر ملازم رکھا ہوا تھا۔ گھر میں ایک دفتر بنایا ہوا تھا جس میں رسمی طور پر یوں تیار ہو کر آتے جیسے کوئی پروفیسر اپنے دفتر آتا ہے، وہاں مسودے ٹھیک کرتے، علمی وادبی خط و کتابت اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس طرح کی منظّم زندگی گزارنے کے باوجود وہ ناول نگار کیوں نہیں بنے" محمد عاصم بٹ کہتا ہے۔

منشا صاحب ایک سلجھے ہوئے سیانے آدمی تھے۔ اُن کے گھر پر باقاعدگی سے ادبی نشستیں، محفلیں، ظہرانے اور عشائیے ہوتے تھے۔ گھر میں ایک سکون اور ٹھہراؤ تھا جو خوش گوار ازدواجی زندگی کا آئینہ دار تھا۔ جو نمایاں ادیب بیرونِ ملک یا کسی دوسرے شہر سے اسلام آباد آتا، اُسے منشا صاحب اپنے ہاں خاص اعزاز سے مدعو کرتے۔ اُن کے ہاں قریباً ہر شام مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا، گمان ہے کہ چائے کی کیتلی مسلسل چولھے پر رہتی ہو گی۔

اس میں بہت قابلِ تعریف کردار ان کی بیگم کا تھا جو ایک گھریلو خاتون ہونے کے باوجود منشا صاحب کے احباب کی خاطر میں کوئی کمی نہ آنے دیتیں۔ عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ ادیب جو قابلِ قدر مقام حاصل کر لیتے ہیں، عموماً حلقۂ اربابِ ذوق اور دیگر مجالس میں نو آموز ادیبوں کے ہاتھوں محاکے کے خدشے کے پیشِ نظر اور دیگر مصروفیات کے باعث شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ اگر شرکت ناگزیر ہو تو کسی اجلاس کی صدارت یا مقالہ وغیرہ پڑھنے کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس منشا صاحب قریباً سارے جلسوں میں بہ طور سامع شامل ہوتے، مثبت تنقید اور فیاضانہ توصیف دونوں شانہ بہ شانہ ہوتے، بسا اوقات کوئی نادان اپنی ناکامیوں اور حسرتوں کا حساب بے باق کرنے آن پہنچتا تو اسے اس خندہ پیشانی اور تحمل سے برداشت کرتے کہ اُن کے ایک سمجھ دار آدمی ہونے کا تصور دل و دماغ پر اور راسخ ہو جاتا۔

مزاج میں سخاوت کا یہ عالم تھا کہ محمد الیاس کے ناول 'کہر' کو نیشنل بینک کا بہترین ناول کا موقر

انعام ملا تو جہاں بہت سے معاصرین خاموش ہو گئے، وہیں منشا صاحب نے الیاس صاحب کو فون کر کے بھر پور مبارک باد دی اور بعد ازاں اس کا جشن چائے اور متعلقہ لوازم سے منایا۔

شرافت کا یہ عالم کہ جشن کے لیے چائے ہی کا انتخاب کرتے۔ کسی افسانے میں ایک کردار کے حوالے سے لکھ دیا کہ اس نے ٹھنڈی بیئر گلاس میں انڈیلی اور اس میں پانی ملا کر پینے لگا۔ اس پر رندانِ آزمودہ کار نے خوب واویلا کیا کہ بھلا بیئر میں کب پانی ملایا جاتا ہے، تو معصومیت سے نہ صرف اپنی غلطی اور اس معاملے میں ناتجربہ کاری کا اعتراف کیا بلکہ ایک آسودہ خاموشی طاری کر لی۔

میری دو تفصیلی ملاقاتیں بھی ہوئیں جن میں ازحد اپنائیت سے حوصلہ افزائی اور راہ نمائی کی۔ ان ملاقاتوں کا طلائی نقش یوں تازہ ہے جیسے گزشتہ لمحے کی بات ہو۔

میں نے اُن کے ایک افسانے کا اور بعد ازاں نوبل حاصل کرنے والی ادیبہ ایلس منرو کا تذکرہ کیا تو بہت خوش ہوئے۔ وہ ان کا نسبتاً کم معروف افسانہ تھا جس میں غالباً افسانے کا مرکزی کردار اپنے اہل خانہ کے ساتھ گاؤں جانے کا اہتمام کر رہا ہوتا ہے۔ شہری زندگی کے مطابق سب اپنی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں اور وقت گزرتا جاتا ہے، اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور مرکزی کردار کا بوڑھا دیہاتی والد گاؤں سے آ پہنچتا ہے۔ والد بتاتا ہے کہ صبح اُس کا جی اس سے اور اس کے بیوی بچوں سے ملنے کو چاہا تو وہ بس میں بیٹھا اور چلا آیا۔ گویا سادہ دیہی زندگی کا جدید شہری زندگی کے تکلفات، اہتمام اور لوازم سے موازنہ موجود تھا۔ ان کے بیش تر افسانوں میں زندگی کا براہ راست مشاہدہ جھلکتا تھا۔ یہاں میں نے اُنھیں ایلس منرو کا حوالہ دیا جس نے اپنی زندگی کینیڈا کے ایک گوشے میں محدود ہو کر گزار دی۔ اس کا کہنا ہے کہ چھوٹے شہر یا قصبے میں رہنے والے ادیب اس لحاظ سے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ اُنھیں زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، افراد کا باہمی تعلق اور واسطہ بڑھ کر ہوتا ہے، سو انسانی فطرت کی بوالعجبیاں اور کج آرائیاں زیادہ کھل کر سامنے آتی ہیں۔ شہری زندگی میں تیز رفتار، رسمی تعلقات اور سرسری روابط کے باعث مشاہدے سے بڑھ کر تخیل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس بات سے منشا صاحب نے اتفاق کیا۔ ان پر بھی یہ حقیقت منطبق ہوتی ہے جس طرح پریم چند، احمد ندیم قاسمی، محمد خالد اختر وغیرہ پر ہوتی ہے۔

میں نے منشا صاحب کو اہم ادیبوں اور فلسفیوں سے متعلق قائم کردہ گم سم اور غائب الدماغ شخص کے عوامی تصور کے برعکس لمحۂ موجود میں پوری طرح موجود، متحرک اور چوکس پایا۔

ملازمت کے آخر میں تعلقاتِ عامہ کے شعبے سے، اور عام زندگی میں ابتدا سے تعلقات عامہ کے شعبے سے وابستہ رہے تھے۔ یعنی ان میں پبلک ریلیشنگ کا پیدائشی وصف موجود تھا جسے وہ ادب میں بھی بروئے کار لاتے تھے۔ اُن نشستوں میں معروف کالم نگار جاوید چودھری صاحب کا تذکرہ بھی ہوا جن سے میرا

پرانا محبت بھرا قریبی تعلق ہے۔ کہنے لگے کہ انھیں میرا پیغام دیجیے گا کہ وہ افسانے اور ادب کے آدمی ہیں، صحافت میں غلط چلے گئے ہیں، اس طرف آ جائیں۔ جب میں نے پیغام پہنچایا تو جاوید چودھری صاحب کہنے لگے کہ خواہش تو میری بھی ایسی ہے پر فکرِ معاش ایسا ہونے نہیں دیتی، ادب میں ذہنی ونفسیاتی تشفی تو ضرور ہے مگر ابھی ہم اس تہذیبی مقام پر نہیں پہنچے جہاں ترقی یافتہ دنیا کا ادیب اپنے قلم کے زور پر معاشی استحکام کی زندگی گزار لیتا ہے۔ منشا صاحب کو یہ بات سنائی تو بولے ''وہ کہتے تو سچ ہیں، پر کتنا دکھی کر دینے والا سچ ہے۔''

تحریر کے حوالے سے میرے چند کچے پکے افسانوں کی فیاضانہ تعریف کر کے حوصلہ افزائی کی۔ میں اُن کے تجربے کی روشنی میں عمدہ تحریر کے لیے مشورے اور راہ نمائی کا طلب گار ہوا تو میرے ملازمت سے وابستہ شب و روز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا کہ فی الحال مجھے افسانے لکھنے چاہئیں، ناول وقت اور ارتکاز کا طلب گار ہوتا ہے جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ کہنے لگے کہ جب کوئی خیال ذہن میں آئے تو اسے دماغ کے باغ میں بو دُوں، اگر وہ طاقت ور ہو گا تو کچھ ہی عرصے میں خود ہی پک کر نکل آئے گا۔ جب افسانہ لکھنے بیٹھا جائے تو اسے ایک ہی رَو اور موڈ میں مکمل کیا جائے تا کہ اس کی فضا، ماحول، زبان اور دیگر اجزا یکساں رہیں۔

ایک اہم نکتہ یہ بھی بیان کیا کہ کہانی دراصل روح ہوتی ہے بقیہ اجزا اور علامات کہانی کا جسم، سو روح کے بغیر جسم بے جان اور جسم کے بغیر روح بے شناخت ہوتی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی کہی کہ تحریر میں جدت کے واسطے بے ربطی نہیں ہونی چاہیے، مکالمات حقیقی ہونے چاہئیں۔

ایک موچی کی زبان سے گہری، پیچیدہ، فلسفیانہ موشگافیاں مصنوعی ہو جاتی ہیں، وہ ایک گہری بات سادہ پیرائے میں بھی بیان کر سکتا ہے۔ سو ہر کردار کی اپنی حقیقت کے قریب تر زبان ہونی چاہیے۔ جب میں نے ان کے ایک افسانے ''کچی پکی قبریں'' کے بعید الحقیقت ہونے کے بارے میں بات کی تو بتایا کہ ان کے قریباً سبھی مقبول اور معروف ہونے والے افسانوں کا خمیر حقیقی زندگی سے اُٹھایا گیا ہے۔ اُس افسانے میں ایک کردار گاؤں کے نمبردار اور نمبردارنی کی قبریں کھودڈالتا ہے۔ وہ ان قبروں میں اپنے ماں باپ کی ہڈیاں دفن کر دیتا ہے تا کہ وہاں پڑھی جانے والی فاتحہ اور دعائیں اُس کے ماں باپ کو پہنچتی رہیں اور ان کی قبروں پر دیے جلتے رہیں، اگربتیاں ماحول کو سوگوار خوشبو سے تقدس آمیز مہک عطا کرتی رہیں۔

منشا یاد صاحب سے جب اُن کے افسانوں پر چند ایک بار بات ہوئی تو اُن کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی، وہ ذرا سے آگے کو جھک آئے اور ہونٹ تر ہو گئے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی ماں سے اُس کی لائق اولاد کا تذکرہ کیا جائے۔ ایک ملاقات میں سانسیوں کا تذکرہ ہوا۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب نے بھی عجیب عادات وخصائل کے حامل اس گروہ کا تذکرہ اپنے ناول 'خس وخاشاک زمانے' میں کیا ہے۔ سانسی کسی خاص مذہب

کے پیروکار نہیں ہوتے، زندہ مردار ہر طرح کا جانور کھا جاتے ہیں اور عموماً معاشرتی سطح پر نچلے درجے کے پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک قریباً معدوم ہو چکی نسل ہے۔ 'ماس اور مٹی' کے عنوان کا افسانہ ایک ایسے سانسی کی کہانی ہے جو قصاب سے بڑا گوشت اُدھار مانگتا ہے۔ قصاب انکار کر دیتا ہے، چناں چہ وہ سانسی زمین دار کی حویلی جا کر زندہ گائے کی ران کاٹ کر گوشت نکال لیتا ہے۔ زخم میں بھس بھر کر وہ اُس کی سلائی تیزی سے کر دیتا ہے۔ بعدازاں وہ پکڑا جاتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ منشایاد نے بتایا کہ یہ حقیقی زندگی کا واقعہ تھا۔

منشایاد کی تحریر میں یہ انوکھے واقعات اور دل چسپ کردار کہاں سے آئے۔ جاننے کے لیے اُن کی زندگی کی کہانی کو باب باب پڑھنا ہوگا، طائرانہ نظر ہی سہی، بُھٹھا نستر کے طیور کی زبانی قصہ سننا ہوگا۔

پنجابی میں نالاں سیمنٹ یا لوہے کے نال یا پائپ کو کہتے ہیں۔ ابتدا میں پنجاب کی زمینیں بارانی ہوتی تھیں، سلطنتِ برطانیہ کی عمل داری کے دوران نہری نظام بچھایا گیا تو فصلوں کو پانی کی فراہمی کے لیے پائپس لگائی گئیں جنھیں نال یا نالاں کہتے تھے۔ اسی رعایت سے ایک گاؤں کا نام ڈیرا نالاں پڑ گیا۔ وہ گاؤں منشایاد کا حقیقی آبائی گاؤں ٹھہرا جہاں سے کئی نسلوں سے آباد اُس کے بزرگ نستر آ گئے۔ اُس کے والد کاشت کاری کرتے رہے، بعدازاں حکمت کی جانب رخ کر لیا۔

منشا کی پیدائش کا علاقہ صدیوں سے اطمینان بخش نیند سو رہا تھا۔ ہر حرکت ساکت اور ہر لمحہ موم کے مانند جامد تھا۔ انھیں کوئی شادی یا مرگ شعلہ دکھا کر سیال کر دیتی تھی۔ جنگلی جھاڑیاں، دور افق سے ملتے کھیت، خوش گوار پیلے رنگ کی سرسوں، نیم کے درخت، جڑی بوٹیاں اور اُفق تا اُفق نیلا آسمان، اُس پر محوِ خرام پرندے اور ان کے بیچ قبرستان جس میں جھاڑیوں، کریر، ملھے، جھڑ بیریوں، باٹے، ڈیلے اور پچھو کے بیچ ماں کی قبر۔

ماں کو منشا سے خاص عشق تھا۔ جو اُس کے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے خالہ کے گھر منتقلی کے دوران خوب نمایاں ہو گیا تھا۔

ابھی وہ کچی جماعتوں میں تھا کہ اُسے راجباہ کے ساتھ اُگے سرکنڈوں کے جنگل سے گزرنا پڑتا تھا۔ اُسے وہاں کے اجنبی راہ گیروں اور آوارہ کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے اُس کا باپ اُسے جنگل کے آگے تک چھوڑنے اور لینے آتا تھا۔ گجیانا نو کے لوئر مڈل اسکول کے ماسٹر بہاری لال اسے اپنے بیٹے کے ساتھ گھر پر پڑھاتے جس سے اس کی تعلیمی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔

آگے کی زندگی میں ننگے پیر سفر، لڑکپن کا رومان، ڈاکوؤں کے سچے واقعات، دیہی زندگی کی سادگی کے نمونے اور چند دل چسپ کردار اس کے منتظر تھے۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُس کی زندگی کی ریل جن اسٹیشنوں پر رُکے گی وہاں کیا مناظر اُس کے منتظر ہوں گے۔

چھٹی جماعت تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے حافظ آباد کے ایم بی ہائی اسکول میں داخل

کروادیا گیا۔ اُس کے قیام کا انتظام خالہ کے ہاں ٹھٹھا کلیاں میں کروادیا گیا۔ خالہ عسرت میں زندگی بسر کرتی تھیں، خالو سندھ جا کر قریباً لاتعلق ہو چکے تھے۔ خون کو خون کی کشش ہوتی ہے اسی لیے دیسی محاورہ ہے کہ اپنا سائے میں مارتا ہے۔ خالہ اس غربت کے باوجود اس کے اسکول کی فیس اور کپڑوں کے اخراجات اُٹھاتیں۔ منشا کو ریلوے لائن کے ساتھ چار میل پیدل چل کر اسکول جانا پڑتا۔ رستہ ناہموار اور پتھریلا ہوتا تھا۔ جلد ہی اُس کے جوتوں کا واحد جوڑا پھٹ گیا۔ حساس بچہ خالہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خالہ کے گھر سے نکلتے وقت پھٹا ہوا جوتوں کا جوڑا پہن لیتا، رستے میں سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں جوتے چھپا دیتا اور پیدل اسکول چلا جاتا۔ واپسی پر جوتے پہن کر گھر داخل ہو جاتا۔ اُس کے پیر زخمی ہو جاتے، ماس اُدھڑ اُدھڑ جاتا پر وہ ضبط کیے رہتا۔

گرمیوں کے دن تھے، تیز دھوپ اپنے رستے میں آنے والی ہر شے جھلسا رہی تھی، وہ اسکول کے برآمدے میں بیٹھا خوش خطی کر رہا تھا کہ خبر ملی کہ اُس کی ماں اُس سے ملنے، بس نہ ملنے کے باوجود، اٹھارہ میل پیدل چل کر آئی تھی۔ وہ لپک کر ماں کے پاس گیا اور لپٹ گیا۔ ماں نے بیٹے کو سینے سے خاصی دیر تک لگائے رکھا اور اُس کے ہاتھ تھام کر بیٹے کے جسمانی وجود کا یقین کرتی رہی۔ ماں بیٹے نے اکٹھے مل کر کھانا کھایا۔ جب وہ ماں کے لیے پانی لینے کو اٹھا اور گھڑے تک چل کر گیا تو ماں کی نظر اُس کے ننگے کھردرے پیروں پر پڑی۔ اُس نے بیٹے سے جوتوں کا پوچھا۔ بیٹا خاموش رہا، ماں تڑپ اٹھی اور رونے لگی۔ ''تم اساڑھ کی اس گرمی میں پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں چل کر اسکول آتے جاتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔ جواب نہ پا کر ماں سب سمجھ گئی۔ وہ منشا کو جوتوں کی دکان پر لے گئی، نئے جوتے خرید کر دیے، پرانے جوتے واپسی پر جھاڑیوں سے نکلوائے اور بیٹے کی ہمت اور قربانی کی داستان سنا کر پہلے خالہ کو رنجیدہ کر دیا پھر باپ کو۔

منشا کے گاؤں میں چند ہندوؤں کے گھرانے تھے۔ وہ کاروبار سے منسلک تھے۔ وہاں ہر کوئی اپنے عقیدے کے مطابق بقائے باہمی کے تحت رہتا تھا۔ اُس کے ساتھی طلبہ میں ہندو بھی تھے۔ مختلف عقائد کے ماننے والے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق زندگی، موت، قیامت، بھونچال وغیرہ پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اس کا ہندو دوست فقیروا اسے بتاتا کہ زمین ایک بڑے بیل کے سینگ پر رکھی ہوئی ہے۔ جب وہ سینگ بدلتا ہے تو زلزلہ آ جاتا ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی کے نصاب میں رام، سیتا، لچھمن، کوروؤں، پانڈوؤں کے قصے اور مہابھارت کے حصے شامل تھے۔

گجیانا نو میں ایک بڑا بازار تھا جس میں کریانہ، منیاری، کھل بنولے، کپڑے کی دکانیں تھیں۔ منشا پہلی مرتبہ گھوڑا برانڈ کی عمدہ ماچسیں خرید کر گاؤں گیا تو ہر سو اس کی دھوم مچ گئی۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ منشا کو اس کی ماں نے کہا کہ پاس ہونے پر وہ اسے گھڑی تحفہ دیں گی۔ تب تک منشا نے صرف دیواری گھڑیال

دیکھا ہوا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اتنا بڑا گھڑیال کہاں اُٹھائے پھرے گا۔ سو اُس نے انکار کر دیا۔ کلائی گھڑی تو اس نے بعد میں دیکھی۔

لوگوں کے لیے چوپال میں اکٹھے ہو کر حقے کے کش لگاتے ہوئے گپ شپ کرنے، شادی بیاہ کی کئی ماہ پہلے تیاریاں کرنے اور موت کے بعد مدتوں مرحوم کے خصائل کا دل گیر انداز میں تذکرہ کرنے کے سوا مصروفیت کے کم ہی بہانے ہوتے۔ ایک مرتبہ منشا کے گاؤں کے نمبردار کے بیٹے کی شادی ہوئی تو پورے گاؤں میں کچی اور پکی وڑ (تقسیم، بانٹ) کی گئی۔ پکی وڑ سے مراد دیگوں کے پکوان برادری کے ہر گھرانے کے افراد کے مطابق تقسیم کرنا تھا اور کچی وڑ سے مراد اسی تناسب سے آٹا، چاول، گھی، شکر وغیرہ برادری کے گھروں میں بھجوانا تھا۔ اس شادی میں گاؤں کے ہر گھر وڑ بھیجی گئی۔ ہر گھر میں اتنے کھانے اور راشن بھجوا دیے گئے کہ لوگوں نے قریبی دیہات میں اپنے اعزا کو بھجوا دیے۔ شادی کے موقع پر ڈھولے پڑھنے والے شاعر نوری کیمبو کو بھی بلایا گیا جو رات بھر ڈھولے گاتا رہتا۔ ایک رات اُس نے گاؤں کے دو فریقین میں ایک پرانی لڑائی کا ڈھولا سنا کر ایسا جذبہ جگایا کہ طرفین کے جوان بھڑک کر دوبارہ بھڑ جانے کو تیار ہو گئے۔ بزرگوں اور تقریب میں شریک اعلیٰ سرکاری افسران نے بیچ بچاؤ کروایا ورنہ خون خرابہ ہو جاتا۔

منشا کی ماں کو قرآن پاک کی تلاوت کے علاوہ پنجابی لوک داستانوں، مولوی عبدالستار کی قصص المحسنین، مولوی غلام رسول کے قصۂ یوسف زلیخا اور مجموعہ ابیات وغیرہ کا شوق تھا۔ پڑھنے میں دقت ہوتی تو منشا کی مدد لیتی۔ یوں داستانوں کا شوق منشا کو بچپن سے ہو گیا۔

منشا کے دادا کو کہانیاں سنانے کا شوق تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اُس نے دادا کو زیادہ تر بیمار اور بستر پر دیکھا تھا۔ وہ اسے ساتھ لٹا لیتے اور کہانیاں سناتے رہتے۔ بعدازاں منشا نے اُن کی زبانی سنی ہوئی توتا توتی کی کہانی کو اپنے افسانے 'کچی پکی قبریں' میں بھی استعمال کیا۔

اُسے کہانی پڑھنے اور سننے کا کچھ ایسا شوق ہوا کہ اپنے طور بھی کہانیاں گھڑنے لگا۔ اُس کی ایک خالہ میرٹھ میں رہتی تھیں۔ وہ جب کبھی میرٹھ سے آتیں تو وہاں کے آوارہ بندروں کے قصے سناتیں۔ اُس نے ان واقعات سے متاثر ہو کر ایک واقعہ گھڑ لیا جس میں اُس نے بندر پر سوار ہو کر لاہور اور دِلّی کی سیر کی تھی۔ جب اُس نے اپنے کزن منظور کو یہ روداد سنائی تو اُس نے یقین کر لیا۔ دل چسپ بات تو یہ ہے کہ وہ اور منظور ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور اکٹھے اسکول جاتے آتے تھے۔

وہ حافظ آباد کے اسکول میں پڑھ رہا تھا اور خالہ کے ہاں رہ رہا تھا تو اس کے والدین نواب نام کے ایک شخص کو اس کی خیریت معلوم کرنے اسکول بھیجتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ منشا ساتویں جماعت کے نوماہی کا پرچا دے رہا تھا کہ پرچا ختم ہوتے ہی اُس کے اُستاد نے کہا ''گاؤں کا کوئی آدمی باہر تمھارا انتظار

کررہا ہے۔"

القاکا نہ جانے وہ کون سالمحہ تھا کہ وہ چیخ اٹھا "میری ماں مرگئی۔"

ماں چند مہینوں سے تپ دق میں مبتلا تھی، باپ گھر میں اپنا تجویز کردہ حکیمی طبی علاج کرتا رہا جس سے افاقہ نہ ہوا، خانقاہ ڈوگراں کے بھی ایک حکیم سے بے سود علاج کروایا اور بالآخر ماں نے دم توڑ دیا۔ نواب اس وقت یہی روح فرسا خبر سنانے آیا تھا۔ ماں اور اولاد میں ایک ایسا غیر مرئی تعلق ہوتا ہے جو کسی حادثے کی ہزاروں میل دور دل مٹھی میں جکڑ کر اطلاع دے دیتا ہے۔ بعد میں اُس کے والد نے اُس کی ایک چھوٹی خالہ سے شادی کر لی تھی۔ بڑی خالہ کی غربت، ماں کی موت، ارد گرد پھیلی عسرت کی ٹھیکریوں اور جہدِ حیات نے منشا کو بہت جلد حالات آشنا اور باہوش کر دیا تھا۔ ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ ان مشکلات نے اُسے کڑوا نہیں کیا بلکہ رس بھرا میٹھا کر دیا۔ ہر دم مسکراتا، ہر وقت مدد کے لیے تیار اور ہر کسی سے اپنائیت برتنے والا 'کھانڈ کا باوا' بنا دیا۔

لڑکپن میں جان وَروں پرندوں کی کہانیاں پڑھتے، سناتے اُس نے اتفاقاً نسیم حجازی کا ایک ناول پڑھ لیا۔ ہر بڑے ادیب کی ذہنی پرورش میں عوامی نوعیت کے رومانی، تاریخی اور جاسوسی ادب کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ یہی اُسے مطالعے کی چاٹ ڈالتا ہے اور آگے بڑھنے کا عزم عطا کرتا ہے۔ پس منشا طلسماتی دنیا سے نکل کر حقیقی کرداروں کے بیچ آ گیا۔ اُس نے نسیم حجازی کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ابھی اُس کی نظریں دیگر ادیبوں کی کتابوں کا رخ کر رہی تھیں کہ سینما اسکرین پر جا پڑیں۔ اس میں سے مسخرے، ہیرو، ولن، زرق برق ملبوسات اوڑھے نوابین، موسیقی کی دھنیں، گانوں کی تانیں اور رقص کرتے جادوئی کردار نکل رہے تھے۔ ان سب نے اس پر منتر پھونک دیا۔ وہ فلم دیکھ کر آتا اور اپنے دوستوں کو جزئیات سمیت کہانی سُنا دیتا۔

منشا صاحب کی زندگی میں رومان قریباً ناپید تھا (غالباً اہلیہ کے معاملے کے سوا)۔ ایک مرتبہ خبر اُڑی کہ منشا صاحب کا کسی خاتون سے رومانی تعلق قائم ہو چکا ہے۔ منشا صاحب نے یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئے اور خوب اِتراتے ہوئے شہر میں پھرنے لگے۔ وہ تو بعد میں کھلا کہ وہ کوئی اور منشا تھے، منشا یاد نہ تھے۔ البتہ لڑکپن میں رومان کا شعلہ ایک جھلک دِکھلا گیا تھا۔

حافظ آباد سے ٹھٹھا کلیاں جاتے ہوئے سیم نالے پر سلیپروں پر مشتمل ایک پُل، پھٹوں والا پُل کہلاتا تھا۔ پھٹوں کے درمیان خاصا خلا موجود ہوتا تھا۔ یہ ٹرین کے گزرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ من چلے جوان اس پر دیکھ بھال کر یوں گزرتے کہ توجہ آنے جانے والی ٹرین پر، سائیکل کے پہیے پٹڑی پر اور نظر پھٹوں کے بیچ خلا پر ہوتی۔

لڑکپن کے دنوں میں ایک شام منشا کا اُس رستے سے گزر ہوا۔ وہ پُل پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص، ایک نوجوان لڑکی اور کچھ سامان کے ہم راہ وہاں بیٹھا ہے۔ بوڑھے کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ لڑکی کی سادگی میں ایک دل موہ لینے والی دل کشی تھی۔ منشا نے بزرگ کو لاچار دیکھ کر مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے قریب جا کر پوچھا۔

''بابا میں کچھ مدد کروں؟''

بابا نے استفسار کیا ''کون ہے؟'' لڑکی نے باباجی کو بتایا کہ کوئی طالب علم ہے۔ یہ سن کر بزرگ مطمئن ہو گیا۔ اُس نے منشا کو کہا۔

''بیٹا میری ایک آنکھ کا موتیے کا آپریشن ہوا ہے، دوسری آنکھ بھی کم زور ہے، اس لیے ٹھیک طرح سے نظر نہیں آتا۔ تم سہارا دے دو۔''

منشا نے بزرگ کا کچھ سامان اٹھایا اور اُسے پُل سے نالا پار کرا دیا۔ وہ واپس آیا اور لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ لڑکی نے اُسے غور سے دیکھا۔

منشا بولا ''تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔''

اُس نے غیر متعلق سا جواب دیا ''ہم بہت غریب لوگ ہیں۔''

اِس پر منشا نے پوچھا ''کیا غریب لوگ خوب صورت نہیں ہو سکتے؟'' وہ پُل کے بیچ میں تھے، یہ مکالمات جاری تھے کہ لڑکی کا پیر پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر نالے میں گرتے گرتے بچی۔ اُس نے گھبرا کر اپنے سینڈل اُتار لیے اور ہاتھ میں پکڑ لیے۔ منشا نے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر کلائی تھام لی۔ اُس نے اپنی کلائی منشا کو بہ رضا تھامنے دی۔ منشا جوان لڑکا تھا۔ اُس کا دل دھڑک اُٹھا اور گردشِ خوں بڑھ گئی۔ اُسے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ اگر پُل پر سے گزر گئے تو اُسے لڑکی کی کلائی چھوڑنی ہوگی۔ اُس نے رفتار آہستہ کر دی۔ آخیر کے قریب پہنچ کر منشا نے لڑکی کے چہرے پر دیکھا اور بہ قول اُس کے ''اس کے چہرے پر سرِ شام ہی سے لالٹین سی روشن ہو گئی تھی۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب سادگی کا کچھ ایسا دور دورہ تھا کہ بعض اوقات بیاہ کے موقع ہی پر لڑکی کو رازہائے دروں سے آگاہ کیا جاتا۔ لڑکوں کے لیے فلم دیکھنا گویا ایک گناہ تھا۔ ایسے میں اگر اس مختصر سفر کا لشکارا منشا کے ذہن پر تادیر جگ مگاتا رہا تو چنداں اچنبھے کی بات نہیں۔

چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کے بھی اصول ہوتے تھے۔ آج کی نسل کو یہ فقط قصہ ہائے الف لیلہ ہی لگیں گے۔ انگریزی میں ایک ترکیب چلی آ رہی ہے Honour among thieves جو چوروں کے درمیان موجود اخلاقیات کی عکاسی ہے۔ بہرحال منشا کے لڑکپن کے ڈاکو کا ایک قصہ ہے۔

ڈاکو کا تعلق بوہڑ باٹھ سے تھا اور وہ ٹھٹھا کلیاں میں ایک خوب پلی ہوئی گھوڑی چوری کرنے آیا تھا۔ وہ گھوڑی کھولنے لگا تو گھر کی بہو بانو کو پتا لگ گیا۔ وہ گھوڑی سے چمٹ گئی اور ڈاکو سے کہنے لگی ''بھائی ڈاکو اگر میری لاش لے کر جانی ہے تو لے جا، میں گھوڑی نہیں لے جانے دوں گی۔'' ڈاکو نے اُسے جھٹک ڈالا اور گھوڑی لے گیا۔ جب ڈاکو کو پتا چلا کہ اُس کے گاؤں کی ایک لڑکی ٹھٹھا کلیاں کے ایک گھرانے کی بہو ہے اور اس کے گاؤں کا ایک لڑکا محمد منشا (منشایاد) بھی وہاں بغرضِ تعلیم مقیم ہے تو وہ خاصا پشیمان ہوا۔ اُس کی شرمندگی اتنی بڑھی کہ وہ گھوڑی کو واپس لے گیا اور بانو کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

''لے میری ماں اپنی گھوڑی سنبھال اور مجھے جلدی سے معافی دے دے۔''

منشایاد کی زبان میں واقعے کی روداد یوں ہے ''اتنی خوب صورت، عزیز اور قیمتی گھوڑی چوری ہو جانے پر نمبردار اور اس کی بیٹی ہی نہیں، پورا گاؤں اداس تھا۔ دور دور سے لوگ افسوس کرنے آئے۔ بانو نے کئی روز تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کرائی گئی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور اب نمبردار نے ہر طرف سے مایوس ہو کر مخبری یا نشان دہی کرنے والے کے لیے بھاری رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا، یہ اسی گھوڑی کا ذکر ہو رہا تھا، چاچا ولو اس کے پاس آیا اور بولا۔ بیٹی لڑکے تمھارے سسرالی گاؤں کی گھوڑی کی شہرت سن کر اسے بھگا لائے تھے۔ واقعی بہت خوب صورت اور قیمتی جان ور ہے لیکن اگر انھیں معلوم ہوتا کہ وہاں اپنے گاؤں کی لڑکی بیاہی ہوئی ہے تو وہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتے۔ یہ سب لاعلمی میں ہوا۔ اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم گھوڑی واپس کر دیں گے۔''

دل چسپ بات تو یہ ہے کہ اُس ڈاکو کے گھر سے سارا علاقہ واقف تھا اور اُس نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔

اُس ڈاکو سے وابستہ ایک اور واقعہ ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں طالب علم منشا گھر آیا ہوا تھا۔ بوریت سے تنگ آ کر اُس نے ضمناً دوست احباب سے کہہ دیا کہ گاؤں میں ریڈیو تک نہیں ہے جس پر خبریں یا موسیقی کے پروگرام سنے جا سکیں۔ یہ بات اُس ڈاکو کے کانوں میں جا پڑی۔ چند روز بعد وہ کسی کا نیا ریڈیو چھین کر لے آیا اور گاؤں میں موجود ڈیرے پر رکھوا دیا۔

تب عمومی مزاج سے ہٹ کر دل چسپ اور منفرد کردار عام زندگی میں نظر آ جاتے تھے یا عام زندگی اتنی یکسانی کی حامل ہوتی تھی اور لوگ دوسروں کی زندگیوں میں اس درجے دل چسپی لیتے تھے کہ اُن کے خط اور کجیاں نمایاں ہو جاتی تھیں۔ نواب منشا کے اسکول اس کی خیریت پوچھنے آ جاتا تھا، ماں کی وفات کی اطلاع بھی وہی لے کر آیا تھا۔ نواب محمد کم تعلیم یافتہ، ذات کا موچی اور پیشے کے اعتبار سے دکان دار تھا۔ البتہ اُسے اپنے پیشے سے زیادہ دیگر علوم حاصل کرنے کی چاٹ تھی۔ تجسس اُس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کبھی وہ رمل اور نجوم

کا علم حاصل کرتا تو کبھی ریچھ بندر کا تماشا دکھانے والوں کے ہم راہ چلا جاتا۔ وہ دنوں تک غائب رہتا اور ایک دم پردۂ غیب سے نمودار ہو جاتا۔ اپنے کاروبار میں اُس کی دل چسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ سونے کو ہاتھ لگاتا تو وہ مٹی ہو جاتا۔

وہ ایک ایسا کردار تھا جو اپنی سائیکل پر مجنونانہ درجنوں، سیکڑوں میل کا سفر طے کر جاتا اور واپسی پر کئی الم غلم اشیا رستے سے اٹھا لاتا۔ اُس کا ایمان تھا کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہوتا ہے۔ وہ سیم نالے میں مچھلیاں پکڑنے اُترتا اور سانپ پکڑ لاتا۔ چورن، خمیرہ، اچار، عرق، شربت تیار کرنا اُس کے لیے بچوں کا کھیل تھا۔ البتہ کوشش کے باوجود وہ سونا نہیں بنا پایا تھا۔ کپڑے دھونے، غسل کرنے کا صابن، مہریں، کھٹی میٹھی گولیاں اور رنگین کاغذ کے کھلونے بناتے بناتے اُس نے ایک مرتبہ مسجد کا گھڑیال ٹھیک کیا تو گھڑی سازی کا پیشہ بھی اختیار کر بیٹھا۔ تقسیم کے فسادات ہوئے تو اُس نے بائیسکل کی نالیاں استعمال کرتے ہوئے بندوقیں بنا ڈالیں۔ وہ ان اشیا سے جو رقم کماتا وہ دوسری اشیا تیار اور ایجاد کرنے پر خرچ کر ڈالتا۔

ایک مرتبہ اُس نے منشا سے ایسے ریڈیو کا ذکر کیا جسے خود تیار کیا جا سکتا تھا۔ منشا نے بھی اُن دنوں ایک رسالے میں ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا ''صرف پانچ روپے میں خود ریڈیو بنایئے۔'' منشا نے اُس مضمون کا ذکر نواب سے کر دیا۔ وہ رسالہ منشا کے ایک دوست کے پاس تھا جو وہاں سے پچیس میل دور رہتا تھا۔ اُن دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ سو دونوں دوست سائیکل پر فاصلہ طے کر کے دوست کے گھر پہنچے اور رسالہ حاصل کیا۔ اُس سے اگلے روز پینتیس میل کا فاصلہ طے کر کے لاہور پہنچے اور ریڈیو بنانے کا ضروری سامان کباڑیے سے خریدا۔ اس سامان میں ہیڈ فون، سون مکھی، سُرمے کی ڈلی، ایریل اور کوائل بنانے کے لیے تانبے کے تار اور دیگر سامان شامل تھا۔

دونوں دوست تن دہی سے ریڈیو بنانے میں جت گئے۔ اُنھوں نے حسبِ ہدایات ریڈیو تیار کر لیا۔ پر اُس میں زندگی نہ دوڑی، کوئی آواز نہ برآمد ہوئی۔ یہ بات منشا کے لیے بہت حوصلہ شکن تھی۔ منشا اپنے اسکول کا چھٹیوں کا کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک رات منشا مسجد میں باجماعت نمازِ عشاء پڑھ رہا تھا کہ نواب کے چھوٹے بھائی نے مسجد کے دروازے پر آ کر آواز لگائی ''بھاء جی ریڈیو بولنے لگا ہے۔'' منشا نواب کے گھر لپکا اور وہاں جا کر ہیڈ فون کانوں سے لگایا تو ایک مدھر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی ''یہ ریڈیو پاکستان، لاہور ہے۔ اب آپ شمشاد بیگم اور لتا منگیشکر کا گایا ہوا فلم دیدار کا گیت سنیے'' اور ایک گیت سنائی دینے لگا ''بچپن کے دن بھلا نہ دینا، آج ہنسے کل رُلا نہ دینا۔''

بعد ازاں منشا نے نواب پر پنجابی میں ایک افسانہ لکھا اور اُسے اردو کا روپ بھی دیا۔ یہ اس کے مجموعے ''وگدا پانی'' میں شامل ہے اور کئی انعامات جیت چکا ہے۔

افسوس نواب زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ اُس نے منشا پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ جانے سے پہلے منشا کو گیت، گانے سننے کا بے انتہا شوق بھی دے گیا۔

منشا کی زندگی میں مشاہدے اور تجربے میں جو کردار بچپن نے ادا کیا وہ بعد کی یک رنگی سرکاری ملازمت کے یکساں دہراتے شب و روز نہ ادا کر سکے۔

اسکول میں وہ ایک ذہین اور لائق طالب علم کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہاں سے آگے اُس کی زندگی کی ٹرین کا اگلا اسٹیشن گورنمنٹ اسکول آف انجینئرنگ تھا۔

جب وہ انجینئرنگ اسکول میں داخلہ لینے کے لیے پہنچا تو وہاں میڈیکل سرٹیفکیٹ کو لازمی قرار دیا گیا۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے اسے لیبارٹری کے متعلقہ انچارج کو پانچ روپے بہ طور رشوت دینے پڑے۔ یہی رقم اس کے لیے زادِراہ تھی۔ وہ اسناد، مصدقہ نقول اور میڈیکل سرٹیفکیٹ لیے شیخوپورہ کے بتی والے چوک پر پہنچا تو ایک طوفانِ بادوباراں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ساری رات دستاویزات کو سینے سے لگائے ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھا رہا۔ صبح وہ کچہری چلا گیا تاکہ اپنے گاؤں سے آئے کسی شخص سے اُدھار پیسے لے کر کھانا کھا سکے اور سفر کر سکے۔ وہاں اُسے اپنے گاؤں کا کوئی شخص تاریخ بھگتنے، جیل کے قیدی سے ملاقات یا ضمانت کروانے، نظر نہیں آیا۔ جب وہ مایوس ہو گیا تھا کہ اسے گاؤں کا ممدانائی نظر آیا۔ منشا نے اُس سے پیسے اُدھار لیے، کھانا کھایا اور چاہ سرکاری کے لاری اڈے پر جا پہنچا۔

بہت مدت بعد منشا سب انجینئر سے ترقی کر کے ایکسئن کے عہدے تک جا پہنچا تھا تو گاؤں یاترا کے دوران ممدونائی اُس سے ملنے آیا تھا اور سلام کر کے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ منشا نے بہت عزت سے اُسے اُٹھا کر اپنے ساتھ بٹھایا تھا اُس کا احسان یاد کروایا تھا۔

انجینئرنگ میں داخلے سے پہلے اُس نے 'کنول' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا اور 'شمع' لاہور کو اشاعت کے لیے بھجوا دیا۔ کافی وقت گزرنے کے باوجود اُسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ شاہ عالمی، لاہور میں اُس رسالے کے دفتر جا پہنچا۔ چق اُٹھا کر اُس نے اندر جھانکا تو دیکھا کہ مدیر جو ایک مولانا تھے، اداکارہ صبیحہ خانم کی ایک بڑی تصویر غور سے دیکھ رہے تھے۔ منشا نوجوان تھا، جذباتی تھا اور تخلیق کے جذبے سے معمور تھا، سو مدیر کے سامنے بے باکی سے بول اُٹھا کہ اُس کا افسانہ کیوں شائع نہیں ہوا۔ مدیر نے منشا کو تحمل سے بٹھایا، کھانا کھلایا اور نائب مدیر کو افسانہ ڈھونڈ کر لانے کا کہا۔ جب افسانہ آیا تو اسے بہ غور پڑھا اور منشا سے چند سولات کیے۔

''کیا تم نے خود افسانہ لکھا ہے؟''

''کیوں میں خود نہیں لکھ سکتا، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں نے چوری کیا ہے؟'' منشا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اس میں کردار ہندو کیوں ہیں؟'' مولانا نے پوچھا۔

''اس میں بیوی شوہر کے لیے جس قسم کی قربانی دیتی ہے، وہ ایک پتی ورتا ستی ہو جانے والی ہندو عورت ہی دے سکتی ہے کہ اسے یہ سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ کوئی مولوی اعتراض نہ کر دے۔'' مولوی کا ذکر سن کر مولانا مسکرائے اور اسے یقین دلایا کہ افسانہ ضرور چھپے گا۔ البتہ انھوں نے مشورہ دیا کہ منشا کو اپنے کیریر پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، وگرنہ اس کا حال بھی خود مولانا جیسا ہو جائے گا۔

اُس نے لالہ موسیٰ ریلوے اسٹیشن پر شمع لاہور میں اپنا پہلا افسانہ اکتوبر 1955 میں دیکھا۔

انجینئرنگ اسکول میں داخل ہی ہوا تھا کہ وہاں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ سینئر طلبہ چاہتے تھے کہ انھیں اوورسیئر کی جگہ سب انجینئر کہا جائے اور اس کورس کو ڈپلوما قرار دیا جائے۔ منشا کے لکھنے پڑھنے کے شوق سے طلبہ واقف ہو چکے تھے۔ اُسے نعرے ایجاد کرنے اور پمفلٹ لکھنے کی ذمے داری تفویض کی گئی۔ اس نے یہ ذمے داری بہ خوبی پوری کی۔ جلد ہوسٹل کی رسا بندی کر دی گئی اور پولیس اس پر قابض ہو گئی۔ طلبہ کو برطرف کر دیا گیا۔ باقی لڑکوں کی طرح منشا بھی گھر لوٹ آیا۔ گویا اُڑنے سے پہلے ہی اُس کے پَر کتر دیے گئے۔ اس انجینئرنگ اسکول کے پرنسپل ایک بنگالی تھے۔ ان کا نام محمد موسیٰ تھا۔ انھوں نے دانش و تدبیر سے معاملہ یوں سلجھایا کہ تمام طلبہ کے والدین کو ایک ہی عبارت کے خطوط لکھے ''آپ کا لڑکا چند شر پسند لڑکوں کے ورغلانے پر اسکول سے بھاگ گیا ہے، اگر وہ ایک ہفتے میں واپس آ جائے تو اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ورنہ اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا جائے گا اور ادا کی ہوئی داخلہ اور سالانہ فیس ضبط کر لی جائے گی۔'' منشا ہفتہ پورا ہونے سے پہلے ہی واپس پہنچ کر تعلیمی سفر کا آغاز کر چکا تھا۔

سفر کا آغاز تو اس نے تخلیقی میدان میں بھی کر دیا تھا۔ ابتداً وہ شاعری بھی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک شرط کے نتیجے میں ولایت ماچھی کی دکان پر بیٹھے بیٹھے پنجابی میں باراں ماہ لکھ لیا۔ ولایت نے وہ قصہ لاہور جا کر چھپوا لیا اور بسوں میں گا کر قصے بیچنے والوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ منشا کی ایک ناکام محبت کی غم گین فرضی داستان بھی گھڑ کر منسوب کر لی۔ گویا بہت سے مسافروں کی ہم دردی منشا سے اُس کی ناکام محبت کی وجہ ہو گئی جو اُس نے کی ہی نہ تھی۔

اِدھر منشا کو ڈگری ملی اور وہ اپنے گاؤں کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ نوجوان ٹھہرا، اُدھر اُس کے گھر کی چوکھٹ پر رشتوں کی بھر مار ہو گئی۔ منشا کی خواہش شہر کی لڑکی سے بیاہ کی تھی۔ اُنھی دنوں وہ لاہور اپنی خالہ کے ہاں گیا تو اُسے خالہ کی چھوٹی بیٹی پسند آ گئی۔ اُس نے والد سے اپنی پسند کا تذکرہ کیا اور وہ رشتہ طے

کر آئے۔ دیہی زندگی کی سیاست یہاں بھی در آئی۔ اِدھر اُس کا رشتہ طے ہوا، اُدھر رشتے کے خواہش مندوں نے اسے ذاتی انا کا مسئلہ بنالیا۔ بہر حال اُس کے خالو آگے بڑھے اور اس کی تقرری محکمہ تعمیرات راول پنڈی میں ہوگئی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد وہ خالہ کے ہاں گیا تو اس کی ہونے والی بیوی نے دروازہ کھولا اور بے اختیار بولی ''سلام بھائی جان۔''

راول پنڈی میں اُس کی سکونت تیلی محلے میں ہوئی۔ وہاں اُس کے ماتحت ورک چارج میں دو لڑکے بہت اچھا کام کرنے والے تھے، ایک تیز وطرار لڑکا محمد اقبال اور دوسرا میٹرک پاس بھولا بھالا لڑکا اختر رشید۔ اختر رشید بعد ازاں رشید امجد کے نام سے معروف ہوا اور بہ طور ادیب اُس کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ گو رشید امجد تب تک زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا پر نفیس ذوق رکھتا تھا اور نہایت مہذب تھا۔ اُسے کتابیں پڑھنے، فلمیں دیکھنے اور ریڈیو پر گانے سننے کا بہت شوق تھا۔

جلد منشا پنڈی کے ادبی حلقوں میں جانے لگا۔ ایک مرتبہ وہ گھر لوٹا تو اُس کا سامان ایک قبضہ گروپ باہر پھینک رہا تھا۔ محمد منشا اور اُس کے سامان کو رشید امجد اپنے محلے گورونا نک پورہ میں واقع متروک گوردوارے کی بالائی منزل میں اپنے گھر لے آیا۔ رشید کی والدہ بہت نیک اور سادہ خاتون تھیں۔ منشا اُنھیں 'خالہ جی' کہنے لگا۔ رشید کی والدہ کو شکایت تھی کہ رشید گھر دیر سے آتا ہے اور پوری تن خواہ نہیں دیتا۔ منشا نے رشید کی پوری تن خواہ اُس کی والدہ کو لا کر دینی شروع کر دی۔ گویا وہ انھی کے گھر کا فرد بن گیا۔ بہ قول رشید امجد اُس کی والدہ کو منشا کا ''پینڈو پن'' اور سادگی بھا گئے تھے۔ بعد ازاں وہ اگر منشا کے ہاں چند روز قیام کے لیے بھی چلا جاتا تو والدہ اعتراض نہ کرتیں۔

یہاں عطاء الحق قاسمی یاد آتے ہیں۔ اُن کے والد بہت مذہبی رجحان رکھتے تھے اور فلم و موسیقی ایسی لغویات کو بہت برا سمجھتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ عطا اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں۔ چناں چہ جب عطا نے ایک داڑھی والے باشرع دوست سے والد کو متعارف کروایا تو وہ بیٹے کی راست روی اور شرافت پر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے عطا کو صرف اس دوست کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عطا صاحب یہ کہتے ہوئے اس دوست کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس داڑھی والے نمازی دوست کے ساتھ اور اس کی وجہ ہی سے انھوں نے اپنے زمانے کی سبھی معروف فلمیں دیکھ لیں۔

بہر حال منشا اور رشید امجد میں دوستی کا یہ تعلق منشا کی وفات تک چلا۔ ان میں کبھی معاصرانہ چشمک نے جنم نہ لیا۔ ویسے بھی دونوں کا اندازِ تحریر جدا جدا تھا۔

منشا کو مری کا سلسلۂ کوہ بہت پسند تھا، ادیب تھا، سو لطافتِ مزاج ایک خاصہ تھی۔ اس نے اپنی خواہش پر تبادلہ مری کروالیا۔ وہاں اس کی ملاقات دیگر ادیبوں کے علاوہ معروف شاعر مصطفیٰ زیدی سے

بھی رہی۔

مری میں موسم گرما ختم ہوا، سیاح رخصت ہوئے، درختوں کے پتے جھڑے اور برف باری شروع ہوگئی۔ آمدورفت کے ذرائع مسدود ہوئے اور شہر ویران ہوگیا۔ ہر سو اداسی اُتر آئی۔ وحشت نے منشا کے دل میں جوگ سنبھالا۔ اِس اداسی میں اُس کا واحد رفیق ریڈیو تھا۔ وہ لتا اور طلعت محمود کے گانے سنتا اور دل بہلاتا۔

مری میں اس کا ایک عجب شخص سے پالا پڑا۔ راول پنڈی کے قریب روات میں ریڈیو ٹرانس میٹر زیرِ تعمیر تھا۔ وہاں کوئی شخص رات گئے تنصیبات کی آزمائش کے لیے من موہنے، اداس اور دل پذیر گانے لگا دیتا۔ ایک روز منشا ریڈیو کی سوئیاں گھما رہا تھا کہ اتفاقاً اس شخص کے لگائے گانے اس کی فریکوینسی پر آ گئے۔ منشا رات بھر وہ گانے سنتا رہا۔ ان گانوں کا نہ تو کوئی تعارف ہوتا اور نہ ہی کسی پروگرام کا اعلان۔ ''اگر میرے پاس ٹیلی فون ہوتا تو روات والے انجینئر سے رابطہ کر کے ضرور شکریہ ادا کرتا جو رات کی تنہائیوں میں میری جانب گیتوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور بجرے روانہ کرتا رہا'' منشا نے لکھا۔

جلد ہی حکومت نے متروکہ مکانات کے الاٹیز کو مالکانہ حقوق دے کر تزئین و مرمت کا کام ختم کر دیا۔ منشا کا متعلقہ محکمہ ختم ہوگیا اور وہ بے روزگار ہوگیا۔

بعد ازاں اس نے فیڈرل کیپیٹل کمیشن میں ملازمت کی درخواست جمع کروادی۔ درخواست منظور ہوگئی اور اسے ملازمت مل گئی۔ سی ڈی اے 1960 میں وجود میں آیا، البتہ دارالحکومت کی تعمیر کا کام 1961 میں شروع ہوا۔

منشا ان ابتدائی لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے وزیرِ اعظم ہاؤس، پارلیمنٹ، سپریم کورٹ اور دیگر عمارات کی نشان دہی کی اور ان کی تعمیر کے ابتدائی نشان لگائے۔ انھوں نے وہاں نشان دہی کے لیے بانس گاڑ کر سرخ جھنڈے لگائے تاکہ شکر پڑیاں سے دوربینیں سنبھالے عمائدین دور سے ان مقامات کا اندازہ کر سکیں۔

بہت بعد میں، ایک مرتبہ چیئرمین سی ڈی اے فریدالدین احمد اور دیگر حاضرین کو ایک میٹنگ میں بتایا گیا کہ ان کے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے جو دارالحکومت سے متعلقہ کابینہ کی پہلی میٹنگ سے موجود تھا۔ سب نے تالیاں بجائیں اور منشا کی پذیرائی کی۔ جب چیئرمین نے پوچھا کہ کیا اُسے اندازہ تھا کہ اسلام آباد موجودہ شکل اختیار کر لے گا۔ یہ سن کر منشا نے بلا توقف کہا ''اگر میں شہر کے مستقبل کا صحیح اندازہ لگا سکتا تو شہر کا امیر ترین آدمی ہوتا اور نہ جانے کہاں بیٹھا ہوتا۔'' اس دوران ایک عجیب اور چونکا دینے والا واقعہ ہوا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ محکمہ پی ڈبلیو ڈی لاہور میں تازہ اسامیوں کے لیے امیدواروں سے درخواستیں طلب کی گئیں۔ لاہور علم کا گہوارہ اور ادیبوں کی آماج گاہ تھا۔ وہاں افسانہ نگاروں کے مُربی احمد ندیم قاسمی صاحب بھی جلوہ افروز تھے۔ اس امر نے اس کے شوق کو مہمیز دی۔ اس نے بھی درخواست جمع کروادی۔ اُسے انٹرویو کے لیے بلوالیا گیا۔ اس نے اپنے خالو کو اپنی لاہور آمد کی اطلاع کر دی اور ایک شام لاہور میں واقع خالو کے گھر پہنچ گیا۔ ابھی خالو کے ہاں پہنچ کر اس نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا تھا کہ نچلی منزل سے ڈھولک بجنے کی آواز سنائی دی۔

آواز سن کر منشا نے ویسے ہی پوچھ لیا ''کیا پڑوس میں کسی کی شادی ہے؟''

اُس کی ایک سالی بولی ''نہیں ہمارے گھر میں شادی ہے۔''

منشا چونک گیا۔

''کس کی شادی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کی'' سالی نے جواب دیا۔

منشا کے ہاتوں میں پیالی لرز گئی۔

اُس نے طے کر لیا کہ وہ یوں شادی نہیں کرے گا اور اگلے روز انٹرویو دے کر راول پنڈی لوٹ جائے گا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ اگلے روز اپنے خالو کے کلینک میں بیمار بن کر جا لیٹا۔ اُس کے والد کو خبر ہوئی تو غصے میں بھرے ہوئے کلینک آئے اور بھڑک کر بولے ''تمھارا نکاح ہی ہوا ہے، کوئی تمھیں کنویں میں تو نہیں پھینک دیا۔'' اس دوران اس کے خالو، جو سسر بھی تھے آن پہنچے اور اس کی سلوٹیں بھاپ والی بھاری استری ہوئے کپڑے کی طرح دور کر دیں۔

منشا ایک گرم حمام سے نہا کر نکلا تو بینڈ باجے اور سہرے کا انتظام ہو چکا تھا۔ اگلے روز 9 دسمبر 1960 کو اُس کی رخصتی کا دن ٹھہرا۔ وہ دلہن کو لے کر گاؤں پہنچا۔ دوسرے دن بہ قول اس کے ''ولیمی'' ہوئی۔ برات میں کُل پانچ افراد تھے، یعنی اُس کے والد، والدہ، تایا، ایک دوست عبدالمجید اور وہ خود۔ ولیمے پر مرغ کا سالن اور زردہ تیار کروایا گیا۔

اُس دور کی سادہ دیہی شادیوں کے شرکا کو یاد ہو تو زردے پر قورمہ ڈال کر کھایا جاتا تھا اور بعض اوقات اچار بھی، یوں نمکین اور میٹھے کا ایک امتزاج ہو جاتا تھا۔ چند لوگ خمیری روٹی کے ساتھ بھی زردہ کھا لیتے تھے۔

وہ معصوم، کم عمر اور چھوٹی سی دلہن کو لے کر راول پنڈی کے اپنے گھر آیا تو اُسے دیکھ کر اونچے لمبے فاضل صاحب بولے ''کیا آج کل لاہور میں پاکٹ سائز دلہنوں کا رواج ہے؟''۔ نازک کومل دلہن کے

آنے سے منشا کا چھوٹا سا گھر سج گیا۔ دلہن کی معصومیت اور سادگی نے دلہا کا دل موہ لیا۔ وہ اپنے میکے سے دُور رہنے کی عادی نہ تھی سو ابتدائی دنوں میں اداس رہنے لگی۔ ایک روز منشا نے اُس کی اداسی کی وجہ پوچھی تو اُس نے اس وسوسے کا اظہار کر دیا کہ کہیں منشا کا دل اُس سے بھر نہ جائے اور وہ کہیں اور متوجہ نہ ہو جائے۔ تب منشا نے رات کو پھیلی خوب صورت چاندنی کی قسم کھائی کہ وہ اُسے کبھی نہ چھوڑے گا۔ منشا نے اپنا عہد نبھایا، بیوی سے محبت کی، بے وفائی نہ کی اور اُس کی خوشی کے لیے جی جان سے کوشاں رہا۔ بیوی نے بھی ہاتھ لگا کر اینٹوں کی ڈھیری کو گھر کر دیا۔

ملازمت کے دن یکساں تھے۔ شاموں میں وہ شعر و افسانے کی رنگین پھوار میں بھیگ جاتا۔ اُس نے اسلام آباد میں ''لکھنے والوں کی انجمن'' کی ایک شاخ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئی۔ اُس نے حلقۂ ارباب ذوق کے سیکریٹری جنرل اعجاز بٹالوی سے اجازت حاصل کر کے حلقۂ اربابِ ذوق اسلام آباد کی داغ بیل ڈالی۔ خیر خواہوں اور ساتھی ادیبوں نے اُس کی معاونت کی۔ دسمبر 1972 کو اس کے پہلے اجلاس سے لے کر اگلے آٹھ برس تک اُس نے حلقے کے سیکریٹری کی ذمے داریاں نبھائیں۔ جذبے کا یہ عالم تھا کہ اجلاس کے روز شہر سے باہر بھی ہوتا تو لوٹ آتا۔ بہت سے شرکا کو منشا اپنے اسکوٹر پر حلقے کے اجلاس تک لاتا اور واپس پہنچا کر آتا۔

پُرلطف ماجرا تو یہ ہے کہ بعض اوقات منشا شرکا کو لینے اسکوٹر پر جاتا تو ایک شخص کی ذمے داری لگا جاتا۔ اُس شخص کا کردار نگہ بان کا ہوتا تھا۔ وہ یقینی بناتا تھا کہ منشا کی غیر موجودی میں حاضرین مجوزہ اجلاس کے آغاز سے پہلے ہی فرار نہ ہو جائیں۔ چناں چہ وہ اُنھیں روک کر رکھتا تھا۔

منشا کی ملازمت میکانکی نوعیت کی تعمیراتی اور انتظامی امور کی نگہ بانی کی تھی۔ وہاں ایک عملی نوعیت کا شخص درکار ہوتا تھا۔ ادیبوں کے حوالے سے یہ تاثر عام تھا کہ وہ عملی زندگی سے دُور اپنی خیالی دنیا میں رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اہم ذمے داریاں تفویض کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اِسی اندیشے کے تحت منشا اپنے ادارے میں اپنا ادبی تشخص چھپاتا تھا۔ حالاں کہ ذرائع ابلاغ میں اس کی تشہیر کے باعث اسے چھپانا ممکن نہ رہا تھا۔

ایک جانب اُس کے افسانوی فن پارے تواتر سے سامنے آ رہے تھے دوسری جانب وہ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھ رہا تھا۔ ان میں جنون، بندھن، راہیں اور دیگر خاصے معروف ہوئے۔ ابتدائی دنوں میں جب وہ افسانے لکھ رہا تھا اور شاعری بھی کر رہا تھا تو اسے مشہور اور مشفق افسانہ نگار وقار بن الٰہی نے مشورہ دیا تھا ''جتنے سوراخ ہوں گے، تخلیق کا گھڑا اتنی ہی جلدی خالی ہو جائے گا۔'' منشا نے یہ بھی مشاہدہ کر لیا تھا کہ شعری تخلیقات بارش کی بوندوں کی طرح برستی ہیں، جب کہ نثری فن پاروں کی قلت ہے۔ چناں

چہ اس نے اپنے تخلیقی جذبے کو نثر کا لباس پہنانے کا فیصلہ کرلیا۔نثر زیادہ وقت،توجہ،ارتکاز اور یک سوئی مانگتی ہے۔عجب معاملہ تو یہ ہے کہ بیش تر ادیب جو نثری ادب تخلیق کرتے ہیں زندگی میں کبھی نہ کبھی یا تو شاعر رہے ہوتے ہیں یا شاعر ہونے کے خواہش مند رہتے ہیں۔

وقار بن الٰہی نے اپنی پہلی ملاقات، بعدازاں استوار ہونے والے تعلق اور منشا کی ہمہ جہتی کے بارے میں لکھا تھا۔

''1967 کا ذکر ہے کہ میں اِس جن سے متعارف ہوا یا اس کا مجھ سے ٹاکرا ہوا۔ان دنوں جی۔سکس میں واقع ڈی۔ایم۔اے کے دفتر میں 'لکھنے والوں کی انجمن' کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوا کرتے تھے، ایسا ہی ایک تنقیدی اجلاس تھا، جس میں میں اتفاقاً گھسا، پھر اس جن کے ہتھے ایسا چڑھا کہ آج تک اس کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکا۔منشا یاد اُن دنوں قریب ہی واقع ایک گھر میں رہتا تھا، سو اس سے گاہے گاہے ملاقات ہونے لگی۔جب یہ سلسلہ بڑھا، سلسلے تو بڑھنے ہی تھے کہ اس کے ہاں پاک وہند کے قریباً سبھی ادبی رسائل آتے تھے، اس کے ہاں پہلے بلیک اینڈ وائٹ اور پھر رنگین ٹی وی تھا، اس کے گھر میں حقہ بھی تھا جس میں شیخوپورہ کی زرخیز اور میٹھی زمینوں سے آیا کڑوا تمبا کو وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتا تھا۔جو کوئی اس کے ہاں جاتا، منشا یہ ساری چیزیں آنے والے کے حوالے کرکے ایک طرف ہو بیٹھتا۔یہ تعلق بڑھا تو معلوم ہوا، منشا تو جن ہے یعنی سی۔ڈی۔اے کا ملازم تھا، سارا سارا دن کسی نہ کسی زیر تعمیر عمارت میں اینٹوں کی چنائی، چھتوں میں ڈالے جانے والے مسالے اور پلستر کی دھاریں دیکھتے گزار دیتا ہے۔بقیہ وقت میں وہ افسانے لکھتا ہے، شعر کہتا ہے، درمیان میں کوئی مریض آجائے تو ہومیو پیتھک دوا کی پڑیاں بھی بنا کے دیتا ہے، موسیقی کا رسیا ہے۔اسے علم ہوجائے کہ شہر کے کسی کونے میں گانوں کی نئی کیسٹ آئی ہے تو آدھی رات کو بھی اسکوٹر لے کر اس دکان اور کیسٹ کی تلاش میں نکل جاتا ہے، مطالعے کا اُسے چسکا ہے، اس کے علاوہ اسے مزید تعلیم کا ہوکا ہے، وہ بڑا فرماں بردار بیٹا ہے، پیار کرنے والا بھائی ہے، شفیق باپ ہے، نہایت سمجھ دار خاوند ہے (کبھی کبھی بھڑک بھی اٹھتا ہے، جیسے دیا سلائی کو ماچس پر رگڑیں تو بھڑک اُٹھتی ہے لیکن پانی میں ڈالیں تو شوں کی آواز نکال کے لکڑی کا بجھا ٹکڑا بن جاتی ہے)، آزمائش شرط ہے، قسم کا یار ہے......اور پتا نہیں کیا کیا ہے۔آپ ہی کہیے، اتنے سارے کام تو ایک جن ہی کرسکتا ہے، کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔''

اختر جمال نے منشا کے حوالے سے ایک انوکھا واقعہ لکھا۔

''منشا یاد کا ایک دل چسپ رخ اس وقت سامنے آیا جب ان کے ساتھ مری کی شام افسانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔منشا صاحب نے ہم سب کو ایک جگہ سائے دار درخت کے نیچے کھڑا کرکے کہا کہ وہ ویگن

میں سیٹوں کا انتظام کرتے ہیں۔ جب ویگن میں سیٹیں کسی طرح نہ ملیں تو منشایاد نے تجویز پیش کی کہ ہم پوری ویگن لے لیتے ہیں اور جتنی سیٹیں خالی ہوں گی اتنی سواریاں ہم خود بٹھائیں گے۔ ساتھ تو ہم لوگ تھے۔ غالباً چند ہی سیٹیں خالی تھیں۔ منشا یاد نے ویگن کے دروازے پر کھڑے ہو کر انتہائی پیشہ وارانہ انداز میں صدا دی ''مری مری'' اور ذرا سی دیر میں سیٹیں پُر ہوگئیں اور ویگن چل پڑی۔ انھوں نے کنڈیکٹر کا کام اتنی خوبی سے کیا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ حلقہ ارباب ذوق کے سیکریٹری اور ایک مشہور افسانہ نگار ہیں۔''

منشا میں لوک دانش موجود تھی۔ وہ اس بات کے پرچارک تھے کہ بچے کو ابتدائی تعلیم اس کی ماں بولی میں دینی چاہیے۔ چھوٹا بچہ نرم نوالے کو جلد ہضم کر پاتا ہے۔ وہ تخلیق کے زمین سے رشتے کے قائل تھے۔ برصغیر کا وہ حصہ جو پاکستان کہلاتا ہے، کے بیش تر باسی اس زمین کی تہذیب سے نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ عرب بھائیوں اور وسط ایشیائی ریاستوں کے فاتحین نے جب ہمارے آباواجداد کو زیر کیا اور صوفیائے کرام روشنی لے کر آئے تو ان کی آمد سے پہلے بھی ہم ہی یہاں موجود تھے۔ جغرافیے کی اپنی تاریخ ہوتی ہے، تہذیب کی اپنی جڑیں۔ ''رِگ وید'' ایسا بے مثال شاہ کار اسی سرزمین پر تخلیق ہوا تھا۔

منشایاد تخلیقی طور پر بڑے آدمی تھے تو عملی زندگی میں ایک فرض شناس ملازم، ہم درد شوہر اور شفیق والد، تین بیٹوں اور ایک بیٹی کو اعلیٰ تعلیم اور محفوظ مستقبل دیا۔

ایک مرتبہ اکادمی ادبیات نے ان پر کتاب لکھنے کا ڈول ڈالا تو وہ اس کے مصنف، صاحب طرز ادیب، ''سمر سامر'' اور دیگر عمدہ تخلیقات کے خالق اسلم سراج الدین کو اپنے ہم راہ ان سب جگہوں پر لے گئے تھے جہاں انھوں نے زندگی بسر کی تھی۔ اس کے نتیجے میں عمدہ تصنیف ''منشایاد: شخصیت اور فن'' (جس سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے) سامنے آئی۔

وہ ایک خوش گوار، متین اور وسیع القلب آدمی تھے۔ بڑوں چھوٹوں سے عزت سے پیش آتے تھے۔ مرضِ قلب میں مبتلا ہوئے تو پیس میکر لگا دیا گیا۔ ایک شام حلقۂ اربابِ ذوق کے اجلاس میں شرکت کے لیے اپنے عزیز دوست حمید شاہد کو ساتھ چلنے کا کہا۔ حمید مصروفیت کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ اجلاس کے بعد کئی روز سے جاری خرابیِ معدہ میں اضافہ ہوگیا۔ وہ شام کو اس بیماری کا علاج کرواتے رہے تھے۔ درحقیقت عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے لگائے گئے پیس میکر میں خرابی آگئی تھی جسے خاصی تاخیر سے تشخیص کیا گیا۔ طبیعت پہلے ہی خاصی خراب تھی۔ اگلے روز وہ شخص، جسے ممتاز مفتی نے افسانے کے شہر کا صدر دروازہ کہا تھا، سنبھل نہ پایا۔ یوں یہ دروازہ بند ہوگیا۔ افسانہ نگاروں کا ذکر کہیں آئے گا تو منشایاد بہت یاد آئیں گے۔ وہ اپنے افسانوں میں دلوں پر نقش ہیں، زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

منشایاد کی بدقسمتی تھی کہ ان سا مرنجاں مرنج خلیق شخص وضع داری کے زمانے سے نکل کر ناشائستگی

کے اِس دور میں چلا آیا تھا جہاں اونچی آواز کو دلیل کی آواز سمجھا جانے لگا ہے اور بے تہذیبی کو سچائی کا جزوداں سمجھا جاتا ہے۔ جہاں انسان ڈکراتے ہیں اور حیوان جائے پناہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ معاشی طور پر ہم کم زور، علمی پس ماندگی کا ہم شکار، معاشرتی نظام ہمارا تخریب کا شکار۔ پس ایک خاندانی نظام اور تہذیبی شائستگی تھی، مروّت تھی اور وضع داری باقی تھی، سو وہ بھی رخصت ہوا چاہتی ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

جلاوطن

تصدق سہیل

مارک ٹوئن نے کہا تھا کہ فکشن کو قابلِ یقین ہونا چاہیے، زندگی کی طرح نا قابلِ یقین نہیں۔ زندگی میں بعض کردار ایسے ہوتے ہیں جو کسی افسانے یا ناول کے کردار نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں ہم سے جدا ہو جانے والے معروف مصور تصدق سہیل یقیناً ایک افسانوی کردار تھے۔ اُن کے دوست اور اُردو زبان کے صفِ اوّل کے ناول نگار عبداللہ حسین کے افسانوی مجموعے 'نشیب' کے افسانے 'جلاوطن' کے مرکزی کردار کے مزاج سے تصدق سہیل کا اندازِ زیست خوب مماثل تھا۔ وہ مرکزی کردار اکیلا رہتا ہے، گھر میں پرندے پالے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے جداگانہ طرزِ زندگی کے باعث عام روزمرہ زندگی بسر کرنے والوں کے طنز و مذاق کا نشانہ بنتا ہے۔ تصدق سہیل بھی تنہا رہتے تھے، گھر میں پرندے پالے ہوئے تھے اور اپنے مخصوص اندازِ حیات، اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق، نہ کہ معاشرے کی خواہش کے مطابق بسر کرنے کے باعث عامیوں کے مذاق کا نشانہ بن جاتے تھے۔ میری اُن سے قریباً پندرہ برس سے ہر ہفتے، اتوار کے روز ملاقات ہوتی تھی۔ عجب آدمی تھے، بے لوث اور سراپا فن کار۔

وہ پچھلے پچاس برس سے سرِ شام سو جاتے تھے، صبح تین بجے اُٹھتے تھے۔ فریج سے گوشت نکال کر اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بہت احتیاط اور توجہ سے کاٹتے، تا کہ اس میں کوئی ہڈی یا کوئی ٹکڑا بڑا نہ رہ جائے۔ ایک بڑے تھال میں گوشت رکھ کر پڑوس میں نکل جاتے۔ اطراف کی سڑکوں پر پرندے اُن کے منتظر ہوتے تھے۔ یہ کووں، چیلوں اور دیگر پرندوں کو بہت محبت سے گوشت کھلاتے اور لوٹ آتے۔ انھوں نے انگلینڈ میں ساری جوانی، ادھیڑ عمری اور ابتدائی بڑھاپا گزارا۔ برطانیہ میں ان کا چار دہائیوں سے بڑھ کر قیام تھا تو قریبی جنگل میں جنگلی لومڑوں اور دیگر جان وَروں کو کھانا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے گوشت کاٹنے پر اتنا وقت صرف کرنے کی وجہ پوچھی تو بولے ''پرندوں کے حلق چھوٹے ہوتے ہیں۔ ابتدا میں بڑے ٹکڑے ڈالتا تھا تو چند ایک بار دیکھا کہ دل اور گوشت کے دوسرے حصے پرندوں کے حلق میں اٹک جاتے ہیں اور اُن کا دم گھٹ جاتا ہے۔ چناں چہ میں نے جب انھیں زمین پر تڑپتے دیکھا تو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا۔''

میں پہلی مرتبہ اُن کے فلیٹ پر گیا تو وہاں ایک موہوم نا گوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ دروازے سے اُن کے پینٹنگ کرنے والے کمرے تک جاتے ہوئے ایک بلّی میرے آگے سے گزر کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی، بالکونی پر لٹکتے پنجروں میں مختلف پرندے ایک اجنبی کو دیکھ کر پَر پھڑ پھڑانے لگے۔ گھر میں وہ بساند پنجرے کے پرندوں کے علاوہ روزانہ مٹی کی کٹوریوں میں باجرہ، دانا، دُنکا چگنے اور پانی پینے کے لیے بالکونی میں اُتر آنے والے رنگ برنگے پرندوں کی آمد و رفت اور بیٹوں کی وجہ سے تھی۔

جب مجھے اُن سے ملتے دس برس گزر گئے تو ایک روز میں نے تصدق صاحب سے پوچھا ''میں پچھلے

دس برس سے آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ ہماری دنیا جہاں کے ہر موضوع پر گفت گو ہوتی رہی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں میں کون ہوں، کہاں رہتا ہوں اور کیا کرتا ہوں؟'' یہ سن کر وہ درویش صفت مصور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میری طرف دیکھا اور بولے ''واقعی میں نے تو آپ سے آج تک پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ بتایئے آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟'' میں یہ سن کر ہنس دیا۔ اُن سے متعلق بعض واقعات غیر حقیقی لگتے ہیں۔ ایک واقعے کے گواہ اُن کے قریبی عزیز اور ایک آرٹ ڈیلر بھی ہیں۔ ایک مرتبہ اُنھیں چند پینٹنگز کمیشن کی گئیں اور ایڈوانس میں بتیس لاکھ روپے دیے گئے۔ وہ بینکاری نظام پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ رقم کیش میں دی گئی۔ اگلے روز اُن سے اُس خطیر رقم کا پوچھا گیا تو بولے کہ ایک ملازمت پیشہ ضرورت مند خاتون اُن کے پاس آئی تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کی بے روزگاری اور بچوں کی بیماری کی داستان اُنھیں سنائی تو اُن سے رہا نہیں گیا۔ سارے کے سارے روپے خاتون کو تھما دیے۔ اگلی صبح وہ خالی ہاتھ بیٹھے تھے۔

وہ تنہائی پسند تھے، اُن کے تحریر کردہ افسانوں کے مجموعے کا نام بھی 'تنہائی کا سفر' ہے۔ اپنے عزیزوں، رشتے داروں سے تو بالکل بھی نہ ملتے تھے۔ کہتے تھے 'خاندانی معاملات اور الجھنیں میری یک سوئی کو متاثر کرتی ہیں'، اُن کی تین بہنیں تھیں۔ دو بہنیں معاشی طور پر خاصی خوش حال تھیں۔ ایک بہن اُن کے آبائی شہر شیخوپورہ میں بیوگی اور غربت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ بات تو بہت بعد میں جا کر کھلی کہ وہ اُس بیوہ بہن کو خاموشی سے ہر ماہ ایک مناسب رقم بھجوا دیا کرتے تھے اور کسی سے تذکرہ نہ کرتے تھے۔

وہ کراچی میں قیام پذیر تھے جب کہ بہنیں اسلام آباد، لاہور اور شیخوپورہ میں سکونت رکھتی تھیں۔ اُن میں تنہا رہنے کے ساتھ ساتھ خود مختار زندگی کی خواہش غایت درجے کی تھی۔ اس خواہش نے اُنھیں بہت نقصان بھی پہنچایا۔ چند مرتبہ نامعلوم واقفانِ حال اُن کے فلیٹ میں داخل ہو گئے، بزرگ فن کار کو مارا پیٹا اور رقم لے اُڑے۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ زخمی حالت میں ہیں۔ عیادت کے دوران معلوم ہوا کہ ایک آرٹ ڈیلر نے اُنھیں بے ہوش کر دینے والا نشہ آور مشروب پلایا تھا اور تصویریں لے اُڑا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کمرے میں ٹکراتے پھرے تھے اور کسی نوک دار شے سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ اگلے روز ملازمہ نے اُنھیں اس حالت میں دیکھ کر شور مچا دیا تھا۔ تہذیبی طور پر پس ماندہ ہوتے سماج میں، اکیلے رہنے والے بوڑھے لوگوں کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک، معاشرے کے حیوانی بدن سے منافقت کی قبائے ململ اُتار پھینکتا ہے۔ خیال آتا ہے کہ اُن کی بیوی، بیٹی یا بیٹا ہوتے تو شاید وہ ایسے افسوس ناک سلوک سے بچ جاتے۔ پھر خیال آتا ہے کہ تب وہ اتنے بڑے قدرتی خود پرداختہ فن کار نہ ہوتے، سبزی کا تھیلا اٹھائے گلی میں جاتے عام بزرگ ہوتے۔ ان کی آزادروی نے عالمِ فن کو تو کئی تحائف دیے پر ذاتی سطح پر انھیں اس کے

لیے بہت کچھ قربان بھی کرنا پڑا۔

وہ بہت سی ملاقاتوں میں شکایت کرتے کہ اُنھیں صحیح سنائی نہیں دیتا، لوگ باگ اپنے مقاصد سے آتے ہیں، کوئی ان کا غم خوار اور خیر خواہ نہیں۔ میں انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا، اُس نے معائنہ کر کے کان صاف کر دیے اور کہا کہ یہ چالیس پچاس برس کی صفائی ہے۔ اس کے بعد کئی روز تک صاف آواز سن کر بچے کی طرح خوش خوش اِٹھلاتے پھرے۔ بہت سی خوش گوار معطر یادیں بھی ہیں۔ بعض مرتبہ آنکھوں کے ڈاکٹر پی ایس مہرا اور دیگر کئی نے انھیں پہچان کر ان کے فنی مرتبے کے باعث فیس لینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ساری عمر شادی نہ کی تھی اور ایک ہی شخص کے ساتھ ساری زندگی گزار دینے کے خیال سے لرز جانے کا اظہار کیا تھا۔ آخری عمر میں اپنی مداح، ایک چینل کی غیر معروف اینکر پرسن سے جو ملاقاتوں کے لیے آتی تھی، شادی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جذبات دوطرفہ نظر آتے تھے۔ وہ خاتون چند ماہ اُن کے ہاں نظر آتی رہی، پھر یک دم غائب ہوگئی۔ بعدازاں اُن سے دریافت کیا گیا تو وہ گم سم سے ہوگئے۔

اُن کے بھانجے نبیل رانا، جو اُن کے غم خوار اور خیر خواہ بھی تھے، سناتے ہیں کہ کراچی کی ایلیٹ کلاس کی ایک شادی شدہ فیشن ایبل خاتون ان کے ہاں اکثر ناز و ادا کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی۔ کبھی وہ تصدق صاحب سے لاڈ بھری فرمائشیں کرتی تو کبھی مصنوعی خفگی کا اظہار کرتی۔ تصدق صاحب سادہ مزاج آدمی تھے۔ کئی مرتبہ اپنی بیش قیمت، اعلیٰ فنی معیار کی حامل تصاویر اسے تحفتاً بھی دے دیتے۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون ان کے ہاں نظر آنا بند ہوگئی۔ اتفاقاً بھانجے کی ملاقات اس خاتون سے ایک سفارت خانے کی رنگین تقریب میں ہوگئی۔ اُنھوں نے خاتون سے نظر نہ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ عالم بےخودی میں بولی "اب میں اِس لیے وہاں نہیں جاتی کہ میرا مقصد پورا ہوگیا ہے"۔ جب بھانجے نے توجہ دلائی کہ ایسی بہکی گفت گو سے پہلے کم از کم ان کے اور تصدق سہیل کے محترم رشتے ہی کا لحاظ کر لیا ہوتا۔ یہ سن کر وہ کسی قدر سنبھل گئی اور معذرت کرنے لگی۔

ایسے حادثات کسی عام شخص کو کڑوا کر دیتے۔ اس کے برعکس تصدق صاحب ہر وقت اپنے فن میں مستغرق کھلے کھلے مسکراتے نظر آتے۔ چاہنے والوں نے ان کے ساتھ تصویر بنوانی ہوتی تو کبھی ہیٹ پہن کر پوز کرتے تو کبھی قصداً مضحکہ خیز پوز دے کر خود بھی ہنستے اور مداحین کو ہنسا کر بھی خوش ہوتے۔ وہ کسی بھی زیادتی اور دکھ کو زیادہ دیر اپنے دل میں مہمان نہ رکھتے تھے، سب بھول کر خود مگن، بُت شکن ہو جاتے۔

تصدق سہیل کسی خاص پلاننگ کے تحت پینٹنگ نہیں بناتے تھے بلکہ کینوس پر رنگ لگا کر چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد دیکھتے تو بعض اوقات انھی رنگوں سے کوئی تصویر نمایاں ہوتی نظر آتی تھی۔ اُسے وہ بہت توجہ سے پینٹ کر دیتے تھے۔ گویا یہ شعوری کوشش نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں ان کا لاشعور اور تحت الشعور کارفرما ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں آج بھی اُسی دَور میں زندہ ہوں جب انسان نے اس خوب صورت دنیا کو

پامال نہ کیا تھا، یہاں کنکریٹ کی عمارتیں، تارکول کی سڑکیں، گندگی اور قدرتی عناصر پر تجاوزات موجود نہ تھے۔ وہ گھنے جنگلوں، کنوارے چشموں، پرندوں، جان وَروں اور جنگلوں کے بیچ ذہنی طور پر زندگی بسر کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو اُنھوں نے صحیح معنوں میں ایک فن کار کی آزاد زندگی بسر کی۔ وہ کسی ضرورت کے تحت اپنے اندر سے اُبھرنے والی اور فن کارانہ جبلت کے بطن سے جنم لینے والی خواہش کے تحت مصوری کرتے تھے۔ دنیادار تو وہ قطعی طور پر نہ تھے۔ سو معاشی، سیاسی، معاشرتی یا کوئی اور مفاد ان کے پیشِ نظر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے درخواست کی کہ ایک ایسی پینٹنگ تخلیق کر دیں جس میں عورت کے مانند ایک درخت ہو جس میں سے مردانہ شبیہوں والی شاخیں نکل رہی ہوں۔ یہ ابتدائی مادر سری معاشرے کی علامت ہو جس میں عورت کی کوکھ سے جنم لینے والے مردوں کا اُس پر انحصار ظاہر ہو۔ تصدق صاحب نے اس خیال پر غور کیا۔ گمان تھا کہ چوں کہ وہ درخت، شاخیں اور پرندے خواب ناک تجریدیت میں بہ طور علامات کے برتتے رہے ہیں سو ایسی تخلیق میں آسانی محسوس کریں گے۔ چند ماہ بعد انھیں مودبانہ یاد دہانی کروائی گئی۔ وہ سوچتے رہے اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ اپنے اندر کی آواز، ذہنی رَو اور ناقابلِ بیان تشبیہ جو کبھی اُن کے ذہن میں جھلک دکھلا جاتی ہے، کے زیرِ اثر اور اسی کے دامِ خیال میں تخلیق مصور کرتے ہیں۔ سو باہر سے آنے والے خیال کو مصور کرنے سے معذرت کر لی۔ ایک چھٹی کے دن دوپہر کے بعد جب میں اُن سے ملنے گیا تو بہت خوش تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اپنے پینٹنگ والے کمرے میں لے گئے۔ اُس کمرے میں ایک جانب میوزک سسٹم رکھا ہوتا تھا، بے پردہ کھڑکی سے خوب روشنی اندر آتی تھی اور کئی مکمل، نامکمل تصاویر اور بے رنگ کینوس دھرے ہوتے تھے۔ وہاں ایک شبیہ کی تصویر آئزل پر لگی تھی۔ بچوں کی طرح خوش ہو کر مچلتے ہوئے بتانے لگے کہ یہ شبیہ بہت عرصے سے اُنھیں خواب میں آ رہی تھی پر اسے کینوس پر منتقل نہ کر پا رہے تھے۔ بالآخر صبح سویرے پرندوں کو دانا دُنکا اور چیلوں کو گوشت ڈالنے کے بعد ایک تخلیقی رَو میں اُنھوں نے یہ تصویر بنانی شروع کی اور یہ ایسی تیار ہوگئی جیسی اُنھیں نظر آتی تھی۔

ایسے ہی ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں اُن کے پاس بیٹھا قدیم قبائل کے تصورِ خدا پر پُرمغز گفت گو سن رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک آرٹ ڈیلر اندر چلا آیا۔ اُسے دیکھ کر تصدق صاحب گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ چند لمحے بعد سامنے ایک تصویر کی جانب اشارہ کر کے بولے ''یہ ابھی نامکمل ہے، اگلی اتوار کو آیئے۔'' ڈیلر چلا گیا تو میں نے پوچھا کہ بہ ظاہر تو تصویر مکمل ہے، اس میں کیا کمی ہے۔ تصدق صاحب نے سرسری انداز میں بتایا کہ وہ اس تصویر سے غیر مطمئن ہیں، یہ تصویر ہنوز غیر متوازن ہے۔ اگلی ملاقات میں تصویر ویسی ہی رکھی تھی۔ میں نے ضمناً اس بارے میں پوچھا تو بولے کہ انھوں نے اسے مکمل کر دیا ہے۔ میں نے بہ غور دیکھتے ہوئے خود کلامی کی کہ مجھے تو اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تو انھوں نے اس کے ایک کونے کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس پر ہلکا سا برش لگایا گیا ہے۔ یوں یہ مکمل اور متوازن ہوگئی ہے۔ وہ آخری لمحے تک اپنی کسی بھی تصویر سے خال خال ہی مکمل مطمئن ہوتے تھے۔

انھوں نے ساری زندگی شادی نہ کر کے اچھا کیا تھا۔ بہت سے فن کار اپنے فن یا صلاحیت کا خراج اپنے بیوی بچوں کو نظر انداز کر کے اُن سے لیتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے تخلیقی جنون کی خاطر کسی عورت کی زندگی متاثر نہ کی تھی۔ محبتیں کئی کی تھیں اور عشق ایک برطانوی لڑکی انگرڈ سے کیا تھا۔

ایک مرتبہ میں نے اُن پر ایک طویل مضمون انگریزی رسالے کے لیے لکھا۔ اس میں انگرڈ کا تذکرہ بھی تھا، بلکہ اُن کے اُردو خاکے میں بھی ہے۔ مضمون کی اشاعت کے چند ہفتے بعد مجھے ایک e-mail آئی۔ برطانیہ کے کسی صاحب نے میرا مضمون پڑھا تھا۔ انھوں نے انگرڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ بڑھاپے میں آ کر اُس نے خودکشی کر لی تھی۔ میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ آیا یہ اطلاع تصدق صاحب کو دوں یا نہ دوں۔ پھر اخلاقیات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ اطلاع سنائی تو وہ بے ساختہ بولے ''انگرڈ کو ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ اُسے پہلے ہی خودکشی کر لینی چاہیے تھی۔'' یہ سب وہ یوں یک دَم بولے جیسے ابھی انگرڈ سے مل کر آ رہے ہوں۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے اور ایک نمی اُن کی آنکھوں میں تیر گئی۔ بعد میں اُنھوں نے بتایا کہ وہ کئی روز تک اُداس رہے تھے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انگرڈ سے اُن کی آخری ملاقات قریباً چالیس برس پہلے ہوئی تھی۔ پر وہ ان کے اندر یوں زندہ تھی جیسے چند روز پہلے ہی اُس سے ملاقات ہوئی ہو۔

تصدق صاحب کی پور پور میں زندگی اور خوش مزاجی نظر آتی تھی۔ اکثر وہ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ انسان کی طبعی عمر سو برس ہے۔ جو اس سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں، بے وقوف ہوتے ہیں۔ کئی مرتبہ مسکراتے ہوئے کہتے کہ بہت سے آرٹ کلیکٹر ان کی پینٹنگیں اس لیے خرید رہے ہیں کہ انھیں توقع ہے کہ چوں کہ وہ بچاسی چھیاسی کی عمر کے ہو چکے، سو جلد فوت ہو جائیں گے۔ یوں ان تصویروں کی قیمت بڑھ جائے گی۔ پھر ہنستے ہوئے کہتے ''ان بے وقوفوں کو معلوم نہیں کہ ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

جب وہ بعید از گمان حالات کی وجہ سے بیمار ہو کر بے ہوش ہوئے اور انھیں دمِ آخریں کہیے یا دمِ واپسیں کہیے، پر اسپتال داخل کروایا گیا تو ان کے تحت الشعور میں زندہ رہنے کی تڑپ موجود تھی۔ پھندے سے لٹک کر خودکشی کرنے والے بہت سے لوگوں کی گردنوں پر اُن کے اپنے ناخنوں کے نشان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خودکشی کی شعوری خواہش رکھتے ہیں، جب کہ انسان کا لاشعور زندہ رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یوں جب خودکشی کرنے والے شعوری طور پر پھندے سے لٹکتے ہیں تو ان کا لاشعور متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ لاشعور انسان کو زندہ رہنے پر بے اختیار آمادہ کرتا ہے۔ یوں وہ لٹک جانے کے بعد تڑپتے ہوئے اپنے

آپ کو پھندے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے ناخنوں سے گردن کو زخمی کر بیٹھتے ہیں اور اکثر اس میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہ یوں ہی ہے کہ اگر کسی شخص کی جانب اس کی لاعلمی میں کوئی شے پھینکی جائے تو بعض اوقات وہ یک دم اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ فطرت نے انسان کی سرشت اور نس نس میں زندہ رہنے کا جذبہ شامل کر دیا ہے۔ تصدق سہیل صاحب اسپتال میں بے ہوش لیٹے تھے۔ جب انھیں چھوا جاتا تو وہ باقاعدہ طور پر ردِ عمل ظاہر کرتے۔ چہرے پر ہاتھ دھرا جاتا تو کسمسا جاتے۔ گویا خواہش مند ہوں کہ ہاتھ ہٹا لیا جائے۔ غالباً بقا کی یہی آرزو تھی کہ وہ سو برس سے پہلے فوت ہونے والوں کو بے وقوف کہتے تھے۔

تصدق سہیل صاحب کو پیسے جمع کرنے سے نفرت تھی۔ آرٹ گیلری والوں، اُن کے مداحوں اور گنتی کے چند دیگر لوگوں نے اُس ستاسی سالہ بوڑھے مصور کو جو اکیلا رہتا تھا، پر اس معاملے میں کم ستم نہ ڈھائے۔ کبھی کسی نے تصویریں ہڑپ کر لیں تو کوئی رقم لے اُڑا۔ ہم شدت پسندی کے حوالے سے دکھ میں مبتلا رہتے ہیں پر مجھے اُن کے چند روشن خیال مداح دوستوں پر بھی دکھ ہوتا ہے جنھیں تصدق صاحب نے اپنی بے شمار تصویریں تحفتاً دیں۔ بیماری کی حالت میں وہ اُن لوگوں کو یاد کرتے رہے۔ میں نے قریباً اُن سبھی سے رابطہ کیا۔ چوں کہ اُن سب کا مقصد پورا ہو چکا تھا، سو کوئی نہ آیا۔ آخر ہم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ شدت پسند کیا اور روشن خیال کیا۔

دِینہ کا لال*

گُلزار
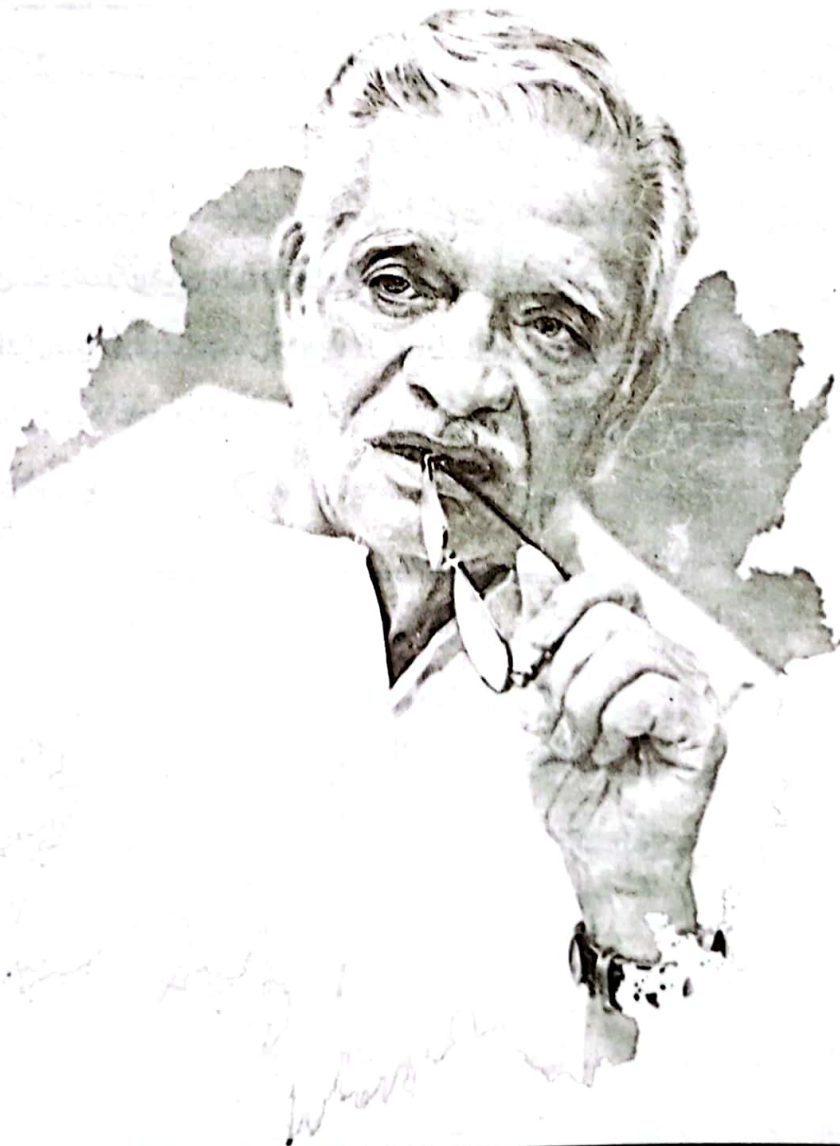
* لال: بہ معنی بیٹا، بالک

یہ پنجاب کے ایک سکھ لڑکے اور بمبئی کی مسلمان لڑکی کی محبت کی سچی کہانی ہے۔

لڑکا فقط ڈیڑھ برس کا تھا تو اُس کی ماں فوت ہو گئی۔ ادھر پوٹھوہار میں اُس لڑکے کا بچپن اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں میں یوں تنہا گزرا کہ اُسے اپنے چھوٹے سے قصبے میں اپنے مکان کے در و دیوار، سرخ وادیوں، بُھر بُھری پہاڑیوں، ویرانوں پر اُترتی شاموں کی لالی، نیلے کانچ آسمان پر بادلوں کی سفید دُھنکی روئی کے سے گالوں، ریلوے اسٹیشن کے بینچ اور ہینڈ پمپ، چھدرے درختوں اور اُن میں کُوکتی کوئلوں میں دوست نظر آئے، جذباتی تسکین ملی۔

اُدھر بمبئی میں جب لڑکی شیر خوار تھی تو کہتے ہیں غربت کی وجہ سے اُس کا باپ اُسے چند گھنٹوں کے لیے یتیم خانے چھوڑ گیا۔ جب اُس بچی کی ہم عمر لڑکیاں درختوں کی شاخوں سے لٹکتی رسیوں پر جھولے جھولتی تھیں، لکن میٹی، پٹھو گرم کھیلتی تھیں، پراندے گوندھتی، چٹیا بُنتی، گڑیوں کے کپڑے ٹانکتی، مہندی کے نقش و نگار بناتی، کھیتوں کھلیانوں میں چوکڑیاں بھرتی بھاگتی پھرتی تھیں، تب وہ لڑکی فلموں میں مزدوری کرتی تھی۔

چند دہائیوں بعد فلمی دنیا کے ناٹک گھر میں پہلی وہ مرتبہ ملے تو خوب بن آئی۔ دونوں ہم روح تھے، محبت کے پیاسے، سو پہروں ایک دوسرے کی صحبت میں گزر جاتے۔ اُن دونوں میں شاعری بھی ایک قدرِ مشترک تھی۔ وہ لڑکا الفاظ کی نرم و نازک روح چھو لیتا تھا۔

لڑکی اَب تک فلم کی معروف اداکارہ بن چکی تھی۔ وہ روزانہ ایک سپارہ تلاوت کرتی تھی اور روزے نہ چھوڑتی تھی، بہ امر مجبوری اُسے بیماری کی وجہ سے روزے چھوڑنے پڑ گئے۔ ایسے میں حساس شاعر جو اَب تک کہانی کار اور ہدایت کار بھی بن چکا تھا، نے محبت میں ایک منفرد روایت ڈالی اور اداکارہ کے حصّے کے روزے رکھنے شروع کر دیے۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روزے رکھنا اُس کی روایت بن گئی۔

اداکارہ جوان عمری میں چل بسی۔ شاعر کے لیے عین عروج پر اُس غم خوار و چارہ ساز کا چلے جانا ایسا جذباتی سانحہ ثابت ہوا کہ اُس نے دنیا سے روٹھ جانے والی کے حصے کے روزے مستقلاً جاری رکھے۔

اس واقعے کو قریباً نصف صدی ہو چکی ہے۔ وہ شاعر اب صرف شاعر نہیں رہا، ایک معزز اور مقبول فلم کار، یکتائے روزگار فن کار کے چاندی سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ وہ آج بھی روزے رکھتا ہے، محبت کی روایت میں رکھتا ہے، کس جذبے کے تحت رکھتا ہے، یہ وہی جانتا ہے۔ روزے تو وہ کسی وجہ سے بھی رکھ سکتا ہے، گھر میں حرمِ پاک کی تصویر کیوں لگا رکھی ہے، یہ وہی جانتا ہے یا شاید دِلّی کے مولوی مجیب الرحمان جانتے ہوں۔

یہ سننے کی بات ہے، پر کچھ دیر بعد۔

اُس حساس شاعر سمپورن سنگھ کالرا کو دنیا گل زار کے مشہور و معروف نام سے جانتی ہے۔

گل زار کے بارے میں چند حقائق کم ہی لوگ جانتے ہیں۔

گل زار ابتدائی طور پر گل زار دینوی (دینہ کے حوالے سے) کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ (1960 کی فلم شریمان اور ستیہ وادی وغیرہ میں اسی نام سے نغمے لکھے)، وہ اپنی بیٹی میگھنا کو تیرہ برس کی عمر تک اپنے ہاتھ سے لکھ کر ہر سال گرہ پر کتاب تحفہ کرتے رہے ہیں۔ قریبی لوگوں سے اچھے موڈ میں وہ پنجابی میں گفت گو کرتے ہیں، اُن کی دفتری میز پر ایک تصویر رکھی ہے جو کسی انسان کی نہیں، اُن کے پالتو بُل ڈاگ ''پالی'' کی ہے، وہ آج بھی سارے ڈائلاگ اور گانے اُردو میں لکھتے ہیں اور اِن دنوں انھوں نے ایک اور شوق پال رکھا ہے، مصوری کا۔ وہ ہر اعتبار سے بجائے خود ایک تصویر ہیں، تخلیقی دمکتے لشکتے لبھاتے رنگوں سے لبالب آدمی جو برش سے کینوس پر نت نئی تصویریں کاڑھ رہے ہیں۔

اُس برس جب آسٹریا کے چانسلر ڈول فنس کو قتل کر کے دوسری جنگِ عظیم کی بنیاد رکھی گئی، جرمنی میں غیظ و غضب سے بھرا ہٹلر کامل حکم ران بنا، ماؤ نے چین میں ایک لاکھ کی سپاہ کے ساتھ لانگ مارچ شروع کیا، گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک معطل کی، اُسی برس یعنی 18 اگست 1934 کو سردار مکھن سنگھ کالرا اور سجن کور کے ہاں ضلع جہلم کے اڑھائی ہزار آبادی والے چھوٹے سے قصبے دینہ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اُس کا نام دادا سردار نہال سنگھ کرلا والا نے سمپورن سنگھ کالرا رکھا۔ ابھی سمپورن سنگھ کی عمر ڈیڑھ برس تھی تو اُس کی ماں کا دیہانت ہو گیا۔ اُس کے والد نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ سجن کور اُس کی دوسری بیوی تھی جس سے صرف سمپورن سنگھ پیدا ہوا۔ دوسری بیویوں سے اُس کی دیگر اولاد تھی۔ گویا سمپورن سنگھ کے سوتیلے بہن بھائی اور مائیں گھر میں موجود تھے۔ اس کے گھر کے ماحول میں سوتیلا نہ دھاتی ٹھنڈی اجنبیت موجود تھی جس کے باعث وہ کم گو اور خود مگن بچہ بن گیا۔ اس کا زیادہ وقت گلہریوں، چڑیوں، تتلیوں کے پیچھے بھاگتے گزرتا۔ جان وروں سے محبت اُس کے مزاج میں مستقل طور پر شامل ہو گئی۔ وہ پہاڑی پگڈنڈیوں پر کھیلتا بھاگتا چلا جاتا اور ان میں سے اُبلتے چشموں اور جھلملاتے پانی سے بھرے ندی نالوں میں بھیگ بھیگ جاتا۔ پہاڑی علاقوں کی شامیں اداسی لے کر آتی ہیں۔ شاموں میں بدلتی سہ پہروں کو وہ دینہ کے ریلوے اسٹیشن کے بینچ پر بیٹھا اپنے والد کے آنے کا انتظار کیا کرتا۔ ریل چھک چھک دھواں اُڑاتی ''چھیاں چھیاں'' ڈولتی پھسلتی اسٹیشن پر رُکتی تو وہ اُس کے ڈبوں کے ساتھ ساتھ بھاگتا، باپ سے لپٹ جاتا۔

اُس کی ابتدائی تعلیم اُردو میں تھی۔ سو وہ اُچھلتا کودتا قصبے کے مدرسے میں تختی، گاچی، دوات اور قلم سے لکھائی پڑھائی کرتا۔ وہیں ایک بڑی سی لڑکی نے اُس کے بستے سے گاچنی مٹی چرائی تھی اور اُسے چوم کر بولی تھی ''مجھے دے دے یہ مٹی، مجھ کو تختی پوت کر اِک نام لکھنا ہے۔'' جب معصوم سمپورن نے اپنی دوسری ماں

کو یہ بات بتائی تو وہ غصے میں اُس لڑکی کی بے حیائی پر بولی ''وہ کوئی حاملہ ہوگی۔'' اُس پہلے بوسے کی پچاسیوں سال گرہ پر سمپورن نے لکھا تھا'' میں شاید چھ برس کا تھا، میں اب چھپن برس کا ہوں، میں اب بھی حاملہ ہوں یاد سے اُس کی، وہ لڑکی اب بھی مجھ کو یاد آتی ہے۔''

ابھی یہ معصومانہ مشاغل چل رہے تھے کہ سرزمین ہند دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ دو ملکوں کی سرحد کے بیچ درآنے والے شگاف کو پاٹتے ہوئے بے شمار، معلوم تاریخ کے سب سے اندوہ ناک نسلی و مذہبی فسادات ہوئے۔ تقسیم، وچھوڑے اور فسادات کے غم کی برچھی اُس کے اندر تک اُتری ہوئی ہے۔ وہ چلتا ہے تو اُس کا سایہ ہی نہیں، وہ گڑھی برچھی بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، بھلے اندھیری رات ہو، سایہ تو ہو نہیں سکتا، وہ برچھی اُس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اسی غم سے متاثر ہو کر اُس نے منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو مدِنظر رکھتے ہوئے التجا کی تھی۔

مجھے واگھا پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بشن سے جا کے ملنا ہے
بتانا ہے کہ سب پاگل ابھی پہنچے نہیں اپنے ٹھکانوں پر
بہت سے اِس طرف ہیں اور بہت سے اُس طرف بھی ہیں
مجھے واگھا پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والا بشن اکثر یہی کہ کے بلاتا ہے
اُپر دی گڑ گڑ دی منگ دی دال دی لالٹین، دی ہندوستان تے پاکستان

اُدھر دینہ سے سمپورن سنگھ جدائی اور غم کے غار میں ساڑھے نو برس کی عمر میں داخل ہوتا ہے اور غار کے اِدھر سے دِلّی میں گل زار کے بھیس میں نکلتا ہے۔ یہ کایا کلپ نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ شاید ایک پاکستانی ہے جو ہندوستان میں بھٹک رہا ہے۔

اپنے بچپن کی محرومی کا ازالہ گل زار نے کچھ یوں کیا کہ اپنی اکلوتی بیٹی میگھنا کو ماؤں کی طرح پالا۔ وہ چھوٹی سی تھی تو خوب ناز اور لاڈ سے اُس کے جوتوں کے تسمے باندھتے، اُسے طرح طرح کی چیزیں لے کر دیتے، لباس ٹھیک کرتے، کبھی اُس کی ٹائی باندھتے، خود بچہ بن جاتے اور حیران آنکھوں سے دیکھتی میگھنا سے ضد کرنے لگتے۔

اِس معاملے کے پیچھے اپنے بچپن کی محرومی کا عنصر غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوتا نظر آتا ہے۔ ہندوستان آنے کے بعد معاشی خوش حالی نہ ہونے کی وجہ سے گل زار کو بہ طور موٹر مکینک کام کرنا پڑا۔ وہیں اپنے وقت کے معروف فلم ڈائرکٹر بمل رائے نے انھیں دریافت کیا اور ناتراشیدہ پتھر کو تراش کر ہیرے میں ڈھال دیا۔ گل زار نے کپڑے کی دکان پر بھی کام کیا اور اپنے ماموں کے ہاں کیمبل پور (اٹک) میں گڑ کی آڑھت میں بھی ہاتھ بٹایا اور چند ایک مرتبہ گڑ چرا کر کھایا۔ جب ماموں کو پتا چلا تو وہ خاصے غضب ناک

ہوئے۔ یہ بہت پہلے کی باتیں ہیں، پر اتنی بھی نہیں کیوں کہ یہ آج بھی گل زار کا حصہ ہیں، اُن کی باتوں، شاعری اور مکالموں سے یوں ٹپک ٹپک پڑتی ہیں جیسے گنے سے رَس۔ کوہ پر آسمان کھلتا ہے، جیسے کپڑے کا تھان کھلتا ہے۔

اپنا وطن اور اپنے لڑکپن کے کام حساسیت باہم سے مدغم ہوتے ہیں۔ ذکر جہلم کا ہو، بات ہو دینے کی، چاند پکھراج کا، رات پشمینے کی۔

''کپڑے کا تھان''، ''پشمینہ'' اور اپنی بیٹی ''میگھنا'' کا محبت بھرا نام ''بوسکی'' ان کی لطافتِ مزاج کو سنہری رنگ کے مختلف زاویوں میں منعکس کرتا ہے۔ یہ ان کے کپڑے کے کاروبار میں ابتدائی تجربے کی آئینہ کار ہے۔

بچپن کے ذائقے یوں روح کے تالو سے چپک گئے ہیں کہ جب کوئی پاکستان سے جاتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ کیا سوغات لیتا جائے تو انکار کرتے ہیں کہ سبھی کچھ وہاں میسر ہے۔ اصرار حد سے گزر جائے تو کہہ دیتے ہیں ''گڑ لیتے آنا'' اسی گڑ میں اُن کا بچپن گندھا ہوا ہے۔

؎ صبح صبح، اِک خواب کی دستک پر، دروازہ کھولا، دیکھا...... سرحد کے اُس پار سے، کچھ مہمان آئے تھے، ساتھ میں اپنے، پچھلے سالوں کی فصلوں کا، گڑ لائے تھے، آنکھ کھلی تو دیکھا، گھر میں کوئی نہیں تھا، لیکن ہونٹوں پہ میٹھے گڑ کا ذائقہ، اب تک چپک رہا تھا، اور تندور ابھی تک بجھا نہیں تھا، خواب تھا شاید، خواب ہی ہوگا، سرحد پار کل رات سنا ہے، چلی تھی گولی، سرحد پار کل رات سنا ہے، کچھ خوابوں کا خون ہوا ہے!

خوش قسمتی چیل جیسی آنکھیں رکھتی ہے، جو دورانِ پرواز ایک اچٹتی نگاہ سے اپنے مطلب کے جواہر تاک لیتی ہے۔ گئے وقتوں میں جب ہند کے لوگ اپنا زیور صندوقوں سے نکال کر سورج تلے دالانوں، چھتوں، صحنوں میں دھوپ لگانے کو رکھتے تھے تو ان جانے میں چیلیں نیلے آسمان کی وسعتوں سے غوطہ لگا کر اُن میں چمکتی دمکتی سونے کی اشیا کو لے اُچکتی تھیں۔ اسی طرح کی جانچ کاری نے معروف فلمی ہدایت کار بمل رائے کے ذہن میں ورود کیا اور اُس نے دِلّی کی ورک شاپ میں گاڑی ٹھیک کرواتے ہوئے سمپورن سنگھ نامی لڑکے کی ذہانت اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اُسے چُن لیا اور اپنا اسسٹنٹ مقرر کر دیا۔ بمل رائے کی گاڑی اُس وقت خراب ہوتی نہ وہ گاڑی کو اس ورک شاپ میں لاتے اور نہ ہی سمپورن سے ملاقات ہوتی۔ پس زندگی سلسلۂ اتفاقات کے سوا کم ہی ہے۔

بمل رائے اور مولوی مجیب الرحمان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود ان کے موہوم سے تعلق کے بیچ ایک کڑی گل زار کی ہے۔ دینہ سے دِلّی آنے کے بعد اسکول میں مولوی مجیب الرحمان اُردو پڑھاتے تھے۔ وہ کچھ ایسی دل سوزی اور دل جمعی سے اُردو پڑھاتے کہ جماعت کے لڑکوں کو

غالبؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، مومنؔ، ناسخؔ اور دوسرے شعرا کا کلام ازبر کرا دیا۔ وہ غالبؔ کے عاشقِ صادق تھے اور انھیں چچا غالبؔ کہہ کر پکارتے تھے۔ دِلّی کے ایک محلے میں پڑھاتے مولوی مجیب کو احساس تک نہ ہوگا کہ اُن کے سامنے بیٹھے لڑکوں میں سے ایک لڑکا غالبؔ سے کچھ ایسی محبت میں گرفتار ہوگا کہ عکس و فن کی دنیا میں شہرت حاصل کرنے کے بعد ہندستان کی ایک ارب افراد سے بڑھ کر ہندی اور دیگر زبانیں بولتے عوام میں دھیرے دھیرے مدھم ہوتی زبان اردو کی شاعری کے ایک امام، غالبؔ کو ایک ٹی وی سیریز کے ذریعے اس طرح گھر گھر مقبول کرے گا کہ کوئی اُس کی شاعری سمجھے نہ سمجھے، غالبؔ، گالب صاب کو خوب جانے گا۔ وہ اُردو زبان و شاعری کا ہند میں محسن کہلائے گا۔

بلّی ماراں کی وہ پیچیدہ دلیلوں کی سی گلیاں
سامنے ٹال کے نکڑ پہ بٹیروں کے قصیدے
اسی بے نور اندھیری سی گلی قاسم سے
ایک ترتیب چراغوں کی شروع ہوتی ہے
ایک قرآنِ سخن کا صفحہ کھلتا ہے
اسد اللہ خان غالبؔ کا پتا ملتا ہے

یہ کئی دہائی بعد کا معاملہ ہے کہ اس شہرت یافتہ فن پارے کی تحریری شکل کا مقدمہ لکھتے ہوئے شاعر و استاد غالب کے علاوہ بہ طور عام انسان غالب کا تذکرہ کرتے ہوئے گل زار نے لکھا:

''غالبؔ پڑھتے ہوئے وہ بزرگ کے بجائے دوست لگتے تھے۔ غالبؔ کے ہاں تین ملازم تھے۔ ایک کلّو، دوسری تتلاتی وفادار اور تیسرا میں۔ وہ دونوں تو اپنی عمر کے ساتھ رہائی پا گئے، میں ابھی تک ملازم ہوں۔ غالب ایک عام آدمی لگتے ہیں۔ ان کا حد سے زیادہ آموں کا شوق، ان کی وجہ سے پھوڑوں کا نکلنا، پھر پھوڑوں پر مرہم (ملّم) کا استعمال، غالب کا اُدھار لینا، اُسے چکا نہ سکنے پر خفّت کا اظہار مجھے غالب کے قریب لے جاتا ہے۔ کاش میری حیثیت ہوتی اور میں غالب کے سارے قرض چکا دیتا۔ اب حال یہ ہے کہ میں اور میری نسل اس کی قرض دار ہے۔ وہ جوا کھیلتے تھے، شراب بھی پیتے تھے، اس پر پردے نہیں ڈالے، اور شرمندگی کا باعث نہیں بنایا۔ غالب کی شخصیت میں مجھے کوئی بات اوڑھی ہوئی یعنی put on نہیں لگتی۔ جس شخص کے ہاں سات اولادیں ہوئیں اور کوئی زندہ نہ رہی، اُس شخص میں کیا جان ہوگی کہ اُس غم کے باوجود اس کی 'سنس آف ہیومر' (حِسِ مزاح) اپنے دور کے تمام دانش وروں سے الگ صاف سنائی دیتی ہے۔ اس شخص نے دوسری شادی کرنے کا نہیں سوچا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمام نوک جھونک کے باوجود غالبؔ نے اپنی بیگم سے محبت کی اور ان کی عزت کی، ان کے ساتھ اولادوں کے مرنے کا پورا پورا غم بانٹا۔''

گل زار کو غالبؔ اور اردو کلاسیکی شاعری سے محبت مولوی مجیب نے یوں گھول کر پلا دی جیسے پچھلے وقتوں کے پہلوان اپنے پٹھوں کو دیسی گھی دودھ میں گھول کر پلا دیتے تھے۔

قصہ مختصر، گل زار نے بمل رائے کے ساتھ بہ طور اسسٹنٹ کام شروع کیا، گیت نگار تک سفر کیا اور پھر دونوں کا گہرا اسمبندھ ہو گیا۔

''گل زار کا اہم افسانہ ''بمل دا'' درحقیقت بمل رائے کی اصل زندگی کی کہانی اور ان کے سنجوگ کی داستان نظر آتی ہے۔ کہانی ''جوگ اشنان'' کے دن سے شروع ہوتی ہے جس دن الہ آباد میں تروینی کے سنگم پر جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں، کوئی اشنان کرے تو اس کے سارے روگ دُور ہو جاتے ہیں، سارے پاپ کٹ جاتے ہیں۔ اُس روز سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو کے نو سیارے ایک لائن میں آ جاتے ہیں۔ اُسے ''پورن کمبھ'' کا میلا بھی کہا جاتا ہے جب یہاں لاکھوں یاتریوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ 1952 میں ایک بھگدڑ میں یہاں ایک لاکھ لوگ مارے گئے تھے۔ بمل رائے جو بمل دا کے لقب سے جانے جاتے تھے نے اس واقعے پر لکھے گئے سمریش بُسو کے ناول ''امرت کمبھ کی کھوج'' پر فلم بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اپنے مزاج کے مطابق بمل دا نے یہ ناول قریباً حفظ کر لیا تھا، اس کے حاشیوں اور خالی جگہوں پر اتنے نشانات اور نوٹس درج تھے گویا ایک اور مکمل ناول تیار تھا۔ فلم کے لیے ایک سین زیرِ غور تھا جس میں جب ٹرین الہ آباد اسٹیشن کے قریب پہنچتی ہے تو لوگ جذبات میں بھجن گانا شروع کر دیتے ہیں، ایسے میں تپِ دق کا مریض بل رام جو سو سال کی عمر مانگنے اور اپنا مرض چھڑانے جوگ اشنان کو جا رہا ہوتا ہے، لوگوں کے پیروں تلے آن کر مر جاتا ہے۔ بمل دا کو اعتراض تھا کہ یہ موت قبل از وقت ہے۔ یہ سارا معاملہ 1962 میں زیرِ غور آتا ہے۔ ابھی گل زار کی عمر بہ مشکل ستائیس اٹھائیس برس ہے، فلم کا خاطر خواہ تجربہ بھی نہیں، البتہ ذہانت اور شوق موجود ہے۔ نو آموز گل زار، بمل دا کو بہت احترام سے رائے دیتا ہے: ''دادا یہ اکیلی موت ناول کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اسے توازن دیتی ہے۔''

بمل دا عادی تمبا کو نوش ہیں۔ کھانستے کھانستے بات کرتے ہیں، بات کرتے کرتے کھانسنے لگتے ہیں۔

فلم کا منصوبہ چلتا رہتا ہے۔

ایک روز بمل دا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ یہ فلم اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ وہ مصنف جس کی نظر سے کہانی لکھی گئی ہے، جو اُس امرت کی کھوج میں گیا ہے جس سے آدمی کی عمر سو برس ہو جاتی ہے وہ بمل دا خود ہیں۔ انھیں سو سال کی عمر کی خواہش ہے۔

فلم کا سب سے اہم حصہ پورن کمبھ کا وہ میلا تھا جو بارہ برس کے وقفے کے بعد 1964 میں لگنا تھا اور جسے فلمایا جانا تھا۔

فلم پر بحث کے دوران بَل رام کی موت کا واقعہ بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اُسے کب مارا جائے تاکہ فلم میں توازن اور تکنیکی حسن پیدا ہو۔ بالآخر بمل دا کئی مہینوں کے سوچ بچار کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ جوگ اشنان کے دن، صبح پو پھٹتے ہی جب سورج کی پہلی کرن دریاؤں کے سنگم پر پڑے گی، تب بَل رام کی موت واقع ہوگی۔ یہ اُس روز کی پہلی موت ہوگی جو اُس روز بعد میں آنے والی بھگدڑ کا علامتی آغاز ہوگی اور اُسے توازن دے گی۔

سب اُس دن کا انتظار کرنے لگے۔ جوگ اشنان کے روز صبح سویرے اندوہ ناک اطلاع ملتی ہے کہ بمل دا فوت ہو گئے ہیں۔ گویا جس روز بل رام کو مرنا تھا، خود بمل دا فوت ہو گئے۔

انتہائے نزاکت وحساسیت سے گل زار نے بمل دا کا تذکرہ کیا ہے اور ایک موڑ پر لا کر یوں افسانے کو چھوڑ دیا ہے جیسے پرندہ اپنے نومولود کو ہوا میں اُڑنا سکھانے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ بچہ ہَوا میں ڈولتا ہے، قلابازیاں کھاتا ہے اور پھر محوِ پرواز ہو جاتا ہے۔

گل زار کے افسانے بھی یوں مصنف سے جدا ہو کر سُبک اور خود اختیار ہو جاتے ہیں۔ بمل دا نے بھی گل زار کو یوں تیار کر کے فضا میں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کی پرواز گل زار کی اپنی تھی۔

گل زار میں ایک خصوصیت دیگر کے سِوا یہ رہی کہ انھوں نے اپنا رستہ خود بنایا، اپنی منزل خود تخلیق کی۔ ایک دل چسپ بات ہے۔ وہ اہمیت جو کسی موجد کو حاصل ہوتی ہے بعد میں اُس ایجاد کو بہتر سے بہتر کرنے والے پیرو کو حاصل نہیں ہو پاتی۔ ادب اور فن میں جن لوگوں نے خاص طرح ڈالی وہ اُس خاص ترکیب کے بانی کہلائے اور قدر پائی۔

ہندی سینما درحقیقت اردو سینما ہی رہا ہے۔ تہذیبی ولسانی لحاظ سے بھارتی فلم 'مغلِ اعظم' سے لے کر ''پاکیزہ'' تک، ''رضیہ سلطانہ'' سے لے کر ''اجازت'' تک، اپنے مکالموں، گیتوں، معاشرتی اقدار وروایات کے حوالے سے ہندی مسلم تہذیب کے قریب تر رہی۔ ابھی یہ زیادہ پرانی بات نہیں نوے کی دہائی کے وسط تک دوردرشن پر ہندوستان سے فلم چلتی تھی تو ابتدائی تعارف ہندی کے ساتھ اردو جلی الفاظ میں ہوتا تھا۔

پاکستانی معاشرت ہندی مسلم معاشرت ہی کا تسلسل ہے سو گویہ فلمیں جغرافیائی طور پر بھارت میں فلمائی گئیں لیکن ان پر اردو زبان اور مسلم معاشرت کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔ یوں یہ پاکستانی تہذیب سے قطعی طور پر متعلقہ ہیں۔ ہندستان کی اردو فلم کے حوالے سے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اُس کے بنیادی اجزا میں موسیقی اور شاعری اہم ترین جزو ہیں۔ ابتدائی فلموں میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی وغیرہ سرخیل شعرا تھے۔ ان کی تربیت اردو کی تھی اور شاعری کا مزاج کلاسیکی رومانی تھا۔ بعد میں جب گل زار اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو جدید اُردو نظم کا ساذائقہ کچھ عیاں کچھ نہاں انداز میں رسیلے

استعاروں اور دمکتے الفاظ کے ساتھ سامنے لے کر آتے ہیں۔ وہ تین حوالوں سے اہم مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اپنی دھیمی بھینی مہک والی حساس ہدایت کاری، تہ در تہ کھلتی پھول کی کلی کی سی مکالمہ نگاری اور دمکتی لہراتی تلواروں کے رقص کی سی شاعری۔ چناں چہ وہ ایک نئے انداز کے موجد ٹھہرتے ہیں اور ٹرینڈ سیٹر کہلاتے ہیں۔ اس تخلیقی ارتقا کے دوران اُن کا اچھا خاصا وقت ساحر لدھیانوی کے ساتھ گزرتا ہے۔

ساحر جب بہت موڈ میں ہوتے تھے تو پنجابی بولتے تھے اور گل زار کا بھی جب دامِ معاشرت میں دم گھٹنے لگے تو پنجابی بول کر جی ہلکا کر لیتے ہیں۔

ایک بار ساحر کے پرانے دوست اوم پرکاش اشک نے ساحر سے پنجابی میں پوچھا کہ وہ مخمور ہو کر گالم گلوچ پر کیوں اُتر آتے ہیں تو ساحر نے تڑ کی بہ تڑ کی پنجابی میں جواب دیا ''ایہدے نال کُجھ چٹپٹا وی ہونا چاہیدا اے'' (اس کے ساتھ کچھ چٹ پٹا بھی تو ہونا چاہیے)۔

پچاس کی دہائی میں فن کی کشتی میں قدم رکھنے والے گل زار نے اُسے کچھ ایسا سینچا کہ اس فن کے مہان ہوئے۔ فلم ''بندنی'' میں لتا منگیشکر کا گایا ہوا ''مورا گورا انگ لائے لے'' کو شہرت ملی تو ''خاموشی'' کا گانا ''ہم نے دیکھی ہے اُن آنکھوں کی مہکتی خوشبو'' اُنھیں بامِ عروج تک لے گیا۔

اسی دوران اُن کا بہت قریبی تعلق مینا کماری سے رہا۔ وہ شاعرہ بھی تھی اور بھٹکتی اداس روح بھی۔ پس کچھ ایسا سنجوگ ہوا جو مارچ 1972 میں 39 برس کی عمر میں اُس کے انتقال پر ظاہری طور پر ختم تو ہوا پر اندر ایک شعلہ اُسی طرح دہک رہا ہے جیسے ڈیلفی کے مندر میں یونانی وقتوں میں ایک شعلہ ہر وقت فروزاں رہتا تھا۔

گل زار نے اپنی شاعری کی پہلی کتاب ''جانب'' مینا کماری کے نام کی تھی۔

بعد ازاں فلموں کی شاعری، مکالمہ نگاری اور ڈائریکشن میں ایک سے بڑھ کر ایک شاہ کار عکسی فن پارے تخلیق کیے۔ ''کوشش''، ''آنند''، ''نمک حرام''، ''اچانک''، ''معصوم''، ''آندھی''، ''گھروندا''، ''کنارا''، ''بسیرا''، ''اجازت''، ''ماچس''، ''دل سے''، ''ساتھیا'' اور بے شمار دیگر فلموں کو collectibles (نوادر) کا درجہ مل جاتا ہے۔ وہ اردو/ہندی سینما میں ستیہ جیت رے، گورودت اور بمل رائے کے ساتھ عہد ساز آدمی ہیں۔

گل زار کی راکھی سے شادی ایک ایسا رومانی واقعہ تھا جو آج تک ہندوستان کی فلمی تاریخ کا ایک یادگار باب ہے۔ اُن کے بیچ آج تک بیٹی میگھنا کی وجہ سے طلاق نہیں ہوئی تا کہ اُس پر بُرے اثرات نہ آئیں۔ وہ بچی علیحدگی کے وقت فقط ایک برس کی تھی۔ گل زار کو راکھی سے شدید عشق تھا۔ عشق کی لَو تو آج بھی اُن کے اندر حرارت دیتی ہے۔ ''راکھی کی آنکھیں سحر خیز تھیں، بہت خوب صورت تھیں'' ایک مرتبہ انھوں نے اُس کے حسن کا دم بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم برتنوں کی طرح آپس میں بجتے رہتے تھے، اسی لیے علیحدگی ہی بہتر حل تھا۔'' وہ علیحدہ تو ضرور

ہوئے مگر جدا نہیں ہوئے۔ دینہ سے علیحدگی، اپنے وطن سے علیحدگی، باپ کی ناگہانی موت پر اپنے باپ سے علیحدگی، موت کے بعد بمل دا سے علیحدگی اور موت ہی کے بعد مینا کماری سے علیحدگی کے بعد زندگی ہی میں راکھی سے علیحدگی ایک گہرا جذباتی صدمہ لے کر آئی۔ اسی علیحدگی نے اُن سے ''اجازت'' کا گانا لکھوایا ''میرا کچھ سامان تمھارے پاس پڑا ہے، ساون کے کچھ بھیگے بھیگے دن رکھے ہیں، اور میرے اِک خط میں لپٹی رات پڑی ہے، وہ رات بجھا دو، میرا وہ سامان لوٹا دو'' اور جدائی کے ٹیسیں دیتے گیت لکھوائے۔ حساس روح بُری طرح گھائل ہو چکی تھی۔ اُن کے ہاں وچھوڑے اور تنہائی کا غم انھی بیجوں سے پھوٹتا ہے۔

پس اس کا حل انھوں نے میگھنا، مصروفیت، مطالعے، ''پالی'' اور اب ''سمے'' کی صورت میں نکال رکھا ہے۔

گل زار کی بہ طور فلمی نغمہ نگار ایک اہمیت تو تھی ہی مگر ادبی لحاظ سے وہ وقعت نہ تھی جس کے وہ مستحق تھے۔ اُن کے ہاں اردو کے اہم ادبی رسائل باقاعدگی سے آتے ہیں۔ چناں چہ ایک روز انھوں نے عہد ساز ادیب احمد ندیم قاسمی صاحب کو خط لکھ ڈالا۔ قاسمی صاحب کی جانب سے حوصلہ افزا جواب آنے پر خطوط کا سلسلہ چل نکلا۔ قاسمی صاحب کی بے پایاں شفقت نے گل زار کو مقروض کر دیا۔

میں قاسمی صاحب کے مقربین میں سے تھا، گواہ ہوں کہ احمد ندیم قاسمی صاحب گل زار صاحب کے اشعار کی اصلاح کرتے وقت ایک خاص چھلکتی ہوئی محبت سے معمور ہوتے تھے۔ وہ گل زار سے باقاعدگی سے بات کرتے، شاعری کی درستی کے بعد اُسے اعلیٰ شاعری کے انتخاب میں اپنے مستند ادبی رسالے ''فنون'' میں جگہ دیتے، افسانوں کو سجا کر فہرست میں شامل کرتے۔ اُن کی راہ نمائی میں بڑائی کا شائبہ تک نہ ہوتا، شفقت ہوتی، بے پایاں نرمی اور وضع داری ہوتی۔ کبھی نہ تو جتلایا اور نہ ہی عمدہ تخلیق کو شامل کرتے ہوئے تردّد کیا۔ چناں چہ دونوں میں جذباتی سطح پر ایک ایسا تعلق بنا جس میں قاسمی صاحب گل زار کے ''بابا'' ٹھہرے۔

گل زار یقیناً ایک پارکھ ہیں۔ پاکستان میں اُردو کے دو اہم ترین اور وضع داری میں بے مثل بر جوں کے مقرب ٹھہرتے ہیں۔ لاہور کے احمد ندیم قاسمی اور کراچی کے شکیل عادل زادہ۔

ایک مرتبہ قاسمی صاحب علیل ہو گئے۔ دمے اور سانس کی تکلیف کے باعث آخری دنوں اُنھیں اسپتال میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ اِس مرتبہ حالت کچھ ایسی بگڑی کہ گل زار ''بابا'' کی عیادت کو بمبئی سے لاہور بھاگے چلے آئے۔ یہ اُن کی بابا سے پہلی ملاقات تھی، دوسری ملاقات کچھ دور تھی۔ بابا کے ہاتھ تھامے اور اعلان کیا ''میں آج جو بھی ہوں، بابا کے کندھوں پر کھڑا ہوں''

گل زار کی زندگی کا ایک راز آج تک صرف گنتی کے لوگوں کو معلوم تھا۔ آج یہ بھی طشت از بام ہوا جاتا ہے۔

وہ رازِ دروں کچھ یوں ہے۔

گل زار صاحب نے مختصر تاثراتی افسانے میں خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ چناں چہ ایک مرتبہ طے ہوا کہ پاکستانی ہدایت کار و پیش کار ایوب خاور اور حسن ضیا گل زار صاحب کے افسانوں پر ڈرامے بنائیں گے۔ سو مختلف افسانوں کا انتخاب کر کے ایک دلآویز جڑاؤ ہار تیار کیا گیا جسے ''گل زار کلاسیک'' کا نام دیا گیا۔

یہ سیریز پاکستان کے ایک ٹی وی چینل پر نشر ہوئی اور کاروباری طور پر خاصی کام یاب رہی۔ جب ڈرامے کی آمدنی گل زار صاحب کو پیش کرنے کی بات ہوئی تو انھوں نے حسن ضیا کو ہدایت کی کہ سارا منافع ''بابا'' کی نذر کر دیا جائے۔ حسن ضیا خاص طور پہ لاہور گئے اور وہ رقم قاسمی صاحب کو احترام اور ممنونیت کے ساتھ پیش کی گئی۔ یہ ایک ایسے فن کار کی جانب سے اپنے اُستاد کو ہدیۂ تبریک تھا جس نے ایک بار کہا تھا کہ اگر وہ غالب کے دور میں زندہ ہوتا اور استطاعت رکھتا تو غالب کے سبھی قرض چکا دیتا۔ والہانہ نیاز مندی ایک بجھتا چراغ ہے، لوٹمٹماتی ہے، جانے کب شعلہ بکھر جائے۔

مصروفیت کے معاملات کچھ یوں ہیں کہ گل زار ایک ڈسپلن کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ سحر خیز ہیں، چالیس سال سے روز صبح ٹینس کھیلتے آ رہے ہیں، ناشتے کا وقت مقرر ہے، اُس کے بعد اُن کے سیکریٹریٹ کا وقت ہے جہاں فلم، ادب وغیرہ کے علیحدہ حصے ہیں۔ شام کو باقاعدگی سے دو گھنٹے اپنے نواسے ''سمے'' کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اُن کی بیٹی میگھنا شکوہ کناں ہوتی ہے کہ وہ سمے کو کسی غلط کام پر بھی ڈانٹ پڑنے نہیں دیتے۔ رات ٹھیک آٹھ بجے کھانا کھا لیتے ہیں۔

ستر برس کی عمر کے بعد سفید لباس کو زندگی کا حصہ بنا لیا۔ کہتے ہیں ''سفید لباس مجھے ڈسپلن اور ترتیب کا احساس دلاتا ہے۔''

برج Leo اسد ہے، سو کچھ ضدی بھی ہیں۔ سودا سر میں سمائے تو اپنی کر گزرتے ہیں۔ اس عمر میں بھی اتنی محنت کرتے ہیں کہ خود ہی کہتے ہیں ''میں کلرک کی طرح کام کرتا ہوں۔''

ان کے اِسی ضدی مزاج کا شاخسانہ ہے کہ آج بھی بمبئی بیٹھے اپنا بچپن مانگ رہے ہیں، اپنی جنم بھومی مانگ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پاک و ہند کے درمیان نفرتیں غیر فطری ہیں۔

یہ 1996 کا واقعہ ہے، پاکستان اور بھارت کی باہمی کشیدگی میں تیزابی زہر کی آمیزش ہو رہی تھی۔ اسی سال گل زار نے فلم ''ماچس'' پیش کی جس کے گیت اپنے وطن جہلم، دینہ کی یادوں کی کسک میں شرابور تھے۔ ''چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں'' یا ''پانی پانی رے'' میں اپنے گھر کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں ''پانی پانی ان پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے اُتر جانا، دھواں دھواں کچھ وادیاں بھی آئیں گی گزر جانا، اِک گاؤں آئے گا میرا گھر آئے گا، جا میرے گھر جا''۔ ایک کسک، ایک Longing، ایک حسرت گل زار کی تخلیق میں اُتر آتی ہے۔

پاکستان سے اُن کے قریبی دوست حسن ضیا پچھلے دنوں پاکستان سے بمبئی گئے تو اُن سے تختیاں، دوات اور قلم لانے کی خواہش کی۔ اُن کی مشق اُس دور کے طرزِ تحریر و خطاطی کی ہے سو بچپن کی سوغاتیں منگوائیں۔

ایک ملاقات میں حسن ضیا بتانے لگے کہ گل زار کا کمرا اُردو کتابوں سے بھرا رہتا ہے، غالب کے عاشق اور فیض و فراز کو پسند کرتے ہیں، مستنصر حسین تارڑ کے افسانے ''بابا بگلوس'' پر نظم بھی لکھی، تارڑ صاحب کا شفیق انداز میں تذکرہ کرتے ہیں، انتظار حسین کے ساتھ گجک کے تحفے کا تعلق رہا ہے اور ان کے فن کے معترف ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی تصویر فریم کروا کر سامنے لگا رکھی ہے۔ قاسمی صاحب کے تذکرے پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔

میں نے بے اختیار حسن سے کہا ''وہ تو پورے پاکستانی ہیں۔ ہندوستان میں بھٹکتے پاکستانی''

میرے استاد اور مربی شکیل عادل زادہ سے تو گل زار کا کچھ ایسا قلبی تعلق ہے کہ جب کبھی شکیل بھائی کو کوئی فون آئے اور وہ بیٹھے ہوئے کھڑے ہو کر ٹہلنے لگیں اور مسرت اُن سے چھپائی نہ جائے تو میں سمجھ جاتا ہوں، گل زار جی کا فون ہوگا۔ پہلے احمد ندیم قاسمی تھے جنھوں نے چند مرتبہ میری گل زار سے بات کروائی بلکہ اُن کی منہ بولی بیٹی منصورہ ضد کر کے رسالے کے لیے فرمایشی تحریر لکھوا لیتی تھیں (گل زار اُن سے کچھ ناراض بھی ہوئے کیوں کہ انھوں نے گل زار کی چند ایک نظموں کے عنوانات از خود بدل دیے تھے)، قاسمی صاحب کے بعد شکیل بھائی ہیں جن کے توسط سے گل زار جی سے بات ہو جاتی ہے، رابطہ ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ تو گل زار چوری چھپے کراچی آئے، شکیل عادل زادہ کے گھر چند گھنٹے گزارے اور واپس ہندستان چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد سب کو خبر ہوئی۔ شکیل بھائی، گل زار کی بے لوث محبت اور وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے بھیگ بھیگ جاتے ہیں۔

گل زار کے ہاں ایک پہلو قابلِ ذکر ہے۔ یہ پہلو ایک اہم تخلیق کار کو ہر سطح پر قبولیت دلواتا ہے۔ وہ پہلو ہے یک ساں طور پر خواص و عوام میں مقبول ہونا۔ گویا اُن کی تہ در تہ فلم سینما کی بالکونی میں بیٹھے متمول آدمی کے لیے بھی ہے اور اسٹال میں بیٹھے عام آدمی کے لیے بھی۔ دو مختلف ذوق کے حامل لوگوں کے لیے ایک فن پارہ تخلیق کرنا جو ہر کسی کی تخلیقی و جذباتی تسکین کرے، امرِ محال ہے اور اس بھاری پتھر کو گل زار کئی دہائیوں سے یوں اُٹھائے پھر رہے ہیں گویا ہتھیلی پر مور پنکھ دھرا ہے۔

ایک خاص انکسار آمیز خوبی ہے جو ان کی ذات کے گرد ہالہ کیے رہتی ہے۔ یہی خوبی ہے جو ان کو نئے علوم سیکھنے پر آمادہ رکھتی ہے۔ خود پرست اور متکبر لوگ تو بند قبروں کی طرح ہوتے ہیں جن میں انا کے ابوالہول مدفون ہوں، تازہ ہوا اور روشنی کا گزر نہیں ہوتا اور عاجز، معصوم وضع دار لوگ بھرے باغوں کی طرح ... دل کو

خوب صورت کر کے خوشبو سے مہکا دیتے ہیں۔

گل زار نے اپنے بچپن میں تقسیم کے وقت اتنا خون دیکھا کہ مذہبی عصبیت کی کوکھ سے جنم لینے والی خون خواری اور ہر قسم کے تعصبات سے دور جا چکے ہیں۔ بھوپال میں معذور نابینا بچوں کے ادارے ''اروشی'' کے بانیان میں سے ہیں۔ نابینا ہونے کے حوالے سے ایک پُرلطف واقعہ ذہن میں آتا ہے۔

معروف اداکار نصیر الدین شاہ کراچی آئے تو ان کے ساتھ نشست کا اہتمام کیا گیا۔ گفت گو کے دوران بتانے لگے کہ بعض لوگوں کا عمومی تاثر کچھ ایسا بن جاتا ہے جو قطعی طور پر غلط ہوتا ہے۔ عام طور پر فلموں میں اندھے لوگوں کو تقدیر کا شکوہ کرتے اور دکھی دکھایا جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس بہت سے نابینا افراد بھرپور زندگی خوش مزاجی سے گزار چکے ہیں اور گزار رہے ہیں۔ ایک ایسے ہی کام یاب کاروباری نابینا چیف ایگزیکٹو نے نصیر الدین شاہ کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ گفت گو خوب مزے کی رہی۔ وہاں نصیر الدین شاہ نے مشاہدہ کیا کہ نابینا افراد چوں کہ اپنی سماعت پر بہت انحصار کرتے ہیں چناں چہ اُن کے چہرے کے تمام نقوش سماعت کے دوران ہمہ تن گوش ہوتے ہیں۔ گویا چہرہ کچھ آواز کی جانب کھنچ جاتا ہے۔ دورانِ گفت گو نصیر الدین شاہ نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ وہ پیدائشی نابینا ہونے کے باوجود رنگوں کا تصور اور پہچان کس طرح کرتے ہیں۔ انھیں تو رنگوں کا تصور بھی محال ہوگا۔ اس پر میزبان نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ انھوں نے اپنے ذہن میں چند خود ساختہ طریقے وضع کر رکھے ہیں جن سے رنگوں کی پہچان ہوتی ہے۔ کھانے کے بعد جب سب پہلی منزل پر واقع ڈائننگ روم سے رخصت ہو کر شان دار سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے تو ایک دم اندھیرا ہو گیا۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ سب اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ اس پر میزبان نے پوچھا کہ سب کھڑے کیوں ہو گئے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ بتی چلی گئی ہے تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا، اب تک میں آپ لوگوں کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اب آپ لوگ میرے پیچھے آئیں۔ یہ کہہ کر نابینا میزبان اعتماد سے سیڑھیاں اُترنے لگے۔

ایسے معاملات پاک و ہند میں نصیب والوں کے ہوتے ہیں کہ کسی جسمانی آزمائش کے باوجود کام یاب زندگی گزاریں۔ وگرنہ معاشرتی رویے اور معاشی وسائل کی کم یابی ایسے بچوں کے لیے خوش حال و مستقبل کے راستے بند تو نہیں کرتی البتہ رکاوٹیں کھڑی کر دیتی ہے۔ گل زار نے ایسے بچوں کی ابتلا کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ منصوبہ شروع کر رکھا ہے۔

معصوم بچے گل زار کے مکانِ دل میں روایتی وسطی گول کمرا سنبھالے ہوئے ہیں۔

معصوم بچے کا کردار ان کے کئی فلموں، کہانیوں، نظموں میں در آتا ہے۔ فلم ''معصوم'' کا راہول ہو، یا نظم ''کھلونے'' کی منو۔

منو اکثر یہی پوچھتی ہے دائی ماں سے...... ''ماں! کھلونے بھی بڑے ہوتے انھیں بھی عمر لگ

جاتی.....تو کیا ہوتا؟''

حقیقی زندگی میں خوب صورت معصوم بچی بوسکی تھی، اب اُس کا اور اس کے پُر وقار شوہر گووند کا بیٹا ''سے'' ہے۔

ان کا پالتو کتا ''پالی'' اُن کے گھرانے کا ایک اہم فرد تھا۔ جب خالی گھر کی اداسی اور تنہائی، بنیادی طور پر الگ تھلگ رہنے والے کوی اور ادیب کو آن لیتی تو اُن کا ئبل ڈاگ ''پالی'' اُن کا ساتھی ہوتا۔ انھوں نے اپنے کمرے میں ایک مخصوص جگہ بنا رکھی تھی جہاں پالی آ کر بیٹھتا تھا۔ گل زار اپنے کام اور کتابوں میں مگن آرام کرسی پر جھولتے رہتے اور وہ سر نیہوڑائے اُنھیں تکتا رہتا۔ گویا وہ ان کی زندگی کی فلم کا ایک کردار بن چکا تھا۔ ہیرو اور اُس کا وفادار کتا۔ بہر حال تیرہ چودہ برس کے ساتھ کے بعد وہ اپنی طبعی عمر پوری ہونے پر فوت ہوا تو گل زار صاحب کو حد درجہ رنجیدہ کر گیا۔ انھوں نے اپنی تنہائی کے اُس ساتھی پر نظم بھی لکھی اور اُس کی تصویر اپنی دفتری میز کی ایک جانب فریم کر کے رکھی ہوئی ہے۔ ایک اور تصویر اپنے نواسے ''سے'' کی بھی ہے۔

خود مگن اور فنافی الفن لوگ انھیں زیادہ متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے تین برس بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعے کے انتساب میں لکھتے ہیں ''بابا! آپ نے جس افسانے کو اُنگلی پکڑ کے سہارا دیا تھا، وہ اب چلنے لگا ہے۔'' ایسا دردل رکھنے والا نقاش اُسی مجموعے میں شامل اپنی شاہ کار کہانی ''مائکل اینجلو'' میں ایک جنونی، خبطی جینئس مائکل اینجلو کا حقیقی واقعہ لکھتا ہے:

''پانچ سال پہلے جب مائکل اینجلو روم واپس لوٹا تھا تو گھنٹوں سینٹ پیٹرز کے گنبد کے نیچے لیٹ کر آپ ہی آپ کچھ بڑبڑایا کرتا تھا، کچھ بولتا رہتا تھا۔ جولیس کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا۔ ایک بار اس نے بہت پاس جا کر سنا تو وہ بائبل کے کچھ وعظ دُہرا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو اینجلو؟''

''اوں؟'' اس نے چونک کر دیکھا تھا۔ ''آیتوں کی پٹیاں کھول رہا ہوں۔''

جولیس ثانی جانتا تھا، وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ان اینٹ گارے اور چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں وہ چہرے ڈھونڈ رہا تھا۔ یسوع کا چہرہ، مریم کا چہرہ، پطرس، یوحنا اور یہودہ کا چہرہ۔ وہ جن کے ہاڑ ماس کے پاؤں تو نظر آتے تھے لیکن چہرے بائبل کی آیتوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

جبرئیل کی صورت کے کئی خاکے اس نے کاغذوں پر بنائے تھے۔ جولیس نے پوچھا تھا ''جبرئیل کا خاکہ کیسے بنایا تم نے؟ وہ تو اس خاکی دنیا سے نہیں ہے۔''

''اس کی آواز سنی تھی۔ پرانے عہد نامے میں!''

''تو پھر خدا کی آواز بھی سنی ہو گی تم نے!'' جولیس نے مذاق کیا تھا۔

''اس کی خاموشی سی تھی!''

جولیئس کو یقین ہو گیا تھا، اس نے صحیح مصور کا انتخاب کیا ہے۔ ''سنکی ہے!''

مریم کا ماڈل اینجلو نے اپنی ماں سے چنا تھا اور اس روز چنا تھا جس دن اس نے اپنی ماں کو ایک بانس پر پانی کے دو ڈول لٹکا کر کندھوں پر اٹھاتے دیکھا تھا۔ ایسی ہی کوئی توانا عورت ہو گی جس نے نبی کا بوجھ اپنی کوکھ میں سنبھالا ہو گا۔

اس رات اس نے چولھے کے پاس بیٹھے ماں سے کہا بھی تھا۔ ''تُو نے یسوع کو جنم کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ تیرا باپ مل گیا تھا۔ وہ دیکھ شراب پی کے دھت پڑا ہے۔ جا سنبھال اسے!''

اپنے باپ کو دکھانے کے لیے اس نے اسی وقت ایک گتے پر بڑا سا اسکیچ بنا کر اس کے پلنگ پر لٹکا دیا تا کہ وہ دیکھ لے کہ پینے کے بعد وہ کیا لگتا ہے۔ نیچے لکھا تھا ''اب اگر تو یہ نہ ہوتا تو ماں مریم ہوتی!''

لیکن اس کی ماں کو وہ اسکیچ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ آخر تک اس سے کہتی رہی۔

''ایسا ہی ایک بت بنا دے نا اپنے باپ کا۔ وہ بہت معصوم لگتا ہے!''

اور وہ ہمیشہ یہی کہہ کے ٹالتا رہا......

''کوئی سنگ مرمر ہی نہیں ملتا جس کا کردار میرے باپ سے میل کھاتا ہو''

اپنی شاعری کے گائیک اور قریبی دوست جگجیت سنگھ کی بیماری کے دوران بھی وہ بہت مضطرب اور پریشان تھے۔ موسیقی سے تو انھیں لگاؤ تھا ہی، جگجیت سنگھ جیسے شان دار دوست کی حالت نے انھیں افسردہ کر دیا تھا۔ موسیقی کے بارے میں گل زار نے کہا تھا۔

''موسیقی قدرتی طور پر ہماری زندگیوں میں شامل ہے۔ پوجا پاٹ کے اشلوک، گوالے کی سیٹی، گا بجا کر گاتے فقیر، بھجن گاتی، گنگناتی مصروف ماں، موسیقی ہماری زندگیوں کے خلا کو بھر دیتی ہے۔''

اُن کے گیتوں میں متنوع تجربات کے حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ کی بات برمحل ہے۔ ''صرف وہی جو دور تک جانے کا خطرہ مول لیتے ہیں، جان سکتے ہیں کہ کتنی دور تک جایا جا سکتا ہے۔'' مشق سخن اور فن کے حوالے سے ارسطو نے کہا تھا ''ہم وہی ہیں جو ہم دہراتے رہتے ہیں۔ غیر معمولی صلاحیت ایک خوبی نہیں بلکہ مسلسل ریاض اور عادت کا نتیجہ ہے۔''

گل زار کی والہانہ جذباتی وابستگی کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ اُن کا فلم ''دل سے'' کا معروف گانا ''چھیاں چھیاں'' جو 2002 کے 155 ممالک کے سروے کے مطابق دنیا کے تب تک کی تاریخ کے دس مقبول ترین گانوں میں شامل رہا اور اس گانے نے بھارت میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنائے، اُن کی اُردو زبان، صوفیانہ کلام اور ریل کار کے سفر سے وابستگی کا مظہر ہے۔

''چھیاں چھیاں''، بُلھے شاہ کے کلام ''تھیا تھیا'' سے متاثر ہو کر لکھنا اُن کے تصوف کی جانب رجحان کی علامت، اُس کے بول ''وہ یار ہے جو خوشبو کی طرح ہے جس کی زباں اردو کی طرح، میری شام رات میری کائنات، وہ یار میرا، سیاں سیاں'' اُن کی اردو سے بے پایاں محبت اور ٹرین پر اس گانے کا فلمایا جانا اُن کی ریل کے ساتھ بچپن کے لگاؤ اور محبت کے عکاس ہیں۔

والہانہ لگاؤ تو اُن کا اپنے والد سے بھی تھا۔ آج جب وہ پیرانہ سالی کے زینے پر قدم رکھ چکے ہیں تو اپنے والد سردار مکھن سنگھ کو بری طرح یاد کرتے ہیں۔ قریبی احباب میں اپنے دکھوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اپنے والد کی موت پر بھائیوں کی طرف سے بروقت اطلاع نہ دیے جانے پر دِلّی نہ پہنچ پانا، اُن کا بہت بڑا غم ہے۔ وہ اُن دنوں بمبئی میں بمل دا کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ چناں چہ والد کی موت اور ان کی شمشان گھاٹ میں چِتا جلنے کی آخری رسوم میں شرکت نہ کرنے کی حسرت نے ان کے اندر ایک خلا پیدا کر دیا۔ وہ کہتے ہیں ''میرا باپ مر چکا تھا، مگر میرے اندر زندہ تھا'' اس خلا کو پانچ سال بعد بمل دا نے تب بھرا جب وہ جوگ اشنان والے دن فوت ہو گئے۔ یوں بمل دا، جن کی بیماری کے دوران گل زار روز رات بے چارگی میں روتے تھے، کی چِتا کو جلاتے ہوئے گویا اپنے باپ کی چِتا جلانے کی حسرت کو بھی گل زار نے وہیں پورا کر لیا۔

گل زار بنیادی طور پر تنہائی پسند ہیں۔ بیتے لمحے اُن کے اندر کبھی سرد راتوں میں کوئلوں کی طرح دہک اٹھتے ہیں۔ کمال کی یادداشت پائی ہے۔ پرانی یادیں آج بھی انھیں ستاتی ہیں۔ جب لاہور آئے تو روزے سے تھے، گردوارے میں رسمی ماتھا ٹیکا اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے دوسری ملاقات کرنے قبرستان چلے گئے۔ قبرستان میں قاسمی صاحب کی قبر پر پھول ڈالے، اُن کے لیے دعا کی اور خاصی دیر اپنے بابا کے سرہانے مغموم کھڑے رہے۔ اس کے بعد دینہ میں اپنے آبائی گھر گئے، وہاں کے درو دیوار پر ہاتھ پھیرتے رہے، ریلوے اسٹیشن پہنچے تو ننھے سمپورن سنگھ کالرا بن گئے جو اپنے باپ کی راہ تکا کرتا تھا۔ وقت گویا تھم گیا، وہ واپس بچپن میں لوٹ گئے۔ زندگی رواں دواں تھی۔ اُن کے سوتیلے بہن بھائی گھر پر اور محلے میں کھیل رہے تھے، سمپورن سنگھ مدرسے اور کھیل کود کے بعد اپنے باپ کو لینے اسٹیشن کے بینچ پر پیر جھلاتا منتظر تھا۔ سامنے نل بہہ رہا تھا اور ایک چڑیا اس سے پانی پی رہی تھی۔ ٹرین کی سیٹی بجی۔ خواب ٹوٹ گیا۔ سمپورن کا باپ مر چکا تھا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔ خواب تھا، شاید خواب ہی ہو گا۔ اُس اسٹیشن پر وہ ٹرین نہ آنا تھی نہ آئی۔ گل زار کا دل مسلا گیا۔ انھوں نے پاکستان کا بقیہ پروگرام موخر کیا اور ہندستان لوٹ گئے۔ اُن کی نظم 'رفیوجی' ہے۔

ہم سب بھاگ رہے تھے، ریفیوجی تھے، ماں نے جتنے زیور تھے، سب پہن لیے تھے، باندھ لیے تھے......،
چھوٹی مجھ سے...... چھ سالوں کی، دودھ پلا کے، خوب کھلا کے، ساتھ لیا تھا، میں نے اپنی ایک ''بھمیری'' اور

اک ''لاٹو''، پاجامے میں اُڑس لیا تھا......رات کی رات ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، ریفیوجی تھے......ماں نے دوڑتے دوڑتے خون کی قے کر دی تھی، جانے کب چھوٹی کا مجھ سے چھوٹا ہاتھ، وہیں اُسی دن پھینک آیا تھا اُپنا بچپن......لیکن میں نے سرحد کے سناٹوں کے صحراؤں میں اکثر دیکھا ہے، ایک ''بھمیری'' اب بھی ناچا کرتی ہے، اور ایک ''لاٹو'' اب بھی گھوما کرتا ہے......!

گل زار کی آواز ایوانِ رنگ و بُو میں یوں اپنی للک کے ساتھ گنگنا رہی ہے جیسے گردوارے میں پاٹھ، مندر میں پوجا پاٹ، کلیسا میں گھنٹیاں گنگنا رہی ہوں، دیوداسیاں تبت اور لنکا کے بدھ آشرموں میں بھجن گا رہی ہوں یا مساجد و خانقاہوں میں پاک کلام کی لحن میں تلاوت جاری ہو۔ ایک پاکیزگی ہو، بلاوا ہو اور محبت کی نرم و سُبک ہوا ہو جو زخمی روح کو سہلاتی ہوئی، تھپکیاں دیتی ماں ورتا لوریاں سناتی پرسکون سحر گاہ کی جانب یوں لے چلتی ہو جیسے کوئی سنہرا پرندہ اُونی بادلوں سے اوپر سورج کی شعاؤں میں دمکتا تیرتا نامعلوم کی جانب معدوم ہوتا جا رہا ہو۔

وارث

امجد اسلام امجد

''نیلی ساڑھی میں ملبوس فریدہ خانم دیال سنگھ مینشن، مال روڈ پر واقع شیزان کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آئیں اور میں حیران رہ گیا۔''

امجد اسلام امجد صاحب نے کھوئے ہوئے لہجے میں یہ عجب ماجرا سُنایا۔

سردیوں کی ایک رات ہم لاہور کی متمول اور پرسکون آبادی ڈیفنس کے بنگلے میں بیٹھے گفت گو میں مشغول تھے کہ بات ماورائی اور عجیب وغریب واقعات، تجربات اور مشاہدات کی جانب نکل گئی۔ باہر اندھیرا تھا اور بستی کے اس مکان کے مہمان خانے کی کھڑکیوں پر پڑے دبیز پردوں کی درزوں سے جھانکتی بلبوں کی مدھم ٹمٹماتی روشنی بیرونی دیوار تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتی تھی۔ مہمان خانے کے اندر اہم ادیب اور نام وَر شاعر امجد اسلام امجد صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔ گزشتہ برسوں کی کئی شہروں پر محیط درجنوں ملاقاتوں میں پہلے کبھی Deja vu، یعنی اشتباہ کہ گویا یہ واقعہ پہلے کہیں بیت چکا ہے اور تجربے مشاہدے میں آچکا ہے، کے موضوع پر بات نہ ہوئی تھی۔ ایسا بہت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ اُنھیں کسی اجنبی شخص کو مل کر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ پہلے مل چکے ہوں، کسی مقام پر جا کر لگتا ہے جیسے وہ دیکھا بھالا ہو اور وہ اِدھر آچکے ہوں اور کوئی واقعہ یا وقت کا ٹکڑا یوں محسوس کراتا ہے جیسے وہ خوب جانا پہچانا اور تجربے میں آیا ہوا ہو اور پہلے بسر ہو چکا ہو۔

امجد صاحب واقعہ سنانے لگے ''یہ قریباً تیس برس پہلے، اسّی کی دہائی کا واقعہ ہے، مجھے شہزاد احمد نے فون کیا کہ فریدہ خانم آئی ہوئی ہیں۔ ہم نے شیزان میں اُن سے ملاقات طے کرلی۔ ہم متعین وقت پر وہاں پہنچ گئے اور گپ شپ کرنے لگے۔ بات چیت کے دوران میں کسی خیال میں کھو کر خاموش ہو گیا۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک بیرا ٹرے پر چائے کی پیالیاں اور دیگر برتن تھامے چلا آ رہا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیرا لڑکھڑایا، اُس نے اپنا توازن کھو دیا اور ٹرے اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر گری اور برتن کرچیوں میں بکھر گئے۔ اُس نے جھک کر کرچیاں سمیٹنی شروع کر دیں۔ میں نے اُس سے نظر اُٹھا کر شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو فریدہ خانم نیلے رنگ کی دیدہ زیب ساڑھی میں ملبوس خوب دمکتی ہوئی، سیڑھیاں چڑھتی چلی آ رہی تھیں۔'' امجد صاحب نے توقف کیا اور الفاظ تولتے ہوئے بولے۔ ''اچانک میں جیسے بیدار ہو گیا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہ واہمہ تھا۔ نہ تو بیرا سامنے سے آیا تھا، نہ برتن ٹوٹے تھے اور نہ ہی فریدہ خانم آئی تھیں۔ میں نے خیال سے نکل کر سامنے دیکھا تو وہی ایک بیرا چلا آ رہا تھا۔ اُس نے ایک ٹرے تھامی ہوئی تھی جس پر برتن تھے۔ جیسا میں نے تصور میں دیکھا تھا، ویسا ہی حقیقی زندگی میں ہوا۔ وہ لڑکھڑایا، ٹرے پھسلی، برتن ٹوٹے اور میں نے نظر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو فریدہ خانم نیلے رنگ کی ساڑھی میں سیڑھیاں چڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔''

''گویا خواب وخیال خلط ملط ہو گئے'' میں نے کہا۔

وہ بولے ''دونوں مماثل واقعات اتنے حقیقی تھے کہ میں متذبذب ہوگیا۔ میرے ساتھ اسی کی دہائی میں ایسے واقعات اتنے تواتر سے ہونے لگے کہ میں پریشان ہوگیا۔ کئی مرتبہ کسی اجنبی جگہ پر جاکر احساس ہوتا کہ میں پہلے یہاں آیا ہوا ہوں۔ کسی نئے گھر میں جاکر آشنائی کا احساس ہوتا۔ تب میں نے سرفراز شاہ صاحب جیسے صوفی سے رابطہ کیا۔ شاہ صاحب نے اس کی منطقی وجہ بیان کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسانی دماغ چار حصوں پر مشتمل ہے، بعض غیر معمولی طور پر حساس تخلیقی لوگوں میں ایک حصے سے موجیں دوسرے حصے میں داخل ہوجاتی ہیں۔ یوں انسان میں احساسِ دوراں پیچیدہ ہوجاتا ہے۔''

بنگلے کے باہر سڑک سے گزرنے والے اِکّا دُکّا موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا میکانکی شور اور ہیڈ لائٹیں نیم تاریکی اور خاموشی میں سیندھ لگاتیں، ہل چل ہوتی اور پھر سے وہی ماحول ہوجاتا۔

اندر کمرے میں امجد صاحب چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور پُرشوق لہجے میں مجھ سے مخاطب تھے ''میرا نظریہ ہے کہ صوفیا، روشن ضمیر اور غیب بین ہمارے اوپر سے گزرنے والے لمحات سے مستقل تعلق قائم کرلیتے ہیں۔ ہر شخص میں ایسی حسیات مختلف شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اگر کسی میں یہ شدت دیگر لوگوں سے بڑھ کر ہے تو وہ اس صلاحیت کا زیادہ حامل ہوگا۔ زندگی اسرار سے پُر ہے۔ اس میں قطرۂ دِل سے لے کر کائنات کی وسعتوں تک بے شمار چیزیں پھیلی ہوئی ہیں۔''

امجد صاحب نے توقف کیا، سامنے پڑی میز پر نظر مرکوز کی اور بولے ''ایک مرتبہ علامہ اقبال سے اُس دَور کے ایف سی کالج کے فلسفے کے انگریز پروفیسر نے استفسار کیا کہ رسولؐ پاک کو جب وحی ہوتی تھی تو وہ حالتِ جذب میں چلے جاتے تھے۔ ایسے میں وحی کے الفاظ لفظ بہ لفظ ہیں یا یہ خلاصہ ہے۔ اقبال نے کہا کہ یہ لفظ بہ لفظ (Verbatum) ہیں۔ پروفیسر نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ رات کو وحی ہوا اور حالتِ جذب سے نکل آنے کے بعد یاد رہے۔ اقبال نے تیقّن سے کہا کہ یہ قطعی طور پر ممکن ہے۔ ہر شخص کے پاس ایک مخصوص طاقت کا رِسیور ہوتا ہے۔ میرے اوپر شعر لفظ بہ لفظ مکمل صورت میں وارد ہوتا ہے۔ جب کہ میرا رِسیور ادنیٰ سا ہے۔ وہ تو غیر معمولی انسان تھے۔ ان کے ہاں بہت قوی اور بڑا رِسیور تھا۔ سو یہ نہ صرف بالکل ممکن ہے بلکہ میرا اس پر ایمان بھی ہے۔''

امجد صاحب کی بیٹی اور داماد عمرے پر سعودیہ گئے ہوئے تھے اور اُن کا معصوم شرارتی نواسا کئی مرتبہ کمرے میں آکر اپنے نانا سے باہر گاڑی کی سیر پر چلنے کی لاڈ بھری ضد کرچکا تھا۔ میں نے امجد صاحب کی آنکھوں میں نواسے کے لیے محبت تیرتے دیکھی، جب وہ اپنے دُلارے سے بولے ''ہنس کر دکھاؤ اور بچوں کو بازار جانے کے لیے تیار ہونے کا کہو'' تو میں نے ان کے اور بچوں کے درمیان سے ہٹنے کا ارادہ کیا

اور اُن سے رخصت کی اجازت طلب کر لی۔

امجد صاحب کا قریبی عزیز میرا بچپن کا چھٹی جماعت سے دوست چلا آ رہا ہے۔ چناں چہ ان سے تعلق علمی و ادبی ہونے کے علاوہ ذاتی قسم کا بھی ہے۔ امجد صاحب کو خاندانی معاملات میں کئی مرتبہ ایسی کٹھن آزمائشوں کا سامنا رہا ہے کہ کوئی عام اعصاب کا کوتاہ نظر شخص ہوتا تو ٹوٹ جاتا۔ جب کبھی ان موضوعات پر بات ہوئی تو انھوں نے ایک دور اندیش اور سمجھ دار دانش وَر کی طرح ان مشکلات کو زندگی کا خراج اور عارضی معاملات سمجھتے ہوئے حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش کی اور دُکھوں کو ایسے پی گئے کہ انھیں چہرے کی لکیروں کا حصہ نہیں بننے دیا۔

امجد صاحب سے اُن کے گھر، ریستورانوں، کلبوں، ہوٹلوں، علمی محفلوں اور ادبی میلوں میں بے شمار ملاقاتوں میں دنیا جہاں کے موضوعات، نابغۂ روزگار شخصیات، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، قراۃ العین حیدر، واصف علی واصف، پروفیسر احمد رفیق اختر، صادقین، احمد ندیم قاسمی، پروین شاکر، میڈم نور جہاں اور دیگر بے شمار رجحان ساز ادیبوں، دانش وروں اور باصلاحیت لوگوں کا تذکرہ رہا، عام زندگی کے افراد، سیاحت کے تذکروں، ادب کی باتوں، فلسفے کے نکات اور ذاتی زندگی کے معاملات پر جی بھر باتیں ہوئیں، تشنگی مٹی، تشنگی بڑھی بھی پر ہر ملاقات کے بعد اگلی مرتبہ ملنے کی خواہش دو آتشہ ہوئی۔

دل چسپ کہانی ہے۔

درجنوں کتابوں کے مصنف، سیکڑوں نظموں اور غزلوں کے شاعر، وارث، دہلیز، سمندر، وقت، فشار، دن اور ایسے بے شمار ڈراموں کے خالق امجد اسلام امجد کو اندھی خالہ، ایک بیوروکریٹ اور ملکہ رضیہ سُلطان نے تخلیق کار بننے میں مدد دی۔ ایک چھوٹی سی چٹان جھرنے کی روانی تبدیل کر کے بعد کو بننے والے دریا کا رخ بدل دیتی ہے، ایک چھوٹا سا واقعہ زندگی کا دھارا بدل دیتا ہے اور بعض اوقات بڑا واقعہ زندگی پر اثر نہیں ڈالتا۔ ایک شعبے میں چھوٹی سی ناکامی دوسرے شعبے میں بڑی کام یابی کی داغ بیل ڈال دیتی ہے۔

ایک ادبی محفل کے بعد رات کو لان میں بہتی ہوا میں کھانا کھاتے ہوئے امجد اسلام امجد صاحب نے حدیثِ دل، حکایتِ زندگی بیان کرنی شروع کی۔

1944 کا خاموش، ٹھہرا، ست رو لاہور پرانے شہر کی فصیلوں سے باہر یوں دھیرج سے قدم پھونکتے خاصا پھیل چکا تھا جیسے خطرے کی آمد پر واپس اندر سمٹ جائے گا۔ مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، اینگلو انڈین دھنوں سے نغمۂ شہر ترتیب پاتا تھا۔ برانڈرتھ روڈ اور چیمبر لین روڈ ایسے انگریزی ناموں کی سڑکوں کے قریب فلیمنگ روڈ نامی برطانوی نام کی سڑک پر دست کاروں کے ایک خاندان میں بعد ازاں اردو کے شیش محل میں چراغ روشن کر کے بے شمار عکس پیدا کرنے والے امجد نے پہلی قلقاری بھری۔ اس کی

آبائی کٹڑی میں رہنے والی سگی اندھی خالہ ہرگز نہ جانتی تھی کہ بعد کے برسوں میں امجد کو سیکڑوں غزلیں، نظمیں، درجنوں شعری تراجم، لاتعداد ٹی وی ڈرامے اور سیریل تحریر کرنے تھے، پرائڈ آف پرفارمنس اور ستارۂ امتیاز ایسے اعلیٰ ترین ملکی اعزازات اپنے نام کرنے تھے۔

ہسپانوی مکانوں کے وسطی صحن میں فوارہ اور گرد کمرے ہوتے تھے، راجستھانی حویلیوں کے وسط میں صحن اور تین اطراف رہائشی کمرے اور چوتھی جانب صدر دروازہ ہوتے تھے، اسی طرح آج بھی قدیم شہروں کی فصیلوں میں آباد محلوں میں احاطے جنھیں کٹڑیاں کہتے ہیں، کی اطراف میں پرانے رہائشی مکانات ہیں۔

عموماً بچے کے ذہن میں اپنی پیدائش، ماں، اشیا، گرد و نواح اور دیگر قریبی نوعیت کے معاملات پر سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جنھیں وہ بعد ازاں معاشرتی و ثقافتی تربیت کے باعث بالعموم بھلا بیٹھتا ہے یا میسر جوابات سے مطمئن ہو جاتا ہے۔۔بے اطمینانی جستجو کو جنم دیتی ہے، جستجو نئے خیالات کی جانب لے جاتی ہے، اس راہ سے کئی پگ ڈنڈیاں نکلتی ہیں، غیر مستعمل پگ ڈنڈی کا سفر حیرت، مکاشفے اور دریافت کا سامان لیے ہوتا ہے۔

سو فلیمنگ روڈ کی کٹڑی میں رینگتے، لڑھکتے، دوڑتے بھاگتے، الانگتے پھلانگتے امجد کے ننھے دماغ میں اندھی خالہ کو دیکھ کر ہمدردی کے علاوہ ان کی نابینائی کے متعلق سوالات جنم لیتے رہتے کہ وہ اندھی کیوں ہیں اور اس میں ان کا قصور کیا ہے۔ خالہ کو کہانیاں سنانے کا شوق تھا۔

ایک نابینا شخص میرے پسندیدہ معروف امریکی مصنف ریمنڈ کارور کی کہانی کیتھڈرل (کلیسا) کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کہانی ایک نظر رکھنے والے آدمی کو نابینا شخص رابرٹ کے دماغ کی آنکھ سے دنیا کو تصور کرنے، محسوس کرنے، دیکھنے اور اپنے آپ کو نظر آتی دنیا سے آزاد کرنے کا اظہاریہ ہے، فن پارہ ہے۔ ہم اُس دنیا کے قیدی ہیں جو ہم دیکھ سکتے ہیں، گویا ہم بینائی کے قیدی ہیں، جب کہ نابینا چوں کہ دیکھ نہیں سکتا سو اُس کی دنیا لامحدود ہوتی ہے۔

بہر طور خالہ کی سنائی کہانیوں نے ننھے امجد کے شوقِ داستان کو مہمیز دی اور اس نے ان میں رنگ آمیزی کر کے کہانیاں بُننا شروع کر دیں۔ بعد ازاں اُس کے کانوں میں پھونکی خالہ کی کہانیاں اس کے منہ سے نئی شکل میں نکلتی ہیں۔

وقت پلٹتا ہے، رضیہ سلطان اور بیوروکریٹ منظر نامے میں داخل ہوتے ہیں۔

امجد کے گھرانے میں تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا۔ نابینا خالہ سے سنی کہانیاں وہ کچھ بڑھا کر اور کچھ خود تخلیق کر کے اسکول میں سنایا کرتا۔

وہ ساتویں جماعت میں تھا کہ اس کے معصوم ذہن نے رضیہ سلطان کے کردار سے متاثر ہوکر ایک ستر اسی صفحات پر مشتمل ڈراما ''رضیہ سلطانہ'' لکھ کر اپنے استاد کو دکھایا۔ استاد اپنے باصلاحیت طالب علم سے متاثر ہوا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''رضیہ سلطانہ'' نامی نسوانی کردار کی جانب اوائلِ عمری سے مائل ہونا امجد کے تحت الشعور میں کارفرما فطری رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ عموماً اس عمر کے لڑکے بالے تاریخی کرداروں سکندرِ اعظم، چنگیز خان، حیدر علی، ٹیپو سلطان وغیرہ میں زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں۔

بہرحال امجد کو ذہنی و جسمانی کتھارسس درکار تھا۔ ذہنی تزکیے کے لیے ادب تھا، اسکول کے رسالے 'نشانِ منزل' کی ادارت تھی، اور جسمانی تزکیے کے لیے کرکٹ تھی۔

کالج کے زمانے میں بارہ برس بعد امجد کی اسلامیہ کالج کی ٹیم چیمپیئن بنی تھی۔ اس ٹیم میں امجد کی بہ طور کھلاڑی کام یابی قابلِ ستائش رہی تھی۔ البتہ پنجاب یونی ورسٹی کی ٹیم میں امجد کو ریزرو کھلاڑی کے طور پر لیا گیا اور اس کی جگہ ایک بیوروکریٹ کے بیٹے کو کھلایا گیا۔

گویا بیوروکریٹ نے امجد کی حق تلفی کر کے اسے کھیل سے دل برداشتہ کر دیا اور وہ یک سوئی سے ادب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کرکٹ میں اس کا ٹیلنٹ اوسط رہتا جب کہ ادب میں وہ غیر معمولی صلاحیت کا حامل تھا۔ چناں چہ ارتکازِ توجہ سے وہ ادب میں مقامِ فضیلت کی جانب تیزی سے سفر کرنے لگا۔ بیوروکریٹ کی نامہربانی اپنی بُکّل میں ایک نعمت لیے آئی تھی۔ خدا جانے کون سی چھوٹی وقتی پریشانی کی ایڑھی کی چوٹ سے آبِ زم زم پھوٹ سکتا ہے۔

امجد کے ہم سائے میں ایک نامی گرامی ادبی ہستی آغا بیدار بخت رہتے تھے جو امجد کی بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ یوں نہ صرف اس کی خوبی نکھر کر سامنے آتی بلکہ ایک شفیق شخصیت کے ہم دردانہ اور محبانہ رویے کی وجہ سے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا۔

ایوب خان کے خلاف عوامی لہر، موجِ دریا سے بڑھ کر طوفان بلاخیز کا روپ دھار رہی تھی۔ تب تک امجد ساحر لدھیانوی، جگر مرادآبادی اور دیگر رومانی شعرا سے زیادہ متاثر تھا۔ وہ طالب علم تھا، جذباتی تھا، بغاوت کا داعی اور تبدیلی کا خواہاں تھا۔ چناں چہ ایوب کے خلاف ایک نظم ''ہوائے شہرِ وفا شعاراں'' لکھی جو کئی دلوں کی دھڑکن بن گئی اور سیاسی راہ نما و دانش ور حنیف رامے کے رسالے 'نصرت' کے سرورق پر شائع ہوئی۔

شاعر امجد کی خوبی کو جلا اور اعتماد کو بڑھوتری ملی۔

اچانک امجد کی زندگی کی فلم میں ایک گاڈ فادر داخل ہوتا ہے۔ اطالوی روایت میں یہ ایک منفی

رنگ لیے کفیل ہوتا ہے۔ جب کہ روایتی حقیقت اسے ایک ایسے شفیق بزرگ کفیل کے طور پر پیش کرتی ہے جو کسی کی ذہنی کفالت اپنے ذمے لے لے۔ مشرقی روایت میں پیرِ طریقت، استادِ مکرم یا خاندانی بزرگ یہ کردار اپنا لیتے تھے۔ وہ ایک مہربان پرندے کی طرح بچے کو اپنے پروں کی پناہ میں لے لیتے تھے۔

امجد کے لیے باوقار و بامروّت معروف ادیب احمد ندیم قاسمی صاحب نے یہ کردار اپنایا۔

1965 کی جنگ ختم ہوئی تھی۔ قوم حب الوطنی کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور جذبے کی حدت میں دہک رہی تھی۔

سادہ زمانہ تھا، خواہشات زیادہ نہ تھیں، قوم کی اکثریت کا طرز و معیارِ رہائش ایک سا تھا، وزرا، سفراء اور عامی ایک ہی طرح کے پیلے سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے، ٹنکچر و ڈیٹول میں بھیگے جراثیم کش پھاہوں اور فینائل کی پونچھن کی سوگوار بوؤں میں بسے عوامی اسپتالوں سے علاج کرواتے۔ بدمعاش گراری والے چاقو استعمال کرتے اور شرفا بے داغ سفید لباس پہنتے سو سفید پوش کہلاتے۔

اورینٹل کالج میں جنگ کے حوالے سے مشاعرہ تھا۔ امجد نے اس میں ایک نظم پڑھی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب تب تک ایک منجھے اور مستحکم ادیب و دانش ور کی امتیازی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ بھی مشاعرے میں فرو کش تھے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو قاسمی صاحب امجد کے قریب رُک گئے اور کہنے لگے ''آپ نے بہت اچھی نظم پڑھی ہے۔ کیا آپ یہ نظم مجھے عطا کر سکتے ہیں؟'' ایک بڑے ادیب کی جانب سے عطا کرنے کا لفظ نوآموز کے لیے باعث حوصلہ افزائی تھا۔ امجد گھبرا کر کچھ کہنے ہی کو تھا تو قاسمی صاحب نے بات جاری رکھی ''میں فنون کے نام سے ایک رسالہ نکالتا ہوں۔ مجھے فنون کے لیے یہ نظم عنایت کر دیجیے۔'' امجد نے انھیں یہ نظم دے دی جو اگلے پرچے میں شائع ہوگئی۔ پرچے کی کاپی امجد کو ملی تو ساتھ میں حوصلہ افزائی کا خط بھی تھا جس میں قاسمی صاحب نے لکھا تھا ''میں نے بزرگی کا لائسنس لیتے ہوئے، آپ سے عمر میں بڑا ہونے کے ناتے، آپ کی اجازت سمجھتے ہوئے نظم میں ایک لفظ بدلا ہے۔'' انکسار، بزرگی اور راہ نمائی کا یہ مظاہرہ امجد کے دل کو چھو گیا۔ بعد ازاں قاسمی صاحب یہ کہتے ہوئے امجد سے نئی نظم و غزل کا تقاضا کرتے ''آپ کی نظم نہیں آئی، میں نے پرچا آپ کے لیے روکا ہوا ہے۔'' حوصلہ افزائی کے چند جملے امجد کا دل بڑھا دیتے۔

پس اس کے بعد میدانِ ادب میں امجد نے بگٹٹ ثانیوں میں کوسوں کا سفر طے کرنا شروع کیا۔ مشقِ سخن سے کلام میں دمک پیدا ہوئی، رقیق القلبی سے اظہار میں حساسیت بڑھ گئی اور کشادگیٔ دل و شگفتگیٔ اطوار سے وسعتِ احباب ہوئی۔ شہر در شہر سفر کیے، مختلف کرداروں، عجیب لوگوں، قدآور دانش وروں، فن کاروں سے شناسائی ہوئی۔

حقیقی زندگی کے آسٹریا اور امریکا کی دل چسپ حکایات و واقعات کو بیان کیے بنا بات نہیں بنتی، بادہ و ساغر نہ سہی، قرطاس و قلم سہی۔

امجد کی زندگی میں احمد ندیم قاسمی کے سے بامروّت و شفیق بزرگ آسٹریا کے الپس کے پہاڑوں کی قدموں میں رہنے والے بہار کے رکھوالے کی طرح تھے اور داد دیتے ہم نشین امریکا کی وسکانسن یونی ورسٹی کی ہم جماعتوں کی مانند تھے۔

بہار کا رکھوالا، آسٹریا کے الپس کے جنت نظیر سلسلۂ کوہ کے قدموں میں آباد گاؤں سے ذرا اوپر مشرقی ڈھلوان پر واقع خواب آلود جنگل میں رہنے والا ایک حقیقی شخص تھا۔ اُس بوڑھے شخص کو چند برس قبل علاقے کی کونسل کے ایک نوجوان ممبر نے ملازمت پر رکھا تھا۔ اُس کا کام پہاڑی تالابوں اور جھرنوں میں سے جھاڑ جھنکاڑ چننا اور صاف کرنا تھا تاکہ نیچے واقع بستی سے گزرتی ندی کو چشموں کے شفاف پانی کی فراہمی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ وہ شخص خاموشی اور تن دہی سے اپنے کام میں منہمک رہتا۔ وہ سارا دن پہاڑیوں میں پھرتا رہتا اور بادلوں کے سائے میں، بارشوں میں، سورج کی میٹھی روشنی میں، جھرنوں سے درختوں کے پتے اور شاخیں، پودوں کی ٹہنیاں اور تہ نشین گاد صاف کرتا رہتا۔ یوں صاف پانی کی روانی برقرار رہتی۔ جلد ہی وہ بستی سیاحوں کے لیے ایک پُرکشش مقام بن گئی۔ وہاں تالابوں میں خوب صورت بگلے تیرتے رہتے، رنگین مچھلیاں شفاف پانی میں اٹکھیلیاں کرتی نظر آتیں اور قریب میں واقع چھوٹے گھریلو صنعتوں کے پہیے دن رات پانی کے زور پر چلتے رہتے۔ سرسبز و شاداب کھیتوں کی سیرابی کا بھی انتظام رہتا اور بستی کے مکینوں کو وہاں گوشۂ بہشت کا احساس ہوتا۔

سال گزرتے رہے۔ ایک مرتبہ کونسل کا سالانہ اجلاس ہوا۔ جب وہ بجٹ کا جائزہ لے رہے تھے تو ایک ممبر کی نظر اس بوڑھے شخص کی تن خواہ پر پڑی۔ رکھوالا پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر کام میں مصروف رہتا تھا اس لیے عموماً نظروں سے اوجھل رہتا۔ چناں چہ ممبر نے تجویز پیش کی کہ چوں کہ وہ کبھی کام کرتا نظر نہ آیا تھا اور اس کا وجود فقط ایک معاشی بوجھ تھا سو اسے ملازمت سے فارغ کر دیا جائے۔ اس تجویز کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا اور اس رکھوالے کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

چند ہفتوں تک کچھ بھی تبدیل نہ ہوا۔

موسمِ خزاں کی آمد کے ساتھ درختوں سے پتے جھڑنے شروع ہو گئے۔ چھوٹی شاخیں، ٹہنیاں درختوں پودوں سے ٹوٹیں اور تالابوں میں گریں۔ پانی کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ ایک سہ پہر ندی کے پانی میں ہلکی پیلاہٹ اور گدلا پن نظر آیا۔ چند روز میں پانی کی تہ میں رسوب میں اضافہ ہوا، گلے سڑے پتوں ٹہنیوں کی تعداد بڑھی اور پانی کے گدلے پن میں اضافہ ہو گیا۔ چند ہفتوں میں پانی کی سطح پر

لیس دار مادے کی ہلکی سی چادر دکھائی دی۔ جلد ہی اس چادر کا رنگ گہرا ہوا اور یہ گاڑھے مادے میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی کثافت کناروں کے ساتھ بڑھ گئی اور پانی میں بدبو پیدا ہونا شروع ہوئی۔ صنعتوں کے پہیے آہستہ رفتار سے چلنا شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ وہ رک گئے۔ بطخیں وہاں سے ہجرت کر گئیں اور سیاح بھی رخصت ہوگئے۔ آہستہ آہستہ بستی میں وبائیں پھوٹنے لگیں۔

کونسل نے شرمندگی میں ہنگامی اجلاس بلا لیا۔ اُنھیں اپنے احمقانہ فیصلے کا احساس ہو چکا تھا۔ جلد اُنھوں نے بہار کے رکھوالے سے رابطہ کیا اور اُس سے کام دوبارہ شروع کرنے کی درخواست کی۔

چند ہفتوں میں پہاڑیوں پر جھرنوں اور تالابوں کی صفائی ہوگئی، ندی کو اچھی طرح آلائشوں سے پاک کر دیا گیا، سورج کی کرنوں میں ہیرے کی طرح دمکتا پانی پھر سے جاری ہوگیا اور بستی کی فضائیں پھر سے سبزے اور پھلوں پھولوں کی خوشبو سے معطر ہونے لگیں۔

والدین، اساتذہ، شفیق بزرگ اور متعلقہ شعبے کے سینئر اس بہار کے رکھوالے کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کوئی بالواسطہ کردار ادا نہیں کرتے مگر خاموشی سے اپنے کام میں محو رہتے ہیں اور امکانات کی سرزمین کو جاتے صلاحیت کے چشموں اور جھرنوں سے آلائشیں صاف کرتے رہتے ہیں۔

معاصرین کے حوالے سے ایک مشاہدہ ہے۔ حاضر زمانے میں دیکھا گیا ہے کہ اپنے متعلقہ شعبے کے معاصرین عموماً رشک سے زیادہ حسد کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ اس میں دیگر کے علاوہ نمایاں وجوہات میں اپنی ذات میں خوبی اور صلاحیت کی قلت اور عام معاشرتی چلن شامل ہیں جن میں اسے زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ دیگر غیر متعلق شعبوں کے لوگ ستایش و حوصلہ افزائی کا زیادہ باعث بنتے ہیں، چوں کہ اُن کا بالواسطہ مقابلہ، موازنہ اور تعلق نہیں ہوتا۔

خوش قسمتی سے امجد صاحب کو ادب، فنونِ لطیفہ اور ٹی وی میں ایسے بہت سے سینئر اور دوست ملے جنھوں نے اُن کی بھرپور حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی۔

یہاں دوسری سچی حکایت کا تذکرہ برمحل ہوگا۔ یہ ایک چشم کشا نیم تحقیقی نوعیت کا واقعہ ہے۔

امریکا کی وسکانسن یونی ورسٹی میں چند غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔ ان میں مستقبل کے نمایاں ادیب، شاعر اور مفکر بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ وہ سب باقاعدگی سے نشستوں کا اہتمام کرتے جن میں وہ اکٹھے ہو کر اپنی تخلیقات تجزیے کے لیے پیش کرتے۔

وہ لڑکے تجزیہ و تنقید کے معاملات میں بے لحاظ ہو جاتے اور ایک دوسرے کی تحریروں کے پرخچے اُڑا دیتے۔ وہ نشستیں اُکھاڑے کی سی حیثیت اختیار کر گئیں جہاں روایت، معاصر ادب و فلسفے اور نکتہ طرازی کے پُرذہانت مکالمات سے مخاطب کو لاجواب کر دیا جاتا۔ اس گروہ کو ''جکڑنے والے'' کا نام دیا۔

اس کے مقابل یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم لڑکیوں نے بھی ایک گروہ تشکیل دیا جسے اُنھوں نے ''جھگڑنے والے'' کے برعکس ''بحث والیاں'' کا نام دیا۔ یہاں نشستوں میں اپنی تخلیقات پیش کی جاتیں اور ان پر مباحثہ بھی ہوتا مگر یہ مباحثہ جھگڑ کر دم گھونٹنے والا نہ ہوتا بلکہ تعمیری اور حوصلہ افزا ہوتا۔ کسی طالبہ کی معمولی سے معمولی تخلیق پر اُس کی راہ نمائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی۔

بیس برس بعد یونی ورسٹی کے طلبہ کے کیریئر پر ایک طالب علم نے سنجیدہ تحقیقی کام کیا۔ اُس نے دیکھا کہ 'جھگڑنے' والوں کے برعکس 'بحث' والیوں نے ادبی و تخلیقی میدانوں میں نمایاں کام یابیاں حاصل کی تھیں۔ جھگڑنے والے مایوس اور بے دل ہو کر اپنے تخلیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے جب کہ بحث والی طالبات نے حوصلہ پکڑ کر استقامت سے اپنا کام جاری رکھا اور ان میں سے چھے خواتین قومی سطح پر کام یاب و معروف ہوئیں۔ ان میں سے مارجری رالنگ نے ''دی یرلنگ'' نامی ناول تخلیق کیا جو ملکی سطح پر اُس سال کا بہترین امریکی ناول قرار پایا، بائیس زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اسے 1939 کے موقر وشان دار انعام 'پلٹزر' (Pulitzer) سے نوازا گیا۔

یوں حوصلہ افزائی کے نتیجے میں پوشیدہ وخوابیدہ جواہر نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

امجد اسلام امجد کو احمد ندیم قاسمی کی حوصلہ افزائی نے اس درجہ اعتماد بخشا کہ وہ آج بھی اُن کے شکر گزار ہیں۔

افتخار عارف کا ایک پُر مغز اور قرینِ حقیقت قول ہے ''احسان کرنے والا یقیناً بڑا آدمی ہوتا ہے۔ زیادہ بڑا تو وہ آدمی ہوتا ہے جو اپنے اوپر کیا گیا احسان یاد رکھتا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی صاحب کے فوت ہو جانے کے بعد اُن کے سیکڑوں ارادت مندوں اور شاگردوں نے یقیناً اُنھیں محبت سے یاد رکھا، پر جس شخص نے آگے بڑھ کر عملی طور پر اُن کے لیے تقاریب کا اہتمام کیا، احباب اختیار سے درخواست گزار ہوا اور ایسے معاملات میں مدار المہام کا کردار ادا کیا، وہ امجد اسلام امجد ہیں۔

دانش ورانِ نکتہ فہم خوب جانتے ہیں کہ وہ ارادے، خواہشات، فن پارے، شاعری، ناول اور منصوبہ بندیاں جو فقط دماغ میں ہوں، خام ہیں۔ عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو قابلِ توجہ و لائقِ تحسین قرار پاتے ہیں۔ انھوں نے احمد ندیم قاسمی صاحب کی محبت میں عملی اقدامات کیے۔

مرحوم اے حمید فرماتے تھے کہ بیٹیاں باپ کی چارپائی کی وارث ہوتی ہیں۔ فیض احمد فیض کی بیٹیاں سلیمہ و منیزہ ہوں، احمد بشیر کی بیٹی نیلم احمد بشیر ہوں، منٹو کے بھانجے حامد جلال کی بیٹی عائشہ جلال ہوں، زیڈ اے سلہری کی بیٹی سارا سلہری ہوں۔ ہر جانب بیٹیاں باپوں کی قبروں پر روشن چراغوں کے مانند ہیں۔

وہ ہر میسر مواقع پر باپوں کی یادیں تازہ کرتی رہتی ہیں۔ ایسے میں بیٹے کم سامنے آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی حقیقی بیٹی ناہید قاسمی نے اُن کی یاد کی شمع "فنون" اور جا بہ جا مضامین و گفت گو میں روشن کر رکھی ہے اور جس مقامِ جلی سے امجد صاحب اُن کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، وہ عام سے بڑھ کر ہے۔

ایک صبح کراچی کے برلب سمندر واقع شان دار کلب ڈی ایچ اے گولف اینڈ کنٹری کلب میں مجھ ناچیز کو امجد اسلام امجد صاحب اور چند دیگر معروف و موقر ادیبوں کے ہم راہ ناشتے پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کبھی سابق صدر پرویز مشرف کا پسندیدہ کلب ٹھہرا تھا۔ پروقار عمارت کے ساتھ مخملیں گھاس کا ایک وسیع و عریض قالین بچھا ہوا ہے۔ اس کے ایک کنارے پر سمندر کے نیلگوں پانی کے ساتھ ساتھ ہٹس بنے ہوئے ہیں جن کے مختصر باغیچوں کے قدموں میں آ کر نمکین سمندری پانی سر پٹختا اور جھاگ پیدا کرتا ہے۔ سمندر کے اس جانب کا حصہ صاف ہے اور اس پر اتوار کی سست اور شفاف صبحوں کو پرائیوٹ موٹر بوٹس اور سپیڈ بوٹس منڈلاتی ہوئی سمندری لہروں پر چھپاکے پیدا کرتی نظر آتی ہیں۔ صاف صبح میں ایک جانب بے آباد جزیرہ اور آبی جھاڑیوں اور گھاس کے جھنڈ بھی نظر آ جاتے ہیں۔ کشتی پر بیٹھ کر سمندر میں فاصلے سے دیکھا جائے تو سرسبز گھاس، روغن شدہ دمکتے ہٹس، گالف کورس اور فراٹے بھرتی کشتیاں اسے بین الاقوامی ساحلی شہر کا رنگ دے دیتے ہیں۔

اُس صبح ناشتے کے بعد، جب میزبان اور دیگر مہمان رخصت ہو گئے تو میں اُن کے ہم راہ لان چیئرز پر سمندر کے رخ نرم اور سُبک ہَوا میں آ کر بیٹھ گیا۔

نہ جانے مجھے سمندروں، جزیروں اور ریگستانوں کی بہ نسبت پہاڑ اور جنگل کیوں کر اپنی جانب زیادہ بلاتے ہیں۔ شاید اُن میں پیچیدگی اور اسرار زیادہ ہوتے ہیں، حیرت کا سامان زیادہ ہوتا ہے یا پھر شاید میں پہاڑوں کا بیٹا ہوں اور جنگلوں کا خودرو پودا!

اُس روز سویر کے سمندر کی نیم خنک ہوا کپڑوں میں سے گزرتی ہوئی بدن سہلاتی تھی اور روح کی بے چینی کو قرار سے ہم کنار کرتی تھی۔ سمندر پر ایک شانتی تھی جو ہم میں منتقل ہوتی تھی۔ وہی شانتی جو قلندر، درویش اور صوفی کا اثاثہ ہوتی ہے۔

امجد صاحب نے سمندر کے اُن دیکھے جزیروں پر نگاہیں دُور کہیں مرکوز کر دیں اور بولے "ہم فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ وہاں میرے چچا ایک مرتبہ ایک قلندر مجذوب بابا کو لے آئے۔ وہ مجذوب غیب کا حال بتاتا تھا۔ اُس نے میرے بارے میں بہت سی باتیں درست بتا دیں۔ ان میں میرے مزاج اور عمومی نوعیت کی باتوں کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتیں تو شاید میں یقین نہ کرتا۔ اُس نے حقائق پر مبنی چند ایسی باتیں بتائیں کہ میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ بہت اچھی طرح معلومات حاصل کر کے

خوب تیاری کرکے آیا ہے۔ ابھی میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ہمارے، نظر کے چشموں کے معروف کاروباری فرد، ای۔ پلومر (E-Plomer) والے دوست ملنے آگئے۔ اُنھیں دیکھ کر مجذوب نے بتایا کہ وہ چھ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی حقائق پر مبنی باتیں بتائیں۔ پس اس سے میرا تذبذب بہت حد تک ختم ہوگیا اور میں ماورائے نظر علوم کا کچھ حد تک قائل ہوگیا۔ ماورائے نفسیات (Parapsychology) اور مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کے وجود پر میرے اندر سے گواہی اُٹھتی ہے۔"

شاید سمندری ہوا کی بہ یک وقت اُداس اور مسرت آگیں سرسراہٹ نے میرے کانوں میں چند نام پھونکے یا پھر یہ میرے اندر سے اُٹھنے والا تجسّس تھا جو میرے ہونٹوں پر اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور قدرت اللہ شہاب کے نام لے آیا۔

شاعروں کے متعلق عمومی عوامی تصور پایا جاتا ہے کہ وہ گم سُم، کچھ خبطی کچھ سنکی، اپنی موج و مستی کے غلام اور ذمّے داریوں سے مجتنب ہوتے ہیں۔ اس تصور کو جگر مرادآبادی، میراجی، اختر شیرانی، ساغر صدیقی، اسرار الحق مجاز، جون ایلیا اور بہت سے دیگر شعرا نے راسخ کیا ہے۔ امجد صاحب کو میں نے بے شمار ملاقاتوں میں اس کے برعکس پایا۔ وہ لمحۂ موجود میں حاضر، دنیوی ذمّے داریوں کے پاس دار ہیں۔ جب ان لوگوں کا تذکرہ آیا تو امجد صاحب یوں گویا ہوئے جیسے ابھی انھی کے پاس سے اُٹھ کر آرہے ہوں۔

"ہم فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے، وہیں اے حمید رہتے تھے۔ بانکے چھبیلے گورے چٹے ہالی ووڈ کے فن کاروں کی مانند نک سک اے حمید کو ملنے اشفاق احمد آیا کرتے تھے۔ اشفاق صاحب خوب وجیہہ آدمی تھے۔ تب تک اُنھوں نے داڑھی نہ بڑھائی تھی بلکہ مغربی رنگ میں خاصے رنگے ہوئے تھے۔ سوائے حمید اور اشفاق احمد کی جوڑی خوب زندگی سے معمور اور بھرپور نظر آتی۔ میں ان دنوں ادب کے ابتدائی زینے چڑھ رہا تھا اور وہ خاصے بلند مقام پر کھڑے تھے۔ میرا ان سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ ان سے شناسائی کی موہوم خواہش بھی دل میں کروٹیں لیتی رہتی۔"

"اشفاق صاحب سے اُس دَور میں کوئی صاحب سلامت نہ ہوئی؟" میں نے پوچھا تو وہ بولے۔

"نہیں، البتہ بعد میں میرا اُن سے خاصا قریبی تعلق قائم ہوگیا۔ وہ یقیناً ایک غیر معمولی آدمی تھے۔ جدید دور کے داستان گو تھے۔ اُن کی زبان میں قدرت نے کچھ ایسی کشش اور رَس ڈال دیے تھے کہ اگر وہ ایک ہی واقعہ پانچ مختلف مواقع پر سناتے تو ہر مرتبہ نیا لطف دیتا۔ اُن کی تحریروں اور ڈراموں سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو ان کی گفت گو اُنھیں ایک الگ منفرد طرز کے داستان گوؤں کے زمرے میں شامل کردیتی ہے۔"

''سخن گوئی، داستان گوئی ہی تو برصغیر کی منفرد روایت ہے۔ یہاں کیا کمال کے داستان گو، شعری قصائص کے بیان کرنے والے، درباری لطیفہ گو اور چوپال سجانے والے روایت گو موجود رہے ہیں۔ ایسی روایت مغرب میں نایاب نہ سہی تو کم یاب ضرور تھی'' میں نے بات بڑھائی۔

''فنِ گفت گو اور تخلیقی ادب سے ہٹ کر اشفاق صاحب میں چند غیر معمولی خوبیاں تھیں'' امجد صاحب نے محبت سے معمور آواز میں کہا۔

''وہ بہت محبت والے انسان تھے۔ میں فنونِ لطیفہ میں نووارد تھا۔ میرا لکھا ڈراما ''وارث'' غیر معمولی طور پر مقبول ہو گیا اور بہ طور شاعر بھی میری پہچان قائم ہونے لگی۔ اشفاق احمد اور ان کی بیگم بانو قدسیہ نے مجھے بہت محبت دی۔ اشفاق صاحب خود بہت محنت اور تگ ودو کے بعد آگے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی باقاعدہ طور پر منصوبہ بندی کی تھی۔ اُن کے لیے موزوں لفظ لائقِ پسند (Likeable) ہے۔ جوں جوں اُن کی عمر بڑھتی گئی، وہ اپنی خوش کلامی کی اہمیت سمجھ گئے اور اس خوبی کی جانب اپنی توجہ زیادہ مبذول کر لی۔''

''گڑ والی چائے کی طرح انھوں نے ادب وگفت گو میں تصوف کی شکر گھولی۔'' ابھی میری بات بیچ ہی میں تھی کہ امجد صاحب نے میرا جملہ اُچک لیا۔

''وہ حقیقی طور پر تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ان کے بابا نور والے کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ اُن کا ممتاز مفتی کی کتاب الکھ نگری میں بھی تذکرہ ہے۔ درحقیقت اشفاق صاحب نے روحانیت کو چمکا دمکا کر اپنی تحریروں میں پیش کر دیا۔ یہ یہاں کی پرانی روایت رہی ہے۔ روحانیت پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی شاعری کی شریانوں میں ازل سے دوڑ رہی ہے۔ اُنھوں نے لوگوں کو اس روایت کی یاد دلا دی۔''

نور والے بابا فضل شاہ صاحب نے سو برس سے اوپر عمر پائی تھی اور ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور دیگر بہت سے ادیبوں اور دیگر افراد کے افکار کو متاثر کیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کے قیام سے قبل ہند کے صوفی بزرگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے تھے جہاں اس مملکت کے قیام کا فیصلہ ہوا تھا۔ باباجی کی اس بات پر لوگوں کا اعتماد متزلزل ہو جاتا اور وہ شک میں مبتلا ہو جاتے۔ اس بارے میں ممتاز مفتی نے الکھ نگری میں لکھا تھا ''مجھے باباجی کی یہ بات بہت کھلی۔ اتنا بڑا دعویٰ اور یوں برملا، اور پھر اتنا تفاخر۔ اس محفل میں کسی نے کہا، باباجی یہ جو پاکستان ہے، یہ کیا اسلامی مملکت ہے۔'' بابا بولا ''پتر! ابھی تو بیج پڑا ہے، ابھی بوٹا نکلے گا اور جب بوٹے پر پھول لگا تو ساری دنیا حیرت سے دیکھے گی۔'' واللہ اعلم بالصواب۔

''ایک دل چسپ واقعہ ہے۔'' امجد صاحب نے یادوں کے آئینے سے وقت کی دھول صاف کرتے ہوئے کہا ''1952 میں اشفاق صاحب اِٹلی گئے۔ وہ وہاں کے شہر میلان میں گئے۔ انھوں نے ٹائی

سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اُس وقت اطالیہ کے لوگ پاکستان کو زیادہ نہ جانتے تھے اور اسے ہندوستان ہی کا حصہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کو جوگیوں ساحروں کی ایسی سرزمین سمجھا جاتا تھا جہاں لوگ قرونِ وسطیٰ میں زندگی بسر کررہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے لوگ جنگلوں اور غاروں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اشفاق صاحب لوگوں کا یہ تصور ختم کرنا چاہتے تھے۔ سوانھوں نے وہاں لوگوں کو پاکستان میں موجود اُس دور کی جدید چیزوں، ٹیلی فون، ریل گاڑی، موٹرکاروں وغیرہ کا بتایا۔ میلان میں اُنھوں نے ایک موقع پر مابعدالطبیعات کے خلاف بولنا شروع کردیا تا کہ اطالوی انھیں ماڈرن سمجھیں اور اپنے میں شمار کریں۔ وہیں ایک طبیعیات (Physics) کا پروفیسر موجود تھا۔ جب اشفاق صاحب خوب بول چکے تو اُس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا ''میں تم سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں۔'' اشفاق صاحب نے گومگو کیفیت میں اُسے دیکھا تو وہ بولا ''میں ستر برس کا ہو کر اپنے شعبے کے بارے میں کچھ بھی اعتماد سے حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا جب کہ تُم ایک ایسے موضوع کے بارے میں حرفِ آخر کہہ کر حتمی طور پر مطمئن ہو جس کے بارے میں تم جانتے ہی نہیں۔''

عموماً دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی بہترین یونی ورسٹیوں کے اعلیٰ ترین دماغ، نوبل انعام یافتہ جینیس عاجز ہوتے ہیں اور جتنا علم وہ حاصل کرتے ہیں اُتنا ہی اپنی کم علمی کا ادراک ہونے کی بنا پر منکسر ہو جاتے ہیں۔

مستند ادیب تنویر ظہور راوی ہیں کہ ایک مرتبہ اشفاق احمد صاحب نے اِنھیں بتایا کہ اُنھوں نے خاموشی کو ریکارڈ کیا۔ انھوں نے چولستان کے صحرا، سمن آباد کی ڈوہنگی گراؤنڈ اور اندرونِ لاہور یکی گیٹ کی رات بارہ بجے کے بعد کی خاموشی ریکارڈ کی۔ انھوں نے ان خاموشیوں میں دَر آنے والے زیروبم میں واضح فرق پایا۔

گویا خاموشی کی زبان، زمان ومقام کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ صحرا میں قدیم کھنڈر کی ہول ناک خاموشی، بہار کے موسم میں جوبن پر آئے باغ میں چھائی انبساط انگیز خاموشی اور گرمیوں کے خشک میدانوں میں مینہ برسنے سے پہلے حبس آلود خاموشی میں یقیناً فرق ہوتا ہے۔

امجد صاحب نے مزید کہا۔

''اشفاق صاحب میں اگر شہرت کی خواہش تھی تو، چندلوگوں کو چھوڑ کر، کس تخلیقی شخص میں زیادہ لوگوں تک پہنچنے اور اپنے فن کی پذیرائی کی خواہش نہیں ہوتی؟ اگر چہ ان میں بناوٹ آجاتی تھی پر یہ اتنی حقیقی ہوتی تھی کہ اُن کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ خالص محبت سے بھرے بندے تھے اور اتنی ہی پُرخلوص بانو قدسیہ تھیں۔ وہ غضب کا مشاہدہ رکھتی تھیں۔ کبھی طالب علمی کے دور میں اپنے کالج گورنمنٹ کالج ،لاہور کے لڑکوں کے ہوسٹلوں میں گئی ہوں گی مگر اپنے ناول ''راجہ گِدھ'' میں اس مختصر مشاہدے کی شان دار طریقے سے عکاسی کی تھی۔ ان کے اندر مادرانہ شفقت تھی۔ ایک بڑا پن، ایک عاجزی تھی۔''

ایک مرتبہ نورالہدیٰ شاہ نے کراچی میں عالمی اُردو کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے بانو قدسیہ کا حوالہ دے کر کیا خوب صورت بات کہی تھی ''بانو آپا کہتی تھیں کہ اگر مجرم سے اُس کے جرم کی بنا پر نفرت کرو اور اسے غصے سے دیکھو تو کبھی مجرم کی ماں بن کر بھی سوچو۔ اُس کی بھی ماں ہوتی ہے۔ مجرم کو اپنے بیٹے کی جگہ رکھ کر دیکھو۔''

اِنسان کا اپنے حالات، واقعات، سرشت، جینیاتی ترکیب اور وقتی جذباتی اُبال کا غلام ہونے اوراس کے باعث قابلِ رحم ہونے پر کیا صندلیں بات ہے۔

''عاجز تو قدرت اللہ شہاب بھی تھے۔'' میں نے لقمہ دیا تو امجد صاحب نے اُنھیں یاد کرتے ہوئے ایک مختلف، اور جنل اور متوازن بات کہی۔

''میری شہاب صاحب سے زیادہ ملاقات تو نہ رہی۔ پر جو رہی اس میں اِن کے متعلق تاثر کم گو، سادہ اور بُردبار شخص کا اُبھرا۔''

امجد صاحب نے توقف کیا اور مسکراتے ہوئے واقعہ سنایا 'جنرل ضیا الحق کے زمانے میں جنرل کے ایم عارف سی این سی تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ملاقات کے لیے مجھے بلایا۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے ایک خواہش کا اظہار کیا۔''

''کون سی خواہش؟'' میرے لہجے میں تجسّس تھا۔

''اُنھوں نے کہا کہ اسّی کی دہائی میں، ہوش سنبھال کر، فوج میں آنے والے جوان نے پاکستان بنتے نہیں دیکھا۔ لہٰذا وہ بزرگوں کی قربانیوں، انتقالِ آبادی کی صعوبتوں اور عدیم النظیر جذبے سے فقط کتابی طور پر آشنا ہے۔ اُنھوں نے خواہش کا اظہار کیا کہ ہم فوجی جوان کو جذباتی طور پر قیامِ پاکستان کے دور میں لے جائیں تا کہ اُس کے اندر ولولۂ تازہ پیدا ہو۔ سو اُن کی خواہش پر ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا گیا۔'' امجد صاحب نے توقف کیا۔

''اس فلم سے متعلق اظہارِ تشکر کی ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں دو سویلین بلائے گئے، ایک میں تھا اور دوسرے قدرت اللہ شہاب صاحب تھے۔ وہیں میری پہلی ملاقات شہاب صاحب سے ہوئی۔ میں نے اُنھیں متین اور سُلجھا ہوا انسان پایا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ فلم بننے کے دوران مجھے لینے کے لیے آرمی نے گاڑی بھیجنا شروع کی۔ پہلی مرتبہ ایک گاڑی آئی، دوسری مرتبہ مختلف گاڑی آئی اور تیسری مرتبہ پہلی والی گاڑی ہی آئی۔ جب میں نے ڈرائیور سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ پُرلطف معاملہ تو یہ ہے کہ جب فلم کی ایڈیٹنگ ہو رہی تھی تو ان میں سے آرمی کی ایک گاڑی چوری ہو گئی جو بعدازاں علاقہ غیر سے ملی۔ مجھے فلم کے بنانے کے عمل کو خفیہ رکھنے کے معاملے نے خاصا لطف دیا۔ ایک روز میں

جنرل کے۔ ایم۔ عارف سے پوچھ ہی بیٹھا کہ اگر ہندوستان میں ایسی ہی فلم بن رہی ہو تو کیا ہمیں پتا چل جائے گا۔ اس پر جنرل صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس پر رائے دی کہ پھر تو امکان یہی ہے کہ ہندوستان والے ہماری فلم کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے۔ سو اس معمولی سے معاملے کو اتنا چھپانے کا کیا فائدہ۔''

میں نے شہاب صاحب کا ذکر پھر سے چھیڑا تو بولے ''اشفاق احمد بہت خلوص اور سنجیدگی سے شہاب صاحب کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک لڑکا دُور دراز گلگت سے چلا اور برطانوی دور میں اپنی قابلیت سے بلند مقام تک پہنچا تو اس میں کوئی تو خوبی ہوگی۔ مجھے تو اس بات میں بھی کوئی خامی نظر نہیں آتی کہ اُنھوں نے حکومتِ وقت کے احکامات کی بجا آوری کی۔ اگر انھوں نے ایوب حکومت کی ترجیحات اور احکامات پر عمل کیا تو بہ طور ایک سرکاری ملازم اپنی ذمہ داری نبھائی۔ یہ اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو خیانت کرتے۔ اُن سے مشورہ مانگا گیا تو حکومت کے فائدے کا مشورہ دینا اُن پر لازم تھا۔ شہاب صاحب نے اس سے ذاتی مفادات حاصل نہیں کیے۔ ان پر بے دیانتی یا رشوت ستانی کا کوئی الزام نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا، ایک ملازم پیشہ شخص سے اپنی ملازمت کے حوالے سے ایسی ہی دیانت کی توقع کی جانی چاہیے۔''

میں نے اشارۃً ایوب دور میں قائم ہونے والے رائٹرز گلڈ کا تذکرہ کیا تو امجد صاحب کھنکار کر بولے ''شہاب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ایوب کے ایما پر رائٹرز گلڈ قائم کر کے ادیبوں کو خریدنے کی کوشش کی تو اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہم اس معاملے کو اِس طرح بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے ادیبوں کو بے حالی اور گم نامی سے اُٹھا کر سرکاری طور پر پذیرائی دلوائی، اُنھیں معاشرے کے معزز اراکین کے طور پر شناخت کیا گیا۔ ادیب شکوہ کناں رہتے ہیں کہ اُنھیں حکومت پوچھتی نہیں، اگر پوچھ لے تو کہا جاتا ہے کہ خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شہاب صاحب نے صرف ایک پلیٹ فارم ہی نہیں فراہم کیا بلکہ ان کی بہبود کی بھی کوشش کی۔ یہ قابلِ قدر امر تھا۔''

میں نے سوچتے ہوئے کہا ''جیسے آج کل منعقد کیے جانے والے ادبی جشن اور میلے بے جا تنقید سمیٹتے ہیں۔ جب کہ سفارت خانوں، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بینکوں کے تعاون سے برپا کیے جانے والے ان میلوں نے کسمپرسی اور عدم توجہی کے شکار عام ادیب کو گلی محلے کے چائے خانوں اور سکوٹروں، ویگنوں سے اُٹھا کر پنج ستارہ ہوٹلوں اور پُروقار تقریبات کا مرکز بنا کر اُس کی عزت افزائی کی ہے۔ بیوروکریسی میں ایک

انگریزی قول سینہ در سینہ چلا آتا ہے۔

"If you do something, something will go wrong. If you do nothing, nothing will go wrong. "

''اگر تم کچھ نہ کروگے تو کچھ بھی غلط نہ ہوگا۔ اگر تم کچھ کروگے تو امکان ہے کہ کچھ نہ کچھ غلط ہو جائے گا۔''

''ان کے روحانی معاملات؟'' میں نے استفسار کیا۔

''گو شہاب صاحب کے روحانی معاملات کے حوالے سے بہت سی باتیں حلق سے نہیں اُترتیں تاہم اُنھیں بہ یک جُنبشِ دست رَدّ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص کا تجربہ، مشاہدہ اور احساس مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کا تجربہ مجھ پر نہیں گزرا یا میری فہم سے ماوراہے تو ضروری نہیں کہ وہ غلط بیانی ہو۔ پس ہماری نظروں میں فرق ہے۔ شہاب صاحب کے معاملات فریبِ خیال، باطل یا حقیقت، کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔ ان پر قطعیت سے فیصلہ صادر کردینا محال ہے۔''

''اگر دیکھا جائے تو اپنی جوانی اور ادھیڑ عمری کے دور تک اشفاق صاحب اور شہاب صاحب مغربی وضع قطع اور ذہن رکھتے تھے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے امجد صاحب سے کہا تو وہ بولے۔

''اس طرح تو واصف علی واصف جیسے درویش صوفی سوٹ ٹائی پہن کر انگریزی ٹیوشن سینٹر چلاتے تھے۔ البتہ ان میں نیم مجذوبیت کا رنگ واضح طور پر تب بھی موجود تھا۔ قرۃ العین حیدر سے بڑھ کر مغربی طرزِ حیات کا مشاہدہ اور تجربہ کس اور ادیب کو ہوگا۔ مگر میں نے اُن کے حوالے سے بھی ایک منفرد مشاہدہ کیا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے نصف النہار کی جانب رواں دواں حدت دیتے سورج کو دیکھتے ہوئے اشتیاق سے کہا۔ ہمیں وہاں بیٹھے بہت دیر ہوچکی تھی اور سفید رنگ کی بید کی کرسیاں سایوں میں منتقل کردی گئی تھیں۔

امجد صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولے ''یہ 1989 کا قصہ ہے۔ میں عمرہ کرنے سعودی عرب گیا۔ میرے ساتھ جمیل الدین عالی اور قرۃ العین حیدر بھی تھے۔ قرۃ العین حیدر مذہب کی جانب خاص رجحان نہ رکھتی تھیں۔ بہر حال وہ وہاں عرب حکم رانوں کو بُرا بھلا کہتی رہیں۔ مکہ کی روح پرور فضا میں نہ جانے ایسا کیا جادو تھا کہ وہاں جا کر وہ کچھ لمحوں میں ایسی مسحور ہوئیں کہ خاموش ہوگئیں۔ رات کا پچھلا پہر تھا، خانہ کعبہ کے صحن میں ہم پر گویا کوئی فسوں پھونک دیا گیا۔ ہم میں دل میں ایمان کی آنچ رکھنے والے اور تشکیک کے شکار لوگ، سبھی شامل تھے، مگر وہاں کا معاملہ ایسا تھا کہ سبھی کیف و وجد کی کیفیت میں آگئے اور

پوری رات گزر جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔ شروع میں ہم نے وہاں دین کی بات کی اور اللہ تعالیٰ کی ماہیت پر غور کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سب نے ادب آمیز خاموشی کی کملی اوڑھ لی۔ یہاں تک کہ صبح کے چار، پانچ بج گئے۔ جب میں وہاں سے اُٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرۃ العین حیدر نوافل پڑھ رہی تھیں۔''

''یقیناً دل میں موجود ایمان کی رتی اور رمق کا رمز شناس رب ہے۔ انسان، کسی دوسرے کے بارے میں ایمان و کفر کا فیصلہ صادر کر کے اللہ کی ربوبیت میں مداخلت کرتا ہے اور تکبر و شرک میں مبتلا ہوتا ہے'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو امجد صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

''پروفیسر احمد رفیق اختر جیسے صوفی منش آدمی کے دوستوں نے کالج کے زمانے ہی میں ان کا نام جوگی رکھ دیا تھا۔ وہ بھی انگریزی کے اُستاد تھے اور ساری زندگی پینٹ شرٹ میں نظر آتے رہے ہیں۔ چند لوگ بہت پسندیدہ ہوتے ہیں، خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ اشفاق، بانو، شہاب، واصف، احمد رفیق اختر یہ بہت پیارے انسان ہیں جو لوگوں میں خوشیاں اور سکون بانٹتے رہے ہیں۔ اسی فہرست میں مَیں حفیظ تائب کو بھی شامل کرنا چاہوں گا۔ ہمیں اِن لوگوں کی ان خوبیوں کی قدر کرنی چاہیے۔''

ہم کراچی کے سمندر کنارے کلب سے تو اُٹھ آئے پر میں پروفیسر احمد رفیق اختر سے، اپنے دورِ طالب علمی کی، نوے کی دہائی کے اوائل کی، ان کے گوجر خان میں واقع گھر میں ہونے والی پہلی ملاقات کی یادیں یوں ساتھ لے آیا جیسے تتلی کو چھوڑ دینے کے بعد بھی اُس کے پروں کا رنگ انگلیوں کی پوروں پر اُترا چلا آتا ہے۔

یہ نوے کی دہائی کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک مشترکہ شناسا سے پروفیسر احمد رفیق اختر کا تذکرہ سنا۔ اُن دنوں میں یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، دماغ میں کارل مارکس، برٹرینڈ رسل، جیمز فریزر، ڈارون اور پاکستانی بائیں بازو کے دانش وروں کو پڑھ کر تشکیک کا خناس سمایا ہوا تھا، لڑکپن کا عالم تھا اور شریانوں میں خون جوش مارتا تھا پر اسے کوئی رستہ نہ ملتا تھا اور نادانی میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ ایسے میں پروفیسر صاحب سے ملنے کے لیے لاہور سے گوجر خان میں اُن کے گھر تک سفر کا قصد کیا۔

یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک اَن جانے خوف اور وہم نے دل کو کیکڑے کی طرح جکڑ لیا۔ یوں لگتا جیسے ابھی کہیں سے کسی قریبی عزیز کی موت کی خبر آ جائے گی، کوئی حادثہ درپیش ہوگا یا کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ جی ہر وقت سہما رہتا۔ میں نے اُس تپتی دوپہر میں اُن کے گھر کے سامنے والے میدان میں گاڑی پارک کی اور گھر کے دروازے کے ساتھ لگی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ پہلے سے وقت لے رکھا تھا۔ سو گھر کی سادہ سی بیٹھک میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب تشریف لے آئے۔ اُس دور میں نہ تو سوشل میڈیا تھا اور نہ ہی پروفیسر صاحب کا غیر معمولی تذکرہ۔ سو سوچ رکھا تھا کہ لمبے لبادے میں عمامہ پہنے، لمبی سفید داڑھی

اور ماتھے پر محراب کا نشان لیے کوئی صاحب تشریف لائیں گے۔ پروفیسر صاحب کے حلیے نے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ کلین شیو، ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبیا تھامے، چہرے پر مسکراہٹ لیے پروفیسر صاحب تشریف لائے۔ میں اُن کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

اُنھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولے "آپ نے اپنے دل میں اَن جانے خوف کو کیوں بے وجہ پال رکھا ہے۔" اُن کی بات سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ میں اب تک خاموش تھا۔ پس وہی بول رہے تھے۔ اُنھوں نے گویا چند جملوں میں میرے توہم و تشکیک کو میرے دل سے چٹکی میں پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اُن سے اپنی مختصر بساطِ عقل کے مطابق سوالات کیے۔ ان کے انھوں نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں، دین و فلسفے، سائنس و ادب کے حوالے دیتے ہوئے، اطمینان بخش اور مدلل جوابات دیے۔ نطشے، افلاطون، کانٹ، کنفیوشس، سپینوزا ایسے عظیم فلسفیوں اور شیکسپیئر سے لے کر کافکا تک کے ادیبوں کے یوں حوالے دیے جیسے یہ ابھی اُن کی محفل سے اُٹھ کر آئے ہوں۔ معاملہ صرف ان کے صاحبِ علم ہونے تک محدود نہ تھا بلکہ اُن کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی، گفت گو میں روانی اور لطافت تھی اور محفل میں سکون تھا کہ مخاطب کے بے قرار دل کو قرار آ جاتا تھا۔ اسی دوران ایک سینیٹر اُن سے ملنے آ گئے۔ پروفیسر صاحب نے سینیٹر سے ایک جانب صوفے پر بیٹھ جانے کی درخواست کی اور مجھ عام سے طالب علم سے خاصی دیر محوِ گفت گو رہے۔ گویا معاشرتی تقدم پر مہمان داری کے تقدم کو فوقیت دی۔ جب میں نے رخصت ہونے کی اجازت مانگی تو مجھے پڑھنے کو تسبیح دی۔

بعد ازاں ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں، میں عملی زندگی میں آ گیا، لاہور و پنڈی سے دور ہو گیا اور ان سے مدتوں ملاقات نہ ہو سکی۔

ابھی کچھ ہی عرصے پہلے میں ان سے ملنے لاہور سے پنڈی کے نزدیک ان کے حالیہ گُل پارہ پر واقع ڈیرے پر پہنچا اور گھنٹے بھر کی ملاقات کے بعد واپس لاہور آ گیا۔ رستے میں ایک اَن جانے احساس سے مغلوب رہا۔ یک دم مجھ پر منکشف ہوا کہ میں جتنی دیر تک اُن کے پاس بیٹھا رہا تھا، امن اور سکون نے مجھے اپنے حلقے میں لیے رکھا تھا۔ میں اُن کی اس خوبی کو بھول چکا تھا اور یہ اس طرح مجھے یاد آ گئی جیسے اپنے آبائی گھر کی جانب مدتوں بعد مراجعت کے دوران پرانا برگد کا درخت یا ہم سائے مکان سے جھانکتی پھولوں کی ڈالی اپنا بچپن یاد دلا دے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر کے چاہنے والوں میں جرنیل و بیوروکریٹ، شاعر و ادیب، چھابڑی والے سے لے کر پرچون فروش اور گدائے بے نوا شامل ہیں۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی سے لے کر سابق آئی جی شعیب سڈل تک، صحافی ہارون الرشید سے لے کر جاوید چودھری، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، مستنصر حسین تارڑ اور امجد اسلام امجد جیسے ادیب اور شاعر ہیں۔

اگر چند الفاظ میں کسی شخص کی شخصیت کا احاطہ کرنا ہو تو احمد فراز کے لیے "شرارتی، متلون"، منیر نیازی کے لیے "خود نگر"، فیض احمد فیض کے لیے "شفیق و کشادہ دل"، ساغر صدیقی کے لیے "فقیر" مجید امجد کے لیے "گم سُم"، ناصر کاظمی کے لیے "اُداس" ن۔م۔راشد کے لیے "پُر شکوہ" اور پروین شاکر کے لیے "رومانی" کے الفاظ ذہن میں آتے ہیں تو امجد اسلام امجد کے لیے "پُر تخیل، عاجز و شگفتہ" موزوں الفاظ ٹھہرتے ہیں۔

وہ عام شعری چلن سے ہٹ کر بارہا اپنی اہلیہ کا محبت بھرا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ذہن پنجابی کے عمدہ اور کچھ حد تک بھلا دیے گئے شاعر شریف کنجاہی کی جانب چلا جاتا ہے جنھوں نے خلوصِ دل اور سچے اَن مول جذبات کے ساتھ اپنی بیوی کی تعریفیں نظم کیں۔ بیوی سے محبت ایک قابلِ ستایش جذبہ ہے جس کی وہ حق دار ہوتی ہے کہ مکان کو گھر بناتی ہے۔

امجد صاحب کی حاضر دماغی کے تین واقعات ہیں۔

ایک مرتبہ الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں وہ بیادِ احمد ندیم قاسمی سے متعلق اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ اجلاس میں زیرِ بحث تھا کہ کس ادیب و شاعر کو صدارت کے اقبال سے ظفریاب کیا جائے۔ مختلف نام زیرِ غور تھے۔ میں نے ایک اہم شاعر کا نام تجویز کیا۔ امجد صاحب نے ان شاعر کے رتبے کا اعتراف کیا تو ایک شریکِ محفل نے لقمہ دیا۔

> "بے شک وہ صاحب اہم اور بڑے شاعر ہیں لیکن جب گفت گو کرنے پر آتے ہیں تو ان کی توپوں کا رُخ کسی بھی جانب ہو سکتا ہے۔ ان کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ وہ Unpredictable ہیں۔"

اس پر امجد صاحب نے فوری کہا۔

> "وہ ناقابلِ پیش گوئی Unpredictable نہیں ہیں بلکہ Predictable (قابلِ پیش گوئی) ہیں۔ وہ یقینی طور پر کوئی گڑبڑ فرمائیں گے۔"

ہندوستان میں مشاعرہ تھا۔ امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی ریلوے اسٹیشن سے مشاعرہ گاہ کچھ یوں پہنچے کہ انھوں نے اپنا اپنا سامان اُٹھا رکھا تھا۔ مشاعرے کے بعد سارا سامان عطا صاحب نے اُٹھایا ہوا تھا۔ ایک شریکِ محفل نے ہم دردی سے کہا "دیکھیے صاحب! سب بوجھ عطا صاحب نے اُٹھا رکھا ہے اور امجد صاحب خالی ہاتھ ہیں" اس پر امجد صاحب بے ساختہ بول اُٹھے۔

> "میرے ذہن پر عطا کی غزلوں کا بوجھ اس وزن سے کہیں زیادہ ہے جو

عطا نے اُتھار کھا ہے۔"

ایک اور واقعہ ہے۔ اپنے سفرنامے "سفر در سفر" میں عطاالحق قاسمی صاحب کے بارے میں بذلہ سنجی سے لکھتے ہیں "ٹرین میں سوار ہو کر عطاالحق قاسمی نے باقی سب کام ڈیٹ پر آئی ہوئی لڑکی کی طرح مجھ پر چھوڑ دیا۔"

الحمرا آرٹس کونسل کے ایک کمرے میں ٹیوب لائٹ کی سفید مٹتی ہوئی روشنی میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک واقعہ سنایا "ایک مشاعرے میں ایک بہت حسین و دل کش خاتون میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوران مشاعرہ بے اختیار نظر اُس کی جانب اُٹھ جاتی تھی۔ وہ ٹک ٹک میری جانب دیکھ رہی تھی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو حاضرین میرے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ خاتون بھی اُس جانب چلی آئی اور پیچھے کھڑی ہو کر میرے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ میں سمجھ گیا۔ لوگوں کے چھٹتے ہی وہ میرے پاس چلی آئی اور بولی 'میں آپ کی بہت فین ہوں۔ مجھے آپ کی بہت سی نظمیں زبانی یاد ہیں مگر مجھے آپ سے مل کر مایوسی ہوئی ہے۔ آپ کی شاعری میں سوز (Pathos) اور حزن (Meloncholy) ہیں جب کہ میں پچھلے دو گھنٹے سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ مسلسل ہنستے جا رہے ہیں۔' میں نے اُسے جواب دیا 'بی بی اگر میں ہر آدمی کی خواہش اور اُس کے تصور کے مطابق اپنا امیج بنانے کی کوشش کروں تو نہ جانے میرا کیا ہو جائے۔ میں نے اُسے اپنا ایک شعر سنایا تو وہ مطمئن ہوئی۔

میں اپنے ہست کی تنہائیوں میں روتا ہوں
یہ مسکراتا ہوا شخص ہے میرا ہم زاد"

امجد صاحب نے یہ واقعہ سنا کر قہقہہ لگایا۔ اپنی ذات کے حوالے سے کسی بات کا تذکرہ کر کے اُس پر ہنسنے کے لیے بہت ظرف اور ہمت چاہیے۔ امجد صاحب جا بہ جا ایسے واقعات بلا جھجک سناتے رہتے ہیں۔ غالباً یہ اُنھی سے وابستہ حکایت ہے کہ کسی مشاعرے میں ایک فربہ شاعر اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے کچھ یوں سو گئے کہ اُن کا منہ کھلا تھا، ٹانگیں پھیلی تھیں اور خراٹوں کے باعث جسم لرز رہا تھا۔ امجد صاحب نے ساتھ بیٹھے شاعر کے کان میں مذکورہ شاعر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُدھر دیکھیں۔ یوں نہیں لگتا جیسے کسی گینڈے کو گولی لگی ہو۔" یہ سن کر شاعر کے اندر سے ہنسی کا ایک گولا چھوٹا اور وہ بے اختیار ہو کر منہ پر ہاتھ رکھے اسٹیج سے چلے گئے۔

الحمرا ہی میں ایک ذاتی نشست کے دوران سنانے لگے "میری محبت والی نظمیں بہت مقبول تھیں۔ جب بھی کسی نشست یا مشاعرے میں جانا ہوتا تو ان نظموں کا تقاضا زور پکڑ لیتا۔ جب میں وہ نظمیں سناتا تو بہت داد ملتی۔ جب میرے بچے بڑے ہو رہے تھے تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں ایسی نظمیں پڑھنے سے

حتی الوسع گریز کروں گا۔ انھی دنوں لڑکیوں کے معروف کنیئرڈ کالج میں مجھے مدعو کیا گیا۔ وہاں کی اساتذہ میں میری ایک کلاس فیلو بھی تدریس سے وابستہ تھی۔ حسبِ معمول مجھ سے اپنی مشہور نظم ''ایک لڑکی'' سنانے کی فرمائش کی گئی۔ میں نے ٹال دیا۔ اصرار بڑھا۔ اس میں میری کلاس فیلو بھی شامل ہوگئی۔ لہٰذا میں نے اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ سامنے کالج کی لڑکیاں، آنکھوں میں خواب اور ستارے سجائے بہت اشتیاق سے میری نظم سننے لگیں۔ میں نے ابتدائی بول سنائے ''گلاب چہرے پہ مسکراہٹ، چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے، وہ جب بھی کالج کی سیڑھیوں سے سہیلیوں کو لیے اُترتی'' میں نے آخری مصرعے کو زور دے کر پڑھا ''تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اُتر رہی ہو'' تو سامنے بیٹھی ایک لڑکی نے بے ساختہ سوال کر دیا ''سہیلیوں سمیت؟'' مجھے آج تک اُس لڑکی کا وہ بہ یک وقت حسرت بھرا، شوخ اور بے ساختہ سوال نہیں بھولا۔''

امجد صاحب کی ایک قابلِ قدر خوبی ان کا تخیل ہے۔ وہ لڑکپن میں جب یہ شعر کہتے ہیں

جلتے ہیں آرزو کے ستارے شراب میں
ملتے ہیں بے کسوں کو سہارے شراب میں

تب تک شراب کا ذائقہ چکھنا تو کجا دخترِ رز کا دیدار تک نہ کیا تھا۔

اسی طرح جب انھوں نے اپنے لازوال وشاہ کار ڈرامے ''وارث'' میں دیہی منظر کشی اور وڈیرا شاہی سامراج کی عکاسی کی تھی تب تک وہ کبھی ایک رات تک کے لیے کسی گاؤں میں نہ ٹھہرے تھے۔ گویا یہ سب تخیل کی کرشمہ سازی تھی۔

تخیل کی یہ پرواز تاریخی ناول نگاروں میں بھی نظر آتی ہے جو ماضی بعید کے اُس دور میں زندگی بسر کیے بغیر اپنے ذہنِ رسا کے سہارے اس کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔

چند حیران کن کردار ہیں۔

بین الاقوامی سطح کے ذہین وفطین، جینیس فن کاروں پر نظر دوڑائی جائے تو فلسفے پر دیرپا اثرات چھوڑنے والے ایمانوئیل کانٹ نے کبھی اپنے گھر کے دس میل کے دائرے سے باہر سفر نہ کیا تھا، اس نے شادی نہ کی اور گیارہ برس مکمل گوشہ نشینی اور تنہائی میں بسر کیے۔ اس کے باوجود خیال وفکر کی ایک وسیع دنیا تخلیق کی۔

انسانی نفسیات ومعاشرت کی بے مثال عکاس جین آسٹن جس نے تکبر وتعصب (Pride and Prejudice)، لیڈی سوزن اور دیگر لازوال ناول بائیس برس کی عمر تک تخلیق کر لیے تھے، دیہی انگلستان میں قیام پذیر رہی اور صرف چند روز کے لیے لندن گئی۔

مغرب میں تہلکہ مچا دینے والے شاعر آرتھر ریمباڈ نے شاہ کار فن پارہ ''جہنم کا ایک موسم'' اٹھارہ

برس کی عمر میں لکھا اور بیس برس کی عمر میں لکھنا چھوڑ دیا۔ اس نے دوبارہ کبھی قلم نہ اُٹھایا یہاں تک کہ پینتیس برس کی عمر میں کینسر سے فوت ہوگیا۔ اس کے یہاں Imagery، تخیل، شعریت، جزئیات، فطرت و نفسیات ہمہ جہتی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے بارے میں علمائے ادب نے لکھا ''اس کا جینیس اور اس کی نمو پذیری، دھماکے دار آمد اور یک دم معدومی حیران کن ہیں۔''

ایمالیو سالگاری نے کبھی سمندروں کے طویل سفر نہ کیے پر نہ صرف انیسویں صدی میں ملاحوں اور کتب خانوں سے کشید کردہ واقعات و معلومات کی بنیاد پر دوسو کے قریب ملاحوں، قزاقوں اور سمندری سفروں پر مشتمل ناول لکھ کر امر ہوا بلکہ بعد از اں بھی اہم گردانا جاتا ہے۔

اِدھر اپنے ہندوستان میں غالبؔ کا سا عہد ساز شاعر جو لامحدود ذہن سے ایک جہانِ خیال تخلیق کرتا ہے، بہت کم دلی سے باہر قدم رنجہ فرماتا ہے۔

ایک مرتبہ رام پور جاتا ہے اور جب زندگی میں پہلی مرتبہ ساحلی شہر کلکتے کا سفر اختیار کرتا ہے تو وہاں کا کچھ ایسا شیدائی ہوتا ہے کہ پکار اُٹھتا ہے

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

امجد صاحب کی شاعری اور دیگر تخلیقات میں خواب کا بار ہا تذکرہ تو قابلِ فہم ہے پر پنجاب کے زرخیز میدانوں میں رہنے والے پر ساحل، سمندر، جزیرے اور ریت کیوں اتنا جادو اثر رکھتے ہیں۔ اس کی نفسیاتی پڑتال تجزیے کی متقاضی ہے۔

کیا اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امجد کی شاعری کے یہ عوامل مشاہداتی و تجرباتی نہیں بلکہ تخیلاتی ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امجد نے اپنی ہی دنیا تخلیق کی ہو اور ذہنی طور پر اسی میں جیے ہوں۔ وہ ایک جہانِ خیال کے موجد ہوں اور اس سے اخذ کردہ عناصر کی بنیاد پر شعر تخلیق کرتے ہوں۔ ناصر کاظمی اپنی شاعری جیا تھا۔ لاہور کی بھید بھری گلیوں، رات کے سناٹے میں بھونکتے کتوں کی نوک دار آوازوں، پاک ٹی ہاؤس کے سامنے ایستادہ درختوں، راتوں کو مال روڈ کی ویرانی میں چلتی موج در موج ہوا کے ساتھ، راج دور کی برطانوی طرز کی عمارتوں کے پہلو میں چلتا، انھیں جذب کرتا ناصر کاظمی اپنی چھوٹی بحر کی شاعری میں اسی اداسی اور تنہائی بھری رومانیت منعکس کرتا ہے۔ اس کے برعکس گمانِ غالب ہے کہ منیر نیازی نے ہیبت ناک جنگلوں، شتکارتے سانپوں، آسیب زدہ ڈیوڑھیوں، مکانوں اور اجنبی راہوں میں شاید زندگی کو نہ برتا ہو مگر یہ سب جہانِ فسوں اس نے اپنے گرد مکڑی کے جالے کی طرح بُن لیا تھا اور اسی میں زندگی بسر کر دی۔

شاید امجد نے خواب اور ہوا کو اپنا رفیق بنایا، پوری دنیا الفاظ و خیال کی سلائیوں سے بُنی یا فقط اس کے ایک گوشے میں کبھی کبھار جا بسرام کیا، غالباً انھوں نے ایک ایسی کٹیا بنائی جس میں عموماً جاجوگ سنبھالا۔ جوانی میں جنوں خیز تخلیقی تابانی تھی، کتھارس کے ہم راہ شہرت تھی اور ہر دو اصناف میں مہارت تھی، چناں چہ عمر کا طلائی دورِ جوانی لمحوں میں بیت گیا۔

سمے کے سمندر، کہا تو نے جو بھی، سُنا پر نہ سمجھے
جوانی کی ندی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

''میری بہت عجوبۂ روزگار لوگوں سے ملاقات رہی ہے۔'' امجد صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

یہ فروری کے مہینے کی بات ہے۔ کراچی میں سردی کم کم ہی رُخ کرتی ہے، لوگ رسماً جرسیاں اور گرم کپڑے پہن لیتے ہیں، بہار میں پھول بھی کم ہی کھلتے ہیں کہ شہر میں سبزے کی بہتات نہیں، البتہ فضا خوش گوار ہو جاتی ہے اور دل میں نامعلوم سی موہوم مسرت جگہ بنا لیتی ہے۔ کراچی میں ادبی میلا تھا، اس میں سے چند گھنٹے چرا کر ہم ایک چائنیز ریستوران میں چلے آئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، ریستوراں ایک خوب صورت علاقے کی خاموش اور درختوں بھری سڑک پر واقع تھا۔ چھٹی کا دن تھا سو سڑکوں پر بھی رش کم تھا۔ پرانا کراچی تصور کی آنکھ سے نظر آتا تھا۔

امجد صاحب کے بارے میں، ان کے اہلِ خانہ کے علاوہ، کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ وہ کھانے کی پسند کے بارے میں خاصے حساس (Choosey) ہیں۔ چند چیزیں قطعی طور پر نہیں کھاتے جیسا کہ سی فوڈ میں پران وغیرہ، بیف بھی نہیں کھاتے اور باقی چیزوں میں بھی پسند و ناپسند خاصی کڑی ہے۔ ہمارے ریستوران سے ذرا دُور کراچی کا ڈاؤن ٹاؤن (صدر اور ملحقہ علاقہ) تھا۔ ماضی میں کراچی مختلف رنگین اور پُرکشش تہذیبوں اور مذاہب کا موہناج رہا ہے۔ مسلمان، ہندو، مسیحی، پارسی، سکھ اور یہودی ستّر کی دہائی تک اس کے بازاروں اور محلّوں میں، ساحلِ سمندر پر اور عبادت گاہوں میں خوب رونق لگاتے رہے ہیں۔ معروف ادیب اسد محمد خاں صاحب کے بہ قول صدر کے انڈیا کافی ہاؤس کے سامنے Thomas & Thomas نامی کتابوں کی دُکان ہوتی تھی، جو آج بھی ہے۔ قریب میں فریڈرِکس کیفے ٹیریا اور کیفے جارج واقع تھے۔ معروف و مرکزی علاقے میں بھی گنتی کے لوگ سڑکوں پر چلتے نظر آتے، چند لوگ تمباکو کے ٹِن اور پائپ پکڑے کیفے ٹیریا میں جاتے نظر آتے۔ وکٹورین ٹیلر شاپ کے مالک نے اداکار صادق علی کی فیلٹ ہیٹ پہنے جھک کر سامنے دیکھتے کی تصویر لگا رکھی تھی۔ حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ کچھ عرصے بعد اداکار صادق علی شیو بڑھائے، فالج زدہ ہاتھ کو جیب میں ڈالے ٹیلر شاپ سے چند قدم دُور کیپیٹل سینما والی گلی کے نکڑ پر پان کی دکان کے برابر اونچے اسٹول پر بیٹھے لوگوں سے پانچ پانچ دس دس روپے نذرانہ لیتے نظر آنے لگے۔

پاریسیاں بیکری میں قرینے اور نفاست سے رکھی پیٹیز اور پیسٹریاں نظر آتی تھیں۔ اگر وہاں کوئی جوان گاہک کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ داخل ہوتا اور کوئی فیملی کیبن خالی نہ ہوتا تو، اُس دَور کی وسعت خیالی اور تہذیبی شائستگی کے مطابق، وہاں کے مالک ایرانی بھائی اُس جوڑے کو خوش آمدید کہہ کر بٹھانے کا انتظام کر ہی لیتے۔ سامنے پروٹسٹنٹ چرچ تھا جس کے فٹ پاتھ پر صرف توتے کی فال والے اور وزن کی مشین والے بیٹھے ہوتے تھے۔ موالیوں، نشئیوں، سانڈے کا تیل بیچنے والوں، محض ایک رومال سے بغیر تکلیف دانت نکالنے والوں کا کاروبار بھی صدر کے معروف علاقے میں خوب جما رہتا تھا۔

اُس دوپہر شیشے کی دیوار سے درختوں کے پتوں ٹہنیوں سے چھن چھن کر اور سفید میز پوش پر مختلف ڈیزائن بناتی روشنی کو تکتے ہوئے امجد صاحب نے اپنے وقت کے اہم، مشہور اور باصلاحیت لوگوں سے ملاقاتوں کا احوال سنایا، ان سے وابستہ دل چسپ قصے سنائے اور ان کی شخصیات کے مختلف گوشے وا کیے۔ مشہور درویش مصور صادقین کے بارے میں واقعہ سنایا۔

''1963 تک صادقین کی بہ طور مصور پاکستان میں خاص حیثیت نہ تھی۔ وہ کوئی سند یافتہ مصور نہ تھے۔ این سی اے (NCA) اور دیگر اداروں کے لوگ ان کو مستند مصور ماننے سے گریزاں تھے۔ اُس دَور میں اُنھیں فنونِ لطیفہ اور آرٹ کے گڑھ پیرس میں ایک اہم انعام دیا گیا۔ یہ اُس دور میں ایک بڑی خبر تھی۔ ہمارے ہاں جب کسی باصلاحیت شخص کو مغرب سے انعام یا پذیرائی حاصل ہوتی ہے تو یہاں پر اُس کا اعتبار قائم ہوتا ہے اور اسے شہرت ملتی ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام سے لے کر نصرت فتح علی خان تک کی صلاحیتوں کو بیرونی ممالک میں تسلیم کیا گیا تو یہاں پر انھیں عزت و شہرت ملی۔ اُنھی دنوں کویت میں فن و ثقافت پر ایک اہم کانفرنس ہو رہی تھی۔ صادقین کو پاکستان کی نمایندگی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کانفرنس خاصی شان دار تھی اور اس کے مندوبین کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ وہاں صادقین کو ایک خیمہ مل گیا جس میں ان کی تیس پینتیس تصاویر سج گئیں۔ حکومت نے اُنھیں اخراجات کے لیے 150 ڈالر دیے تھے۔ صادقین نے وہ ساری رقم خرچ کر دی۔ اب معاملہ یہ آن پڑا کہ وہاں اخیر تک بیٹھنا تھا اور صادقین کے پاس کھانے پینے کو پیسے نہ بچے تھے۔ اتنے میں ایک کویتی شیخ خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہم راہ ایک انڈین منیجر تھا۔ کویتی شیخ نے پہلے تو صادقین کو اور پھر اُن کی پینٹنگوں کو تضحیک آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنی نظرِ حقارت دوبارہ تصاویر کی جانب مبذول کر لی۔ کچھ دیر وہ تصاویر کو غور سے دیکھتا رہا، پھر ایک تصویر کی جانب اشارہ کر کے اپنے منیجر سے عربی میں کچھ کہا۔ منیجر نے صادقین کی جانب دیکھا اور بولا ''مبارک ہو، شیخ صاحب کو آپ کی یہ تصویر پسند آ گئی ہے۔'' صادقین نے روکھے انداز میں اُن کی جانب دیکھا۔ غالباً اُن کا ذہن اپنی خالی جیب کی جانب بھی گیا ہوگا۔ اس کے بعد اُنھوں نے منہ پھیرتے ہوئے

منیجر سے کہا "یہ تصویر بک گئی ہے۔" جب کہ وہ تصویر ہرگز نہ بکی تھی۔ اُس تصویر پر قیمت 500 سو ڈالر لکھی تھی۔ منیجر نے اعتراض کیا کہ اس پر فروخت شدہ کا نشان نہ لگا تھا۔ صادقین نے منہ بناتے ہوئے کہا کہ وہ بھول گئے ہوں گے۔ جب منیجر نے شیخ کو یہ بات بتائی تو اُس نے منیجر کے کان میں سرگوشی کی۔ منیجر نے صادقین سے کہا کہ شیخ صاحب نے آپ کی تصویر کی قیمت 5 ہزار ڈالر کر دی ہے۔ صادقین نے معذرت کر لی۔ اب شیخ چونک گیا اور اُس نے اِس معاملے کو اپنی عزت کا سوال بناتے ہوئے پینٹنگ کی قیمت بڑھانی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ 5 سو ڈالر کی پینٹنگ کی بولی اُس نے 35 ہزار ڈالر لگا دی۔ صادقین نے پینٹنگ دینے سے انکار کر دیا۔ البتہ شیخ کو تحفتاً موقع ہی پر خطاطی کے چند نمونے بنا دیے۔ صادقین نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے پوچھا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تو وہ بولے "شیخ کی آنکھوں میں جو پریشانی آئی تھی، وہ اَن مول تھی۔ اُس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ سالا مجھے کیڑوں مکوڑوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔"

اُس سہ پہر میں ڈھلتی دوپہر کو امجد صاحب کی زنبیل سے قصّے برآمد ہو رہے تھے۔

"میری پہلی ملاقات پروین شاکر سے احمد ندیم قاسمی صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ میں کراچی جا رہا تھا تو قاسمی صاحب نے چند کاغذات میرے حوالے کرتے ہوئے پروین شاکر کے متعلق کہا "بیٹی سے ملتے آیئے گا۔" میرے دل میں قاسمی صاحب کے لیے بے پایاں احترام تھا۔ اُنھوں نے پروین کے لیے بیٹی کا لفظ استعمال کیا تو میں نے اُسے قاسمی صاحب کی بیٹی کی طرح سمجھا اور دل میں وہی احترام دیا۔ ایک وقت تو ایسا بھی آ گیا کہ اُس جیسی رکھ رکھاؤ والی بارعب خاتون کی اگر احمد ندیم قاسمی صاحب کے علاوہ کوئی اور سرزنش کر سکتا تھا تو وہ میں تھا۔ وہ بہت نفیس اور شائستہ خاتون تھی۔ میرے خیال میں پروین شاکر پاکستان کی آج تک کی شاعرات میں سب سے اہم شاعرہ ہے۔"

میں توجہ سے امجد صاحب کی گفت گو سن رہا تھا۔ اُنھوں نے قہوے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولے۔

"جب پروین شاکر مقابلے کا امتحان پاس کر کے ٹریننگ کے لیے اکیڈی آئی تو اُس نے مجھ سے دو لوگوں سے ملاقات کروانے کی خواہش کا اظہار کیا، طاہرہ نقوی سے اور میڈم نور جہاں سے۔"

"اچھا؟" میں نے متجسس لہجے میں کہا۔

"طاہرہ نقوی کو سرطان تشخیص ہو چکا تھا۔ شاداب چہرے، بولتی آنکھوں اور بوٹے قد والی طاہرہ نقوی کینسر سے بہت صبر اور ہمت سے نبرد آزما تھی۔ جب پروین شاکر اُسے مل کر آئی تو بہت اُداس تھی۔ میں نے اُس کے جذبۂ ہم دردی کو سمجھتے ہوئے ملاقات کا پوچھا تو اُس نے ایک عجیب بات بتائی۔ وہ بتانے لگی کہ طاہرہ نقوی بہت کم زور ہو چکی ہے، بیماری میں بکھر، ٹوٹ چکی ہے۔ البتہ اُس نے میرے لیے دو تین مرتبہ ایک ہی پیغام دیا۔ اُس نے پروین سے کہا "امجد صاحب سے کہیے گا کہ وہ میری عیادت کرنے نہ آئیں۔"

''اُس کی اِس درخواست کے پیچھے غالباً ایک جذبہ پوشیدہ تھا کہ آپ اپنے پسندیدہ لوگوں کی یادداشت میں اپنا زندگی سے بھرپور ہنستا مسکراتا تاثر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سو وہ چاہتی تھی کہ میں اُس کا ہنستا مسکراتا روپ یاد رکھوں۔''

امجد صاحب نے یہ بات کی تو میرے ذہن میں احمد فراز آ گئے جن کے عزیزوں نے اُن کی بیمار حالت میں وھیل چیئر پر ملاقاتیوں سے ملاقات اور کیمرامینوں کو تصاویر کھینچنے سے منع کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں نور جہاں بھی آ گئیں۔ چمکتی، دمکتی، گلوبند پہنے، ہیرے کی خیرہ کن انگوٹھیوں بھری انگلیاں نچاتی نور جہاں شدید بیمار ہوئیں تو ملاقاتیوں کے سامنے بیماری کی حالت میں آنے سے گریز کرتی تھیں تا کہ اُن کا گلیمرس تصور برقرار رہے۔

امجد صاحب نے نور جہاں کی تصویر یادداشت میں روشن کی اور شاید اُن کی نقرئی آواز ریستوران میں گونجتی ہوئی سی سنائی دی۔

''ایک مرتبہ میں نے میڈم سے اُن کے لبرٹی والے گھر میں بمبئی میں اُن دنوں ایک بہت بڑی تقریب میں گائے اُن کے گانے ''آواز دے کہاں ہے'' کی تعریف کی تو انھوں نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بناتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''امجد جی آپ کو پتا ہے، میں نے سات برس کی عمر میں سرکس کے باہر تھڑے پر کھلے آسمان کے نیچے نومبر دسمبر کی شدید سردی میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میں موتیوں کے ہار، قیمتی ساڑھی اور ہیروں کی انگوٹھیوں کے لشکارے کے پیچھے میڈم کی اَن تھک محنت اور صلاحیت کو دیکھ سکتا تھا۔ اُن میں چند کمال کی خوبیاں تھیں۔ وہ خاص پڑھی لکھی نہ تھیں پر نہ صرف اُردو بہت اچھی بولتی تھیں بلکہ مناسب انگریزی میں بھی بات کر لیتی تھیں۔ اُن کے مزاج کی نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ان کی تعلیم کی کمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہت شان دار نقل اُتار لیتی تھیں۔ کسی کے لب و لہجے اور انداز و اطوار کی ایسی عمدہ نقل کرتیں کہ اردگرد کے لوگ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔'' امجد صاحب نے ماضی کے چمنستان میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''پروین شاکر کی دوسری خواہش میڈم نور جہاں سے ملاقات تھی۔ میں نے خود پر داختہ (Self Made) لوگوں میں ایک خاص عادت دیکھی ہے کہ وہ اپنی موجودگی میں لوگوں کی کسی دوسرے کی جانب توجہ برداشت نہیں کر پاتے۔ میں نے پروین اور مختلف لوگوں کو گلبرگ لاہور میں اُس دور کے مخصوص انداز کے معروف چائنیز ریستوراں 'شنگھائی' میں کھانے پر مدعو کیا۔ میڈم نور جہاں کو کھانے پر بلانے کے لیے اُن کے گھر فون کیا۔ اُنھوں نے فون اُٹھایا اور بولیں ''جی امجد جی۔'' میں نے پروین شاکر کا تذکرہ کیا تو بہت اپنائیت سے پنجابی میں بولیں ''بڑی چنگی اے (بہت اچھی ہے)۔'' میں نے کہا کہ اگر وہ رات کا کھانا

''اُس کی اِس درخواست کے پیچھے غالباً ایک جذبہ پوشیدہ تھا کہ آپ اپنے پسندیدہ لوگوں کی یادداشت میں اپنا زندگی سے بھرپور ہنستا مسکراتا تاثر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سو وہ چاہتی تھی کہ میں اُس کا ہنستا مسکراتا روپ یاد رکھوں۔''

امجد صاحب نے یہ بات کی تو میرے ذہن میں احمد فراز آ گئے جن کے عزیزوں نے اُن کی بیمار حالت میں وھیل چیئر پر ملاقاتیوں سے ملاقات اور کیمرامینوں کو تصاویر کھینچنے سے منع کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں نورجہاں بھی آ گئیں۔ چمکتی، دمکتی، گلوبند پہنے، ہیرے کی خیرہ کن انگوٹھیوں بھری انگلیاں نچاتی نورجہاں شدید بیمار ہوئیں تو ملاقاتیوں کے سامنے بیماری کی حالت میں آنے سے گریز کرتی تھیں تاکہ اُن کا گلیمرس تصور برقرار رہے۔

امجد صاحب نے نورجہاں کی تصویر یادداشت میں روشن کی اور شاید اُن کی نقرئی آواز ریستوران میں گونجتی ہوئی سی سنائی دی۔

''ایک مرتبہ میں نے میڈم سے اُن کے لبرٹی والے گھر میں بمبئی میں اُن دنوں ایک بہت بڑی تقریب میں گائے اُن کے گانے ''آواز دے کہاں ہے'' کی تعریف کی تو انھوں نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بناتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''امجد جی آپ کو پتا ہے، میں نے سات برس کی عمر میں سرکس کے باہر تھڑے پر کھلے آسمان کے نیچے نومبر دسمبر کی شدید سردی میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میں موتیوں کے ہار، قیمتی ساڑھی اور ہیروں کی انگوٹھیوں کے لشکارے کے پیچھے میڈم کی ان تھک محنت اور صلاحیت کو دیکھ سکتا تھا۔ اُن میں چند کمال کی خوبیاں تھیں۔ وہ خاص پڑھی لکھی نہ تھیں پر نہ صرف اُردو بہت اچھی بولتی تھیں بلکہ مناسب انگریزی میں بھی بات کر لیتی تھیں۔ اُن کے مزاج کی نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ان کی تعلیم کی کمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہت شان دار نقل اُتار لیتی تھیں۔ کسی کے لب و لہجے اور انداز و اطوار کی ایسی عمدہ نقل کرتیں کہ اِردگرد کے لوگ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔'' امجد صاحب نے ماضی کے چمنستان میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''پروین شاکر کی دوسری خواہش میڈم نورجہاں سے ملاقات تھی۔ میں نے خود پرداختہ (Self Made) لوگوں میں ایک خاص عادت دیکھی ہے کہ وہ اپنی موجودگی میں لوگوں کی کسی دوسرے کی جانب توجہ برداشت نہیں کر پاتے۔ میں نے پروین اور مختلف لوگوں کو گلبرگ لاہور میں اُس دور کے مخصوص انداز کے معروف چائنیز ریستوراں 'شنگھائی' میں کھانے پر مدعو کیا۔ میڈم نورجہاں کو کھانے پر بلانے کے لیے اُن کے گھر فون کیا۔ اُنھوں نے فون اُٹھایا اور بولیں ''جی امجد جی۔'' میں نے پروین شاکر کا تذکرہ کیا تو بہت اپنائیت سے پنجابی میں بولیں ''بڑی چنگی اے (بہت اچھی ہے)۔'' میں نے کہا کہ اگر وہ رات کا کھانا

ہم سب کے ساتھ کھالیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ اُنھوں نے تاسف سے کہا کہ اُن کی چھوٹی بیٹی کی سہیلی کی منگنی ہے اور وہاں جانے کا وعدہ کرلیا ہے۔ میں نے آخری کوشش کے طور کہا" دیکھ لیں، اگر آسکیں تو اچھا ہوجائے۔" میری آواز میں دُکھ سن کر بولیں " امجد جی! میں ضرور آؤں گی، خواہ پندرہ بیس منٹ کے لیے آنا پڑے۔ زیادہ دیر نہیں رُک سکوں گی۔" انھوں نے وعدہ تو کرلیا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ آجائیں گی۔ رات کے کھانے کا وقت آٹھ بجے تھا۔ ابھی میں ریستوراں میں اہتمام کررہا تھا کہ عین آٹھ بج کر ایک منٹ پر باہر گاڑی آ کر رُکی اور میڈم آگئیں۔ بہت بھرپور محفل رہی جس کی اصل رونق میڈم کی برجستہ اور زندگی سے بھرپور گفت گو تھی۔ ریستوران ساڑھے گیارہ بجے بند ہوجاتا تھا مگر وہ وہاں رات گئے ساڑھے بارہ بجے تک بیٹھی رہیں۔ محفل میں احمد ندیم قاسمی، عطاء الحق قاسمی، پروین شاکر، مستنصر حسین تارڑ اور دیگر ادیب اور دانش ور تھے مگر سب کی توجہ اُنھی کی جانب رہی۔"

امجد صاحب مسکرائے اور قہوے کی خالی پیالی کی تہ میں دیکھ کر میری جانب دیکھا اور بولے

"راول پنڈی میں کئی برس کے وقفے کے بعد پی ٹی وی ایوارڈز اُس دور کے فیشن ایبل اور جدید ہوٹل Flashmans میں منعقد ہورہے تھے۔ سب ہی شرکا رات گئے دو، تین بجے تک وہاں گپ شپ کرتے رونق لگائے رکھتے۔ ایک رات کی بات ہے، میں لطیفے اور واقعات سنا رہا تھا، میرے اردگرد اچھے خاصے احباب اکٹھے تھے، خوب ہنگامہ تھا۔ میڈم نور جہاں کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ اُن کی توجہ میری طرف ہوگئی۔ بہرحال گھنٹے بھر بعد میڈم اپنی میز سے اُٹھیں۔ وہ انٹرکانٹینینٹل ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ چناں چہ یوں لگا جیسے وہ اپنے ہوٹل جانے کے لیے اُٹھی ہوں۔ جب وہ میرے قریب سے گزریں تو میں کھڑا ہوگیا۔ اُنھوں نے میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور پنجابی میں بولیں " امجد جی تُسی کتھے ٹھہرے ہوئے او؟" (امجد جی آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟) میں نے کہا کہ میں فلیش مین (Flashman) ہی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اب سب لوگ چپ ہوکر ہماری طرف دل چسپی سے دیکھنے لگے۔ میڈم نے جب سب کو اپنی طرف متوجہ پایا تو بولیں " آپ نے بتایا ہی نہیں، ورنہ میں بھی یہیں ٹھہر جاتی۔" اُن کے اس جملے کے کئی معانی لیے جاسکتے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ میڈم نے سب لوگوں کی توجہ مجھ سے اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ استہزائیہ ہنسی ہنسیں جیسے کہہ رہی ہوں 'آؤ اور میرے آگے چراغ جلاؤ' اور وہاں سے چلی گئیں۔"

اُسی نشست میں اُنھوں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"مجھے اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا ہنر دیا۔ میں نے معاشرے میں اپنی بساط کے مطابق اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے، لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈراموں میں جاگیرداری کے خلاف تب قلم اُٹھایا جب ہر سُو سناٹا تھا۔ عورتوں کے تذلیل آمیز و ہتکِ انسانیت برہنہ جلوس کو اُس دور میں جب ٹی

دن پر ہر طرح کی پابندیاں تھیں، ایسے دل گیر انداز اور اشارے کنایے میں موضوع بنایا کہ بات مخاطب تک پوری اثر پذیری سے پہنچ بھی گئی اور صاحبانِ اختیار کے قواعد کے آبگینوں کو ٹھیس بھی نہ لگی۔''

اُن کا اندازِ تخلیق اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اپنی بات، موجودہ دشنام طراز و دریدہ دہن چلن کے برعکس، نفاست وسلیقے سے بھی کی جاسکتی ہے اور زیادہ موثر انداز میں کی جاسکتی ہے۔

ایک فن کار جسے اپنی شاعری پر بھرپور داد، ڈراموں پر غیر معمولی شہرت اور شخصیت کو قابلِ رشک پذیرائی مل رہی ہو، فلسطینی مزاحمتی شاعری اور افریقہ کے سیاہ فام مظلوموں کی شاعری کا ترجمہ کر کے اُن کے ساتھ پوری انسانی ہم دردی کے ساتھ کھڑا ہے۔ ترجمہ بھی ایسا ہو گویا مترجم پر وہی احساس شاعری میں اُترا ہو۔

لاہور میں ایک ساون، ہم عصر کے وقت باہر برآمدے میں بیٹھے بارش کی لگی جھڑی دیکھ رہے تھے۔ گھٹا خوب چھائی تھی، بادل برسے تھے، سیاہ میگھ سے بجلی کے تڑپتے لشکارے کوندتے اور عمارت کے در و بام اس کی کڑک سے گونج اُٹھتے۔ دُور کوئی ٹرانسفارمر پھٹا، دھک سے دبے دھماکے کی آواز سنائی دی اور بجلی چلی گئی۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک باقی تھی۔ ہم نے باہر ورانڈے میں موڑھے لگوائے اور طبلے کی کھال پر بجتی اُنگلیوں کی پوروں کی طرح بجتے بارش کے قطروں کو تکنے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دیواروں کے اندر کی ٹھنڈی مصنوعی دنیا سے نکل کر حقیقی زندگی میں لوٹ آیا ہوں۔ وہی حقیقی زندگی جب لاہور شہر کی باہر کی بستیاں آباد ہونے سے پہلے، حفاظتی دیواروں کے پیچھے تحت الشعور میں خوف دَرآنے سے پہلے، کے شہر کی زندگی ہوتی تھی۔

لاہور کی تنگ گلیاں جیٹھ ہاڑ کے مہینوں میں خوب تپ جاتی تھیں اور ہوا گرم ہو کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ اندرون لاہور کے لوگ موسم کی پروا نہ کرتے ہوئے بہاں گیر کے مقبرے اور دریائے راوی کے کناروں پر ... تے تھے۔ وارث شاہ کا عرس بھی ساون میں ہوتا تھا۔ لوگ باگ ٹولیوں کی صورت کھانے پینے کا سامان، چادریں، ڈھولک، لنگوٹ، برتن اور رسّے ساتھ لے جاتے۔ درختوں پر رسّے ڈالے جاتے، پینگیں ڈالی جاتیں، ٹوکروں سے آم نکالے جاتے اور کھانے پینے کا سامان سج جاتا۔ کھیل کود کا آغاز ہوتا اور چند لوگ میٹھی روٹی کے ٹکڑے کر کے کسی منّت کے پورے ہونے پر پانی سے اُس دَور کے لبالب بھرے راوی دریا میں مچھلیوں کو ڈال دیتے۔ تاش کی بازیاں جمتیں، ہیر پڑھنے کا اہتمام ہوتا اور شاموں کو گیس کے ہنڈولے جل اُٹھتے۔ برف کے کارخانے کم تھے اور لوگ کنوؤں کے ٹھنڈے ٹھار پانی پر گزارا کرتے۔ چھوٹے کنویں کو کھوئی اور بڑے کنویں کو کھوہ کہا جاتا۔ چند تنگ گلیوں پر چھت ہوتی، عورتیں بند گھروں کے دم گھونٹتے ماحول سے بچنے کی خاطر باہر بند چھتی گلیوں میں پیڑھیاں بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ تپتی گرمیوں میں ململ کے کپڑوں اور وائل کے کُرتوں کا استعمال بڑھ جاتا۔ شربت کی مانگ بڑھ جاتی اور دہی کی

بھی۔ جب گرمی بڑھ جاتی تو لڑکیوں کے گانے بھی بڑھ جاتے ''اللہ میاں مینہ ورسا۔ ساڈی کوٹھی دانے پا۔''
گھر، کوٹھڑیاں، محلے ساتھ ساتھ تھے اور انسان بھی۔ انسان باہر نکل گیا، دُور دُور مکان بنالیے، بیچ میں
دیواریں بڑھالیں اور دور ہوگیا۔ اکیلا ہوگیا۔ پرانا لاہور میں نے تو نہ دیکھا تھا پر اپنے دادا، چچاؤں،
پھوپھیوں، نانا، نانی اور وسیع لاہوری خاندان کے بزرگوں سے خوب سنا تھا۔

جب میں نے پرانی یادوں کا تذکرہ کیا تو امجد صاحب سنانے لگے ''میری بہت بچپن کی یادیں
خاصی دُھندلی ہیں۔ البتہ جب میں چھوٹا سا تھا تو بھی ہر وقت سوچوں میں گم رہتا تھا۔ میری قوت
مُتخَیلہ وقت سے پہلے ہی فعال اور پختہ ہونا شروع ہوگئی تھی۔ میرے والد کو فلموں کا بہت شوق تھا، میں
کتابوں کو سادگی سے ایک کونے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔''

''ایک مرتبہ شیزان ہوٹل میں مَیں جمیل الدین عالی، عطاالحق قاسمی اور چند دیگر دوست بیٹھے
تھے۔ خوب گپ شپ چل رہی تھی۔ باتوں باتوں میں عالی جی کہنے لگے ''یہ تمھارے بے تکلف دوست تمھارا
دماغ خراب ہونے نہیں دیتے۔'' بچپن کے دوست اور جوانی کے بے تکلف احباب انسان کی بنیادی فطرت
سے واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ گردن پر لگتی کلف کو چند لمحوں میں صاف کرنا خوب جانتے ہیں۔

''آپ کی شاعری پر خاصی بات ہوتی ہے، شگفتہ شخصیت کا بھی تذکرہ رہتا ہے، البتہ آپ کے
ٹی۔وی کے حوالے سے تجربات و مشاہدات پر کم ہی بات ہوتی ہے۔''

ابھی میری بات بیچ ہی میں تھی کہ وہ مسکرا اٹھے۔ میں نے بات روک کر اُن کی جانب دیکھا تو
بولے ''بہت ہی دل چسپ اور میرے دل سے قریب موضوع ہے۔''

بارش کی جھڑی رُک چکی تھی، جس میں اضافہ ہو رہا تھا اور کوؤں کا شور بڑھ رہا تھا۔ عصر کے دودھیا
مشروب میں شام کا کولا مل کر شفق کو دودھ سوڈا کا سا رنگ دے رہا تھا۔ غالباً بارش سے پناہ گزین پرندے
جان دَرا اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ بجلی بحال ہوگئی تھی۔ سو ہم واپس ٹھنڈے اے سی والے کمرے میں چلے
گئے۔ معمول سے ہٹ کر حقیقت کا ذائقہ مختصر مدت کے لیے تو رومان انگیز ہوسکتا ہے۔ طولانی ہوجائے تو
بلائے جان بن جاتا ہے۔

''میں سمندر ڈراما کر رہا تھا۔ تب پروڈکشن اسسٹنٹ ہوتے تھے۔ میرے ساتھ ایک مستعد اور
سمجھ دار لڑکا ہوتا تھا۔ اس کا نام سجاد تھا۔ سجاد دیگر ڈراموں میں بھی معاونت کرتا تھا۔ اسی دوران جمیل فخری
(مرحوم) واپڈا ہاؤس کے آڈیٹوریم میں کھیلے جانے والے ڈرامے میں کبوتر باز کا کردار ادا کر رہے تھے۔ سجاد
وہاں پر معاونت کر رہا تھا۔ جمیل فخری وہاں کونٹی نیوٹی (Continuity) کے کپڑے بھول آئے۔ وہاں
اُنھوں نے بہانہ بنادیا کہ سجاد نے اُنھیں بتایا نہ تھا۔ نتیجتاً سجاد کو اچھی خاصی ڈانٹ پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میرا

سیٹ کی دیوار کی جانب جاتا ہوا۔ سیٹ کی دیوار اور ہال کی دیوار کے بیچ فاصلہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پیچھے سجاد کھڑا تھا اور دیوار کی جانب رخ کر کے با آوازِ بلند کو سنے دے رہا تھا۔ جب میں قریب ہوا تو دیکھا کہ وہ کہہ رہا تھا ''آ جاتے ہیں کبوتر باز۔'' میں نے یہی بات جمیل فخری کو بتائی۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ میری بات سن کر وہ اسٹیج کی دیوار کے پیچھے چلے گئے اور سجاد کو گلے لگا کر منا لیا۔ ایک اور واقعہ ہے۔ کنور آفتاب بہت پروفیشنل پروڈیوسر تھے۔ وہ غصے کے بہت تیز تھے۔ لوگ ان کا مزاج سمجھتے تھے۔ میں ''بانصیب'' ڈراما کر رہا تھا۔ اس میں ایک سینئر اداکار ایسے تھے جن کا سارا تجربہ ریڈیو کا تھا۔ ٹی وی کا زیادہ تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اداکار کی بار بار ری ٹیک ہو رہی تھی۔ پانچ، چھے مرتبہ ایسا ہو چکا تو کنور آفتاب صاحب نے وہیں مائک سے اُنھیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ پرانے اداکار تھے۔ اِرد گرد کئی نئے فن کار کھڑے تھے۔ وہ اداکار بھی غصے میں آ گئے۔ اُس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں کنور صاحب سے کہنے لگے کہ اُنھیں خیال کرنا چاہیے تھا، آخر وہ ایک سینئر اداکار ہیں۔ یہ سن کر کنور صاحب نے بھنا کر اداکار کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا۔ ''تُم کیسے سینئر ہو۔ مجھے تمھارے نام تک کا تو پتا نہیں۔''

امجد صاحب نے توقف کیا اور واقعات کی لڑی کو پھر سے تھام لیا۔

''ایک حسین فلمی اداکارہ تھی۔ اُس کا تعلق بازارِ حسن سے تھا۔ یہ وہ دَور تھا جب فلموں سے کہانی اور اداکاری رخصت ہوگئی تھیں۔ فارمولا فلموں کا دور تھا جن میں اچھے گھرانوں کے لوگ آنا چھوڑ گئے تھے۔ تب فلموں میں لچر گانوں کا تڑکا ہوتا، چہرے کی رنگینی اور جسمانی خطوط کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ وہ بلیک ہول تھا جو ٹیلنٹ اور فنی خوبیوں کو نگل گیا تھا۔ ہیرا منڈی جیسے رایل پارک میں آباد ہوگئی تھی۔ حالات ایسے ہوگئے کہ مذکورہ حسین اداکارہ فلم ''تیس مار خان'' میں کام کر رہی تھی۔ وہ نیم خواندہ تھی، چند ڈائلاگ بول سکتی تھی اور ہیجانی رقص کر سکتی تھی۔ حزیں قادری صاحب نے اُسے اس پنجابی فلم میں ایک سچویشن سمجھائی جو خاصی دل گیر تھی۔ اسے سمجھاتے ہوئے حزیں نے اداکارہ سے کہا ''بی بی تم گانا گاتے ہوئے گھر میں داخل ہوتی ہو۔ سامنے باپ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اسے دُشمن قتل کر گئے ہیں۔ تم نے یہ دیکھ کر بیٹھ جانا ہے۔'' یہ سن کر فن کارہ نے متذبذب لہجے میں پنجابی میں پوچھا 'ایہہ سین کامیڈی اے یا ٹریجڈی؟' (یہ سین کامیڈی ہے یا ٹریجڈی)۔''

انھوں نے موازنہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹی وی کے آنے سے باصلاحیت لوگوں کا فن چمک اُٹھا۔ ریڈیو والے لوگ ٹی وی کی جانب آئے۔ ان میں اشفاق احمد، منو بھائی، احمد ندیم قاسمی، انور سجاد اور دیگر کئی شامل تھے۔ اس میں زیادہ پذیرائی تھی۔ ابتدا میں سب کی مشق مائکروفون کی تھی۔ سو انھیں کیمرے کی زبان کا علم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی

ڈراموں میں لفاظی زیادہ ہے۔ آہستہ آہستہ سب ماحول کے مطابق ڈھل گئے۔ کسی چیز کی اہمیت اُس کی ضد سے متعین ہوتی ہے۔ اسی طرح موازنہ ہوسکتا ہے۔ وگرنہ سولو فلائٹ رہتی ہے۔ ابتدا جملے طویل اور ڈائلاگ کچھ حد تک غیر حقیقی تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ سب بدل گیا۔ ان میں تین آدمیوں میں غیر معمولی صلاحیت تھی، کنور آفتاب، یاور حیات اور محمد نثار حسین۔ تینوں کے مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ غیر معمولی لوگوں کو غیر معمولی مواقع ملیں تو یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے۔ دولت، شہرت اور کام یابی ملنے سے انسان میں بعض اوقات عجیب و غریب تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں یا تو تکبر در آتا ہے، بال کی کھال اُتارنے کی عادت ہو جاتی ہے یا پھر غیر معمولی عاجزی آجاتی ہے۔''

امجد صاحب نے ایک بہ ظاہر معمولی لیکن ان کے لیے یادگار واقعہ بیان کیا۔

''ایک مرتبہ میں فردوس جمال اور عابد علی کے ساتھ پی ٹی وی لاہور اسٹیشن کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ ان دنوں میرا ڈراما ''وارث'' ٹی وی سے نشر ہو رہا تھا۔ وہ رکشے کا انتظار کر رہے تھے اور میں کسی کو ملنے کا منتظر تھا۔ سامنے ایک سائیکل سوار، سائیکل کھڑی کر کے مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے تیل میں بھیگے ملگجے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عابد علی اور فردوس جمال کے رخصت ہونے کے بعد وہ میرے قریب آیا۔ میں اس کے مسلسل دیکھنے کی وجہ سے بے چین ہو رہا تھا۔ قریب آکر اُس نے پنجابی میں پوچھا ''سر وارث تُسی لکھیا سی؟ (سر وارث آپ نے لکھا تھا) میرا فوری تاثر یہ تھا کہ وہ نیلام گھر کا یا کسی اور پروگرام کا پاس مانگے گا۔ سو میں نے سپاٹ لہجے میں کہا ''ہاں بھئی کیوں کیا بات ہے؟'' اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''بادشاہ نوکر ہیگے آں تیرے (بادشاہ، تمھارے نوکر ہیں)۔ یہ کہہ کر وہ سائیکل پر بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ایک دنیا کی مار کھایا ہوا شخص میرا شکر گزار ہوا ہے کہ میں نے اُس کے حقوق کی بات کی ہے۔ مجھے لگا کہ ساری مجبور عوام کہہ رہی ہے ''تم نے ہماری بات کی ہے۔'' اس بات نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ میں نے زندگی بھر حقیقت سے ناتا نہیں توڑا اس لیے میرے پاؤں زمین پر رہے اور دماغ درست جگہ پر رہا۔''

''ایسی کام یابی پر تو لوگ فلم کا رخ کرتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''پاکستان کی فلم انڈسٹری صحیح معنوں میں وہ پختگی نہ پا سکی جو ڈرامے کو حاصل تھی۔ ہندوستان میں 1930 کی دہائی میں وی شانتارام نے پونا میں فلم کا تربیتی ادارہ بنایا تھا۔ وہیں سے پڑھے لکھے سلجھے فلم ساز نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس جانب اوّل درجے کے لوگ نہ آئے۔ جو آئے اُن کی ذہنی بصارت محدود تھی۔ فلم کی اپنی زبان ہوتی ہے، اُسے سیکھے بغیر اچھی فلم نہیں بن سکتی۔ اعلیٰ معیار کے چند لوگ جیسے تنویر نقوی، قتیل شفائی وغیرہ اس جانب ضرور آئے اور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال

لیا۔ البتہ دوسرے لوگ یا تو آئے نہیں یا ناکام ہو گئے۔"

"ایران میں شان دار فلمیں بن رہی ہیں" میں نے گزارش کی تو انھوں نے وضاحت کی۔

"ایران پر فرانس کے اثرات تھے۔ فرانس آرٹ کی آماج گاہ تھا۔ ایران پر اس کے مثبت اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ویسے بھی ایران میں تہذیبی روایت مضبوط تھی۔ ہندوستان میں مدراس اور کلکتے میں فلم کے اپنے ادارے تھے جنھوں نے اپنی ثقافت پیش کر کے اسے بڑھوتری دی۔ وہاں کے لوگ بھی خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ اِدھر پاکستان میں فارمولا فلموں کا رواج پڑ گیا۔ یہ فلمیں جلد بک جاتی تھیں، اس لیے لوگ فوری بازیافت کے لیے اس جانب آ گئے۔ سلطان راہی کی صورت میں ایک پورا انداز مجسم ہوا۔ ان کی فلموں میں ایک کاری گر، مکینک یا عام آدمی کی ایک امیر آدمی کی بیٹی سے محبت دکھائی جاتی۔ چوں کہ عام زندگی میں ایسا کم ممکن تھا، اس لیے لوگوں کو اس میں آسودگی اور کتھارسس مل جاتے تھے۔ زیادہ تر فلمیں غریب امیر، ظالم مظلوم اور جابر مجبور کی جنگ کے موضوع پر ہوتی تھیں۔ گو سلطان راہی نے ایک ہی رول دس مرتبہ کیا پر ہر مرتبہ اس میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیتے تھے۔"

"آج کل فلم کا احیا ہو رہا ہے جو خوش آیند ہے۔" میں نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

وہ سوچتے ہوئے بولے "آج کے فلم سے وابستہ لوگ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ یہ زمینی ثقافت اور روایت سے کٹے ہوئے ہیں۔ میری زیادہ اُمید ان نوجوان لڑکے لڑکیوں سے ہے جو ابھی مقامی اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔ وہ یہاں کے حقائق سے زیادہ قریب زندگی بسر کرتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں۔ اس لیے مجھے توقع ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مثبت تبدیلی لے کر آئیں گے۔ ویسے تو فلم کی دنیا بدل رہی ہے۔ ہالی ووڈ میں فلمیں تکنیک کار بنا رہے ہیں۔ آج کا انسان خیالی دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ آس پاس کی زندگی بے معنی ہوتی جا رہی ہے۔ مغرب کا معاشرہ لا خدا اور لا ولد ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں کے میلوں، نوٹنکیوں، کشتیوں اور ان سے وابستہ تخلیقی شعبوں کو آہستہ آہستہ مغرب کے ذرائع نے حد درجہ متاثر کر دیا ہے۔ یہ متبادل ذرائع حقیقی نہیں۔ اسی لیے یہاں ایک عجب انتشار نظر آتا ہے۔ اگر ہمارے زمین سے وابستہ تخلیقی ذرائع بہ تدریج نئے دور میں داخل ہوتے تو زیادہ توانا ہوتے۔"

مقام بدلتے ہیں، بستیاں، دیہات، جنگل، ویرانے میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، سفر کرتا ہے پر اُس کا اصل تعلق اُسی جگہ سے رہتا ہے جہاں اُس کی آنول نال دبی ہوتی ہے یا اُس کے گھرانے کا پہلا مردہ دفن ہوتا ہے۔

پس زندگی آنول نال دفنانے سے مردہ دفنانے کے درمیان کا ایک وقفہ ہے۔

امجد صاحب سے لاہور، کراچی، پنڈی، اسلام آباد میں ملاقاتیں رہیں۔ اُن کی شفقت زیادہ تھی

اور میری طالب علمانہ محبت بھی کم نہ تھی۔

امجد صاحب کو بے شمار ملاقاتوں میں مَیں نے متوازن اور مثبت سوچ کا مالک پایا۔ ہمارے ہاں کی عمومی روایت، جس کے تحت یا تو کسی کو شیطان یا فرشتہ سمجھ لیا جاتا ہے، کے برعکس انھوں نے انسان کو خوبی وخطا کا پتلا ہی سمجھا ہے۔ میں نے اُنھیں بعض باصلاحیت اور ضرورت مند شعرا کے لیے حد درجہ ہم درد پایا ہے۔ نہ صرف اُن کی مستقل دل جوئی کرتے رہے ہیں بلکہ اُنھیں متعارف کروانے کے بہتر مواقع کے حوالے سے ملکی و بین الاقوامی مشاعروں میں مدعو کروانے میں بھی معاون ثابت ہوئے ہیں۔ اس دور کے نباض ہیں سو مشاعروں کی کمرشل اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ چناں چہ خیر اور فلاح کے کاموں میں بلا معاوضہ خوب بڑھ جاتے ہیں اور جدھر میز بانوں کا ان سے معاشی فائدہ وابستہ ہو وہاں دانش مندی اور عملیت پسندی سے معاملات طے کرتے ہیں۔ حد درجہ حساس ہیں سوز و درنج بھی ہیں۔ خوش طبعی میں شگفتہ مزاجی کے تحت کسی سے ظریفانہ گفت گو تو پسند کرتے ہیں پر تہذیب سے گری یا ذاتی تضحیک پر مبنی سستی گفت گو کو نہ صرف ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس کا اظہار فوری کر دیتے ہیں۔ جس شعبے سے بھی وابستہ ہوتے ہیں، اس میں خوب محنت اور توجہ سے صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ البتہ بعض اوقات دو شعبوں سے بہ یک وابستگی کے دوران کسی ایک شعبے کو فوقیت دینا پڑ جاتی ہے۔ کالج میں تدریس کے دوران ٹی وی سے وابستگی کی مصروفیت اس درجہ بڑھ گئی کہ ایک وسیع تر قومی سطح پر ناظرین کی ذہنی تربیت کے لیے تدریسی ذمّہ داریوں کو مختصر مدت کے لیے پسِ پشت ڈالنا پڑا۔

اسلام آباد میں ہونے والی ایک ملاقات میں اُنھوں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے تاسف کا ذکر کیا جو اُنھیں بے چین رکھتا تھا۔ ایک ایسا رنج جس کا مداوا اب ممکن نہیں تھا۔ پر اس سے پہلے اُسی ملاقات میں ہونے والی پر خیال گفت گو کا کچھ تذکرہ۔

اسلام آباد کی، بالوں میں مانگ کی مانند، درختوں کے بیچ کھچی شاہ راہوں میں سے ایک کے نزدیک برلبِ بازار ایک ہوٹل کی بالائی منزل کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے اُنھوں نے ایک رات انسان کے ہنوز زیرِ تحقیق معاملے کی جانب اشارہ کیا۔

''میں شروع ہی سے سوچتا رہا ہوں کہ انسان کے دماغ میں خیال کہاں سے آتا ہے۔''

سامنے نیچے پان سگریٹ کی دکان کا مالک سر کھجا رہا تھا، ایک اسٹال پر ٹوپیاں، پی کیپ رکھی تھیں، دکانوں میں مناسب رش نظر آ رہا تھا، کون آئس کریم والا ایک بچے کو آئس کریم پکڑا رہا تھا جسے وہ اپنے باپ کا ہاتھ چھوڑ کر بہت شوق اور احتیاط سے دونوں ہاتھوں سے تھام رہا تھا۔ خوب چہل پہل تھی جو عموماً اسلام آباد میں کم کم ہوتی ہے۔

قمقموں کی ایک لڑی سامنے لٹک رہی تھی جس کی پیلی چمک دار روشنی میں سامنے چوڑیوں کے اسٹال کی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔

''میں نے دیکھا ہے کہ انسان کے فہم و ادراک، حقیقت اور توہم کے بیچ بہت سے خاکستری حصے (Grey Areas) ہوتے ہیں۔ انسان اب تک ان کی تفہیم نہیں کر پایا۔ انھی حصوں میں روحانیت اور ماورائی معاملات کے ڈانڈے جا ملتے ہیں۔ ایک شخص کو یک دم بیٹھے بٹھائے کوئی انوکھا خیال سُوجھتا ہے، شاعر پر عمدہ شعر نازل ہو جاتا ہے اور تخلیق کار کی چشمِ خیال کے سامنے ڈھلا ڈھلایا بنا بنایا فن پارہ آن موجود ہوتا ہے۔''

میں نے ایک خیال انگیز قصہ سنایا۔

''لاطینی امریکا کے نوبل انعام یافتہ ادیب گبرئیل گارشیا مارکیز جس کے ناول 'تنہائی کے سو سال' کو بعض ناقدین بیسویں صدی کا سب سے بڑا ناول سمجھتے ہیں، کے بارے میں اس حوالے سے عجب واقعہ ہے۔''

امجد صاحب غور سے میری بات سن رہے تھے۔ دُور مارکیٹ کے لوگوں کا مدھم شور، موسیقی اور گاڑیوں کے ہارن پس منظر میں سنائی دے رہے تھے۔

''وہ کہتا تھا کہ اس ناول کی کہانی کا مبہم سا خاکہ اُس کے ذہن میں اٹھارہ برس کی عمر سے موجود تھا۔ البتہ اُسے سُوجھ نہ رہا تھا کہ اسے کس طرح لکھا جائے۔ ایک روز جب وہ، اُس کی بیوی مرسیدس اور بچے تعطیلات پر گاڑی میں تفریحی مقام کو جا رہے تھے، کہ ناول کی ساخت اور لہجہ اُس کے دماغ میں کوندے کی طرح لشکارا دکھا گیا۔ دراصل یہ کہانی اُس کی قریب ترین ہستی، اُس کی نانی کے کہانی سنانے کے انداز میں بیان کرنا تھی۔ اسے کہانی وہاں سے شروع کرنا تھی جہاں اُس کے نانا اُسے پہلی مرتبہ برف دکھانے لے گئے تھے۔ اس کشف کے وارد ہوتے ہی مارکیز نے اپنی گاڑی کا رخ واپس گھر کی جانب موڑ لیا۔ وہاں اُس نے گاڑی بیچ ڈالی اور ناول لکھنے میں جت گیا۔ گاڑی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم چھے ماہ کے لیے کافی تھی، مگر ناول لکھنے میں اسے ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس کی اصل طاقت تخلیق کا جنون اور وفور تھا اور حقیقی سہارا اُس کی بیوی تھی جس نے اس عرصے میں سارے گھر کا انتظام سنبھالے رکھا اور اُسے کوئی مشکل پیش آنے نہ دی۔ سو بعض دفعہ کوئی خیال سفر کے دوران دماغ پر وارد ہو جاتا ہے اور کئی مرتبہ سوتے میں خواب کی صورت ایسی طاقت سے نازل ہوتا ہے کہ تخلیق کار نیند سے اُٹھ کر اُسے قلم کی گرفت میں لانے کی سعی کرنے لگتا ہے۔''

امجد صاحب نے اضافہ کیا۔

''ہمارے ہاں ایسے تخلیق کاروں کی کمی نہیں رہی جن کا خیال قطعی وہبی اور قدرتی ہے، مسلط کردہ نہیں۔ ساری دنیا کا ادب، بڑا ادب لہروں کی شکل میں چلتا ہے۔ ادب کے رومانی دور کو دیکھ لیں، سوشلزم، کمیونزم کا دور دیکھ لیا جائے یا بعد کے جادوئی حقیقت نگاری کا دور دیکھ لیا جائے سب لہر در لہر آئے اور ساحلِ وقت پر سیپیاں چھوڑ گئے۔ ہمارے ہاں اہم ترین نثر نگاروں کی پیدائش 1910 سے لے کر 1932 کے درمیان نظر آتی ہے۔ لاطینی امریکا میں 1950 سے 2000 تک اہم ادیب سامنے آتے رہے۔ اردو ادب میں اہم لوگ 1950 تک لکھنا شروع کر چکے تھے۔ بین الاقوامی ادب کے مقامی ادب پر اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ منٹو نے ترجموں سے آغاز کیا، سجاد ظہیر بیرونِ ملک گئے اور دیگر ادیبوں کا بھی بین الاقوامی ادب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واسطہ ہوا۔ 1920 سے پہلے کے ادب میں غریب، مظلوم اور بے کس کی بے چارگی نظر آتی تھی، بعد ازاں اس کی وجوہات کی جانب زیادہ توجہ کی گئی۔ ایک ریلا چلتا ہے جو کہیں مدغم ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج بھی ہمارے ہاں ایک ریلا تخلیق ہو رہا ہو جو بعد میں نظر آنا شروع ہو۔ ہمارے ہاں آج بھی حوصلہ افزا اور خوش کن امکانات نظر آتے ہیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا تقابل ماضی کے اہم لوگوں سے چھوڑ دیا جائے۔ انھیں موجود کے عوامل و عناصر کے مطابق دیکھیں۔ ہمارے ہاں حقیقی، خالص اور زمین سے جڑی ہوئی سوچ کم ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ معاملہ باعثِ تفکر ہے۔ غالباً ہم بیرونی خیال سے اتنے متاثر و مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہاں موجود روایت، فکر اور ثقافت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ البتہ امکانات موجود ہیں۔ میری نظر میں 'اچھی شاعری دل کے ذریعے دماغ کو چھو لیتی ہے'۔ اس کے اہم عناصر میں خیال کے علاوہ ابلاغ اور غنائیت شامل ہیں۔ شاید اسی لیے مجھے ذاتی طور پر نظم، غزل کی نسبت زیادہ پسند ہے۔ اردو کے بھی دو دھارے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد گو اُردو ہندی بہ ظاہر قریباً ایک طرح سے بولی جاتی تھیں، مگر ان کا اندازِ تحریر مختلف تھا۔ اردو فارسی، عربی سکرپٹ میں لکھی جاتی ہے جب کہ ہندی کا اسکرپٹ دیوناگری ہے۔ آج ہندوستان میں اردو شاعری دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اردو شاعری فلمی سطح پر مقبول رہی ہے۔ مجروح سلطان پوری، جان نثار اختر، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور شکیل بدایونی کو عام فہم انداز میں سادہ الفاظ کی نیم رومانی شاعری کرنا پڑی۔ چناں چہ ساٹھ کی دہائی تک ہندوستان میں زبان کی ساخت اور الفاظ سادہ ہوتے چلے گئے۔ پاکستان میں پیچیدہ اور کثیر الجہتی تجربات کیے جاتے رہے۔ دل چسپ بات ہے کہ ہمارے ہاں اضافت (زیر، زبر، پیش وغیرہ) کا استعمال عام ہے۔ یہ ہندی میں ندارد ہے۔ وہاں کے شعرا میں اس کا استعمال کم کم ہے۔ ہماری زبان پر فارسی کے اثرات موجود ہیں جب کہ وہاں ہندی کے اثرات زیادہ ہیں۔ وہاں مشاعرے کی روایت آج بھی معروف ہے جب کہ یہاں اس کی مقبولیت میں کمی آئی ہے۔ سو زبان تو ایک ہی ہے مگر حالات اس میں بہ تدریج تبدیلی لے آتے ہیں۔''

باتیں ہوتی رہیں، نثر کی، شاعری کی، ادیبوں کی، معروف ادب بہ مقابلہ اعلیٰ ادب کی، تخلیق کاروں کی کج ادائیوں کی اور خیال کی رسائیوں کی۔

شنید ہے کہ شاعری کی صنف پہلے کی طرح مقبول نہ رہی ہے۔ آج بھی عالمی سطح پر سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں تین شعرا کی شاعری سرِ فہرست ہوتی ہے، شیکسپیئر، لاؤزو اور خلیل جبران۔ اُس روز بہتی ہوا میں خوش لباس اور شکستہ تن خریداروں کے اُڑتے لبادوں، بکھرتے بالوں اور اُبلتے قہقہوں کے بیچ بیٹھے، مجھ سے بصیرت آموز لہجے میں کہنے لگے "پاکستان وقت سے پہلے پیدا ہونے والا بچہ ہے۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا "یعنی نویں کے بجائے ساتویں آٹھویں مہینے پیدا ہونے والا بچہ۔"

"شاید ایسا ہی ہے۔" انھوں نے بات جاری رکھی۔

"دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے، ہماری ولادت جو شاید 1960 میں ہوتی، 1947 میں ہوگئی۔ برطانیہ کو ایسے حالات درپیش ہوگئے کہ اُسے نوآبادیات کو اپنے تسلط سے قبل از وقت آزاد کرنا پڑ گیا۔ پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ بنیادی طور پر رفاہی کاموں کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی پرورش سیاسی امور پر نہ کی گئی تھی جب کہ کانگریس کی سیاسی تربیت اور ارتقا جلد اسے بالغ سیاسی جماعت کے طور پر سامنے لے آیا۔ اس نے اپنے کارکنوں کی تربیت جمہوری اور سیاسی اساس پر کی۔ مسلم لیگ صحیح معنوں میں کُل بارہ برس، یعنی 1935 سے 1947 تک سیاسی کردار ادا کرتی ہے۔"

میں نے اُن کی بات سمجھتے ہوئے کہا "بارہ برس کے مسلم لیگی بچے کو قیامِ وطن کے موقع پر تریسٹھ سالہ جہاں دیدہ و تجربہ کار کانگریسی بزرگ کا سامنا تھا۔"

انھوں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اس پر مستزاد یہ کہ بھارت کے جواہر لال نہرو آزادی کے 17 برس بعد تک حیات رہے جب کہ قائداعظم ایک برس بعد انتقال کر گئے۔"

امجد صاحب نے دور نظریں جماتے ہوئے پتے کی بات کہی "پاکستان کا انتظام شروع میں یوپی، سی پی کے پڑھے لکھے تہذیب یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ انتقالِ آبادی کے بعد پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں زیادہ تر لوگ وہیں سے آئے۔ لہٰذا مہاجرین کی آبادکاری کے لیے بیوروکریسی کے ان لوگوں کو مصلحتاً سندھ و پنجاب کے طاقت ور جاگیرداروں سے سمجھوتا کرنا پڑ گیا۔ یوں وہ جاگیرداری نظام اور سوچ جو بھارت میں پندرہ اگست کی شام تین بجے ختم کر دیے گئے یہاں نہ صرف قائم رہے بلکہ محفوظ بھی ہوئے۔ یہاں سیاسی تربیت کے فقدان کی وجہ سے کوئی نظام جم کر نہ بیٹھ پایا۔ محلاتی سازشیں اور فوری مفادات مقدم ٹھہرے۔ چناں چہ کوئی مضبوط، مستقل اور دیرپا ڈھانچا قائم نہ ہو پایا۔ جس کے ہاتھ بھی عنان

اقتدار آیا اس نے اپنا نظام مسلط کرنے کی کوشش کی جو اس کے رخصت ہوتے ہی منہدم ہو گیا۔''

میں نے حسرت اور دکھ سے پوچھا ''کسی جانب کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔''

انھوں نے رات کے اس پہر قریبی بلند و بالا رہایشی عمارتوں کے فلیٹوں کی بجھتی بتیوں کو دیکھتے ہوئے کہا ''یقیناً بہت سے سسٹم بہتر ہوئے ہیں۔ ہمارے اندر شعور بڑھا ہے اور بہتری کی مثبت خواہش میں بھی اضافہ ہوا ہے، پر فقط شعور و خواہش بے فائدہ ہیں جب تک ہمارے سامنے ایک ٹھوس، قابلِ عمل اور متفقہ لائحہ عمل نہ ہو۔ اس لائحہ عمل میں سب سے اہم جدید تعلیم ہے۔ ایک ایسا یکساں تعلیمی نظام جس میں متعلقہ تکنیکی وفنی عملی علوم کی ایسی آمیزش ہو جو ہمیں پیروں پر کھڑا کر دے۔ تعلیم کے ساتھ نصاب میں معاشرتی تربیت کو شامل کرنا بھی ضروری ہے اور اس کے عملی مظاہرے کا انتظام بھی لازم ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک دشوار امر نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے ذہین و اعلیٰ تعلیم یافتہ مخلص لوگوں کی جماعت موجود ہے جو ایسا نظامِ تعلیم ترتیب دے کر اس کے تسلسل کی نگرانی کر سکے تو ہماری دانش گاہیں مستقبل کے حقیقی معمار پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل کر کے وطنِ پاک کو وہ باعزت مقام دلا سکتی ہیں جس کا ہر پاکستانی دلی طور پر خواہش مند ہے۔''

بعض اوقات رات کو ہوا تیز ہو جاتی ہے۔ اُس رات ہوا میں تیزی کچھ بڑھ کر تھی۔ سو بار بار ہماری آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا۔

یہ اُسی رات کی بات ہے جب بالکونی کے سامنے، نیچے بازار میں خوب ریل پیل تھی، کئی زندگیاں وقت کی پالکی میں بیٹھی اکل پیا رخ چلی جاتی تھیں، آوازیں دھوئیں کے مرغولوں کی طرح اُٹھتی تھیں اور فضائے بسیط میں معدوم ہو جاتی تھیں۔ اوپر بالکونی میں بیٹھے باتیں کرتے کرتے جہانِ فن کی روایات کے امین اور اساتذۂ ادب کے وارث امجد اسلام امجد صاحب نے مجھے اپنا دُکھ بتایا تھا۔

''جب میں کسی قابل ہوا کہ اُن کی خدمت کر سکتا تو میری ماں جی فوت ہو گئیں۔ مرے چار سُو ہے دُھواں دُھواں، مرے خواب سے مری آنکھ تک، یہ جو سیلِ اشک ہے درمیاں، اسی سیلِ اشک کے پار ہے، کہیں میری ماں!''

کوزہ گر

محمد الیاس
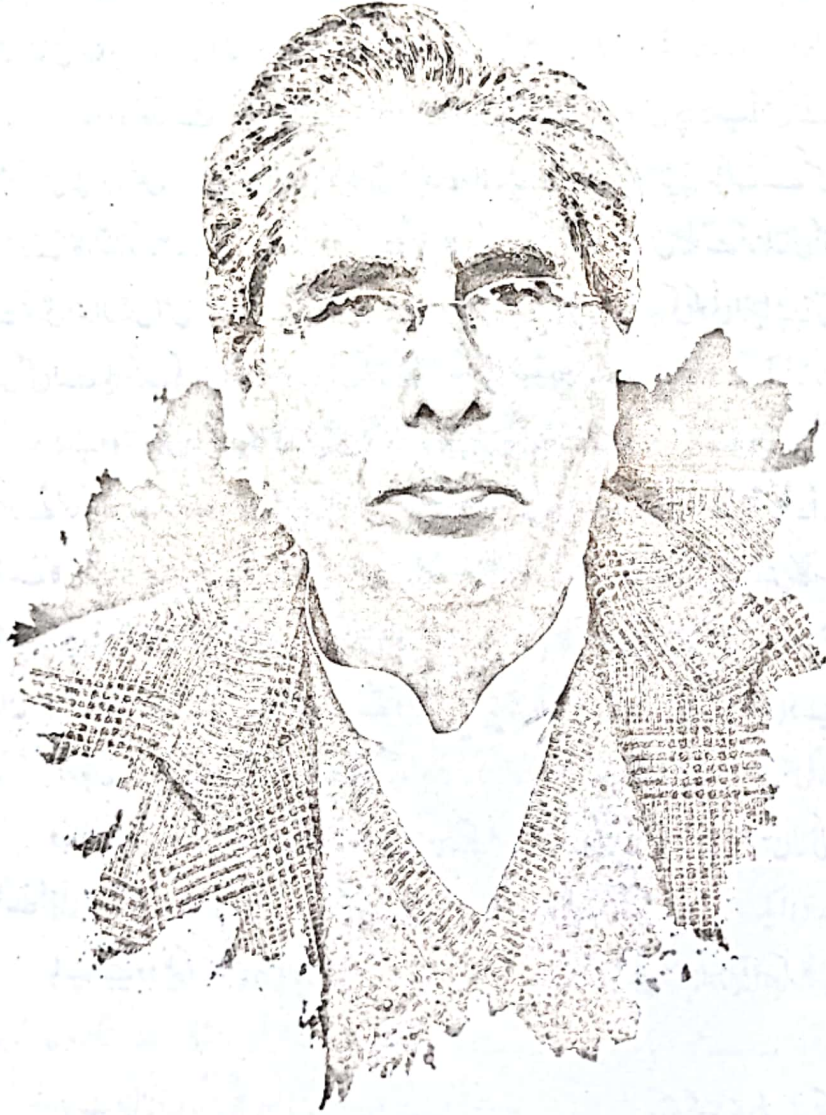
یہ ایک باپ اور بیٹے کی دل کو چھو لینے والی محبت کی سچی کہانی ہے۔

بیٹا سب بچوں میں سب سے چھوٹا، باپ کا سب سے لاڈلا تھا۔ اُس کی عمر پانچ ایک برس ہونے کو تھی۔ وہ ایک رات بھی باپ کے بغیر نہیں سویا تھا۔ کبھی رات کے اندھیرے میں اُس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ بے چینی سے بستر ٹٹولتے ہوئے باپ تک پہنچ جاتا اور اُس کے سینے سے لگ کر سکون سے سو جاتا۔ اُن کی ایسی دوستی تھی کہ بیٹا باپ کو 'یار' کہہ کر بلاتا اور باپ اُسے ''جی اوٗ'' کہہ کر لپٹا لیتا۔ باپ بیٹا وفورِ محبت میں مہمل لفظوں کا تبادلہ کرنے لگتے۔ باپ بولتا ''کھوتے مالے باگلے گدھے گالے گاکلے'' بچہ کھلکھلا کر ہنستا اور باپ کو گدگدی کرتا جاتا اور یہی الفاظ توتلی زبان میں دُہراتا جاتا۔

بچے کو دو شوق تھے۔ ایک فوجی بننے کا اور دوسرا نسوانی صحبت کا۔ چناں چہ جب اُس کے ہم عمر بچے کھلونوں کی فرمائش کرتے، وہ چھوٹی سی فوجی جیکٹ، لانگ شوز اور پتلون پہنے سڑک سے کسی فوجی کے گزرنے کا انتظار کرتا۔ جب کوئی فوجی وہاں سے گزرتا یہ اُسے عسکری انداز میں سیلوٹ کرتا۔ وہ بھی خوش دلی سے فوجی انداز میں اس کے سیلوٹ کا جواب دے دیا کرتا جس پر بچے کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ کھلونوں میں بھی اسے پلاسٹک کی بندوقیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں کا شوق تھا۔

جب وہ اسکول داخل ہوا تو اپنی من پسند مِس سے زیادہ ہی مانوس ہو گیا۔ اُسے وجہ، بے وجہ چھوٹے چھوٹے تحائف دیا کرتا۔ گھر میں کوئی چیز پسند آجاتی تو اسے مِس کو تحفتاً دینے کی ضد کیا کرتا۔ اُسے سائیکل چلانے کا شوق تھا، چناں چہ ٹرائی سائیکل پر اپنے سے بڑی لڑکیوں کو بٹھا کر اُسے کھینچتا تو اُس کا سانس پھول جاتا اور چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہو جاتا۔ اُسے منع کیا جاتا تو باقاعدہ ناراض ہو جاتا۔ ہم عمر لڑکے ٹرائی سائیکل پر سواری کی خواہش کا اظہار کرتے تو توتلی آواز میں انھیں انکار کر دیتا۔ سبھی ہنس دیتے۔

اور ہاں اُس کی ایک خواہش اور بھی تھی۔

وہ جلدی جلدی بڑا ہونا چاہتا تھا تاکہ فوجی بن سکے اور اُس کے لیے پیاری سی دُلھن لائی جائے۔ نہ جانے اُس کے دِل میں کس نے شادی کا شوق ڈال دیا تھا۔

باپ بیٹے کو دیکھ کر نہال ہوتا اور سوچتا کہ اُس کا بیٹا بالکل اُس کا ہم شکل ہے اور بڑا ہو کر بھرپور مرد بنے گا۔

وہ بے انتہا لاڈلا، ہنس مکھ اور زندہ دِل بچہ جب اپنی محبت کے جال میں سبھی کو بڑی طرح جکڑ چکا تو بیمار رہنے لگا۔ جلد تھک جاتا اور جسم دبوانے لگتا۔ بھوک کم ہونے لگی، وزن گر گیا اور نقاہت طاری رہنے لگی۔ ماں باپ اپنے جگر گوشے کو سینے سے لگائے ڈاکٹر ڈاکٹر در در پھرنے لگے۔ اُس کے بے شمار ٹیسٹ ہوئے۔ ہر ٹیسٹ پر سوئی اُس پھول سے بچے کی نسوں میں اُتاری جاتی تو بلبلا کر التجا کرتا ''بار بار سوئیاں نہ چبھو۔''

درحقیقت سوئیاں تو ماں باپ کے دل میں اُترتی تھیں اور خون چوستی تھیں۔

بالآخر اُس معصوم کو کینسر تشخیص ہوا، بون میرو کینسر جو اپنی آخری حدود میں تھا۔ اس انکشاف نے باپ کو پُرعزم کر دیا۔ اُس نے اپنی ساری جائداد نیلام کرنے کا ارادہ کر لیا اور تہیہ کر لیا کہ وہ جھولی پھیلائے گلیوں بازاروں میں بھیک مانگے گا۔ اپنے مُنّے کھوتے مالے بالگلے کا دنیا کے بہترین اسپتالوں میں علاج کروائے گا۔

وقت زخمی ہاتھ میں آئی ڈور کی طرح پھسل رہا تھا۔ بچے کی صحت منہ کے بل گرتے ہوائی چھتری بردار ہواباز کی طرح تیزی سے گر رہی تھی۔ ماں باپ کو اُمید تھی کہ شاید زندگی کی چھتری بیچ میں کھل جائے اور بچہ بہ حفاظت اُتر کر بساطِ حیات پر پھر سے اپنے ننھے قدموں سے چلنے لگے۔

بچے کا اسکول چھوٹ چکا تھا۔ بیماری کا سن کر اسکول کا جوان پرنسپل اپنے ننھے طالب علم کی عیادت کو آیا۔ چھ فٹ کے جوان معلم نے سامنے پڑے کم زور بچے کو اس حالت میں دیکھا تو لرزتے لہجے میں پوچھا ''اسکول نہیں آؤ گے؟'' بچے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پرنسپل کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ روتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

باپ نے آگے بڑھ کر زرد رُخسار پر بوسہ دیا تو چمکتی آنکھوں والے نڈھال بچے نے ہولے سے خشک مُنّے ہونٹوں کو گول کر کے بوسے کے انداز میں جنبش دی۔ وہ منظر باپ کے دِل پر نقش ہو گیا اور ساری زندگی اس نقش میں سمٹ آئی۔ وہ ایک بوسہ باپ کو جیتے جی مار گیا۔

دن کے پہلے پہر کو بچے نے سرخ قے کی اور آنکھیں موند لیں۔ باپ نے بے قرار ہو کر اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کر سانس بحال کرنے کے لیے اُسے کھینچا تو منہ خون سے بھر آیا۔ بچے کا جگر کٹ کے منہ میں آ گیا تھا۔

باپ کی ساری زندگی کے گزرے لمحات اور آنے والے دِن اُس ایک بوسے کی نذر ہوئے۔ وہ آخری بوسہ جو محمد الیاس نے اپنے لختِ جگر حیدر سانول کا لیا تھا۔

ایسے ہی ایک موقع پر غالبؔ اپنے لختِ جگر کی موت پر پکار اُٹھا تھا۔ جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے، کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور۔

اُس قیامت نے محمد الیاس پدرِ بے مایہ کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ اُس راکھ میں سے چنگاریاں اُڑیں اور ایک ققنس برآمد ہوا۔ محمد الیاس افسانہ نگار کا جنم ہوا۔ اُس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے، رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔

یہ دھچکا کچھ ایسا جان لیوا تھا کہ محمد الیاس نے قلم تھاما اور لکھنا شروع کیا۔ اُس کا جوہرِ پوشیدہ اپنی تاب ناکیوں کے ساتھ نمایاں ہوا۔ اگر وہ قلم نہ تھامتا تو یہ غم اس کا کلیجہ پگھلا دیتا۔

دھچکا تو کُرّے کے دوسری جانب بھی اُترا تھا اور کسی اور پر اُترا تھا، جس پر اُترا تھا اُس کا نام محمد الیاس نہ تھا۔

نیوزی لینڈ کی صدارتی انعام یافتہ مصنفہ جینیٹ فریم، ایک عام روایتی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ پانچ بچوں میں تیسرے نمبر پر پیدا ہونے والی جینیٹ کا باپ ریلوے میں ملازم اور ماں معروف مصنفہ کیتھرین مینز فیلڈ کے ہاں گھریلو خادمہ تھی۔ معمول کی تعلیم حاصل کر کے وہ دونیڈن کالج میں تدریس سے وابستہ ہوگئی۔ اِس دوران اُس کی دو بہنیں نوجوانی ہی میں مختلف حادثات میں ڈوب کر ہلاک ہوگئیں اور بھائی نفسیاتی خلفشار کا شکار ہوگیا۔ نتیجتاً جینیٹ نے خودکشی کی ناکام کوشش کی اور اُسے نفسیاتی علاج کے لیے سی کلف نامی ادارے میں داخل کرا دیا گیا۔ پے در پے جذباتی حادثات نے اُسے ناقابلِ تلافی دماغی نقصان پہنچایا۔ وہ نفسیاتی شفاخانے میں پہنچی تو قلم تھام کر لکھنا شروع کیا۔ اُس کے ایک معالج نے یہ تحریریں دیکھیں اور متاثر ہو کر انھیں ایک نقاد اور ادارۂ طباعت کو بھجوا دیا۔ یہیں سے اُس کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ ماورائی ماحول تخلیق کر کے اُس میں کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا عمدہ تجزیہ پیش کرتی۔ جذباتی دھچکوں نے اُسے اپنے اندر پناہ لینے پر مجبور کیا اور جب وہ باہر نکلی تو ''اُلّو بھی روتے ہیں'' جیسے لازوال تخلیقی شاہ کار ہاتھوں میں تھامے اُبھری۔ وہ عام سی لڑکی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایسے ہی ناآشنا تھی جیسے امریکی سیلز مین ڈیرک اموٹو تھا جو ایک دماغی چوٹ کے بعد طویل نیند سے اُٹھنے کے بعد اپنے دوست سسٹرم کے گھر گیا تھا اور وہاں پڑے پیانو پر کمالِ مہارت سے جاز اور دوسری دھنیں بجانے لگا تھا۔ اِس سے پہلے اُس نے کبھی نہ تو موسیقی میں دل چسپی لی تھی اور نہ ہی اس کی تربیت حاصل کی تھی۔ جب اُس نے عالمِ جنوں میں ماہرانہ چابک دستی سے کئی دُھنیں بجائیں اور اختتام پر اپنے دوست کی جانب سر اُٹھا کر دیکھا تو موسیقی آشنا دوست کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

موسیقی اور گیتوں سے روسی نابغہ انتون چیخوف یاد آتا ہے، اُس کے افسانے یاد آتے ہیں اور محمد الیاس کی جانب خیال چلا جاتا ہے۔

چیخوف سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ وہ افسانے کیوں لکھتا ہے تو اُس نے ایک حکایت بیان کی۔

''ایک خوش رنگ ننھے سے پرندے سے پوچھا گیا کہ وہ اتنے چھوٹے چھوٹے گیت کیوں گاتا ہے تو اُس نے جواب دیا، میری زندگی مختصر ہے اور میرے پاس گانے کو بے شمار گیت ہیں۔ میں اِس زندگی میں سبھی گیت گانا چاہتا ہوں۔''

محمد الیاس نے اُس جذباتی سانحے کے بعد تواتر سے افسانے تحریر کرنے شروع کیے۔ گو وہ افق پر دیر سے اُبھرا تھا مگر دانائے دروں بیں مولری کے بہ قول ''وہ درخت جو آہستگی سے اُگتے ہیں، عمدہ پھل دیتے

ہیں'' عمدہ تحریریں لے کر اُبھرا تھا۔ ان تحریروں نے موقر ادبی جرائد میں شائع ہو کر داد سمیٹنی شروع کی۔ ان افسانوں میں کیا بات تھی، یہ بعد کی بات ہے۔

ایک بات اور ہے۔ ایک روایت کے مطابق سانپ سو برس بعد انسان کا روپ دھار لیتا ہے اور ہندو دیوتا انسانی شکل میں اُتر آتے ہیں۔ روپ دھارنا اور بدل لینا اساطیر میں جا بجا ملتا ہے، جا بجا تو ایسا زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ چھوٹے سے پرندے کا لمبی تان میں کُوکنے والی کوئل کی جون میں بدلنا عجب نہیں۔

کچھ عجب نہیں کہ عمدہ چلبلے افسانے لکھتے لکھتے محمد الیاس نے طویل ضخیم ناول لکھنے شروع کر دیے۔ زندگی مختصر ہے، گیت بہت ہیں، اور وہ ہر گیت کو جی بھر کر لمبی تان میں گانا چاہتا ہے۔ محمد الیاس نے آدھ درجن شوخ و تیکھی کہانیوں پر مشتمل افسانوی مجموعے اور اتنے ہی عمدہ ناول تحریر کیے۔ انھیں اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ اصل انعام تو قارئین کی بے لوث محبت ہے جسے وہ ایک انمول اعزاز گردانتے ہیں۔

ان گیتوں میں ایک گیت ایسا ہے جو وہ فقط اپنے دل میں گاتے ہیں یا پھر مجھے سنایا ہے۔ ایک مکتوب کی شکل میں سنایا ہے۔ دو سو کتابی صفحات پر مشتمل رودادِ حیات۔ ایک طویل مکتوب۔

مکاتیب تو بہت مشہور ہوئے۔ بیش تر اصلی اور چند تخیل کی پیداوار۔

غالبؔ آشفتہ سر کے شگفتہ نامے ہوں، جاں نثار اختر کے نام بیگم صفیہ اختر کے دکھ اور رومان کی دھیمی آنچ میں سلگتے پیام نامے ہوں، ''چھوٹے روپ کے درشن'' میں عیاں ہوتے راجا انور اور یاسمین کے نجی نوعیت کے اقرار نامے ہوں یا فلسفے میں گندھے داؤد رہبر کے مکاتیب ہوں ــــــ سب اصلی۔ مرزا ادیب کے ''صحرا نورد کے خطوط ہوں'' یا قاضی عبدالغفار کے لکھے ''لیلیٰ کے خطوط'' ہوں جو عورت کی بے چارگی سے عبارت ہیں، ایک طوائف کے جاں گسل مسائل حیات کی روداد، قاضی عبدالغفار نے ان خطوط کی اشاعت سے چھے برس پہلے ایک طوائف سے بیاہ رچایا تھا جسے قبول نہ کیا گیا، پس یہ اسی کا شاخسانہ ٹھہرے۔ نہ اصلی اور نہ مکمل تخیلاتی۔ ان کے بین بین۔

محمد الیاس، میرے مربی، شفیق دوست، غم گسار اور راز داں، مکتوب کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

''اس امر پر غور کرتا رہا کہ مجھے اپنی گزری ہوئی ذاتی زندگی کے بارے میں لکھ دینا چاہیے یا نہیں، قلب و ذہن کے مابین تکرار ہوتی رہی۔ دل کا اصرار ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی تو ہم نفس ہو، ہم دم جس سے بندہ سب کچھ کہہ دے۔ اپنی زندگی کی لاحاصلی، روح کی تنہائی اور جبرِ مسلسل کی طرح فضول جیے جانے کی قدرتی ستم ظریفی پر غور کرتے ہوئے اکثر خواہش بیدار ہوتی ہے کہ کاش میری بھی کسی دریا کے ویران اور غیر آباد کنارے پر جھگی ہوتی، چھوٹی سی ناؤ، گھڑا پیالہ، پرالی کا فرش اور اوڑھنے کو کمبل۔ ساری زندگی ایسے ہی گزر جاتی۔''

گوشہ نشین ادیب سے میری شناسائی اور قلبی تعلق کی داستان طویل ہے اور ذاتی بھی۔ پس قصہ مختصر یہ ہے کہ ادبی تعلق سے شروع ہونے والی یہ کہانی فراز کی جانب رواں رہی، نشیب نہ آیا۔

میں وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں جب اسلام آباد کی سنہری دھوپ سرسبز گھنے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر ان کے نیچے ڈیرا جمانے والے حجاموں، چکڑ چھولے کی ریڑھی لگانے والوں اور درختوں کے تنوں پر نام کندہ کرنے والوں پر اپنی نرم حدت اُتارتی تھی۔ ایسے میں جب باہر زندگی پوری رونق سے رواں دواں تھی، میں کرائے کے ایک کمرے میں تنہا اور بیمار لیٹا تھا، تیمار دار تھا اور نہ ہی کوئی چارہ ساز۔ ایسے میں کمرے کا دروازہ ہولے سے کھٹکھٹایا گیا۔ میں نقاہت سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا گیا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے الیاس صاحب سنجیدگی سے کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے لفافے تھے۔ لفافے کمرے میں چھوڑ کر وہ باہر نکل گئے اور کچھ دیر میں اپنی گاڑی سے دو بڑی پتیلیاں لے آئے۔ اُن میں تازہ گرم بھاپ دیتا پرہیزی کھانا تھا اور لفافوں میں پھل۔

''میں نے سوچا میرا بھائی تنہا بیمار پڑا ہے۔ سوتزئین کو کہہ کر تازہ کھانا لے آیا ہوں۔ آپ کو مقوی غذا کی ضرورت ہے وگرنہ صحت ٹھیک کس طرح ہوگی۔''

وہ جذبۂ محبت مجھے سرشار کر گیا۔ اِس احساس کو ایک غریب الوطن بیمار ہی سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے شہر کے دُوردراز حصے سے گوشہ نشین ادیب میرے پُرسے کو چلا آیا تھا۔ وہ خاصی دیر میرے پاس بیٹھے دل بہلانے کی باتیں کرتے رہے۔ جب میں نے مقروض لہجے میں اس عنایت کی وجہ پوچھی تو بولے ''میں انسانوں کی جانچ رکھتا ہوں۔''

جب انھوں نے یہ جملہ بولا تو درویش شاعر میاں محمد بخش یاد آئے۔ جیہہ ویکھاں میں عملاں ولے تے کُجھ نئیں میرے پلے۔

بے شمار ملاقاتیں اور لاتعداد یادیں ہیں، ٹیلی فون پر گھنٹوں گفت گو اور ان گنت واقعات کے تذکرے۔

ایک روز فون پر گفت گو کے دوران انھیں اُداس پایا تو میں نے کراچی سے لاہور کا متعین سفر براستہ اسلام آباد کرنے کا پروگرام بنایا۔ ارادہ تھا کہ گھنٹوں گفت گو کریں گے، چناں چہ طے شدہ وقت کے مطابق کے گھر پر پہنچا اور ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ گھنٹی بجی۔ اندر ایک دیہاتی وضع کے صاحب ایک لشکارے مارتی کڑھی ہوئی کُرتی میں ملبوس بچے کی انگلی تھامے داخل ہوئے اور ہم سے گلے مل کر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا کہ الیاس صاحب کے میر پور کے پرانے واقف ہیں اور مدتوں بعد ملنے چلے آئے ہیں۔ الیاس صاحب نے اخلاق سے ان کی مدارت کی اور مجھ سے محوِ گفت گو ہو گئے۔ مجھے امید تھی کہ اپنے دخل در معقولات کو سمجھتے ہوئے وہ اجازت طلب کریں گے۔ میری اور الیاس صاحب کی گفت گو معاصر ادب سے ہوتی ہوئی معاشرتی

تبدل کا رخ کر گئی۔ وہ صاحب ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتے رہے جیسے کسی بڑے کے چہرے پر نادان بچوں کی گفت گو سن کر آ جاتی ہے۔ ابتدا میں وہ معاصر ادب کے تجزیے پر لقمہ دیتے رہے اور تھوڑی دیر بعد گفت گو میں پوری طرح کود پڑے۔ اب یہ عالم تھا کہ وہ کچھ ان جانا بول رہے تھے جو ہم دونوں کے فہم سے خاصے فاصلے پر تھا اور ہم عالمِ حیرت میں اُنھیں دیکھ اور سن رہے تھے۔ جب وہ تھک گئے تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ حضرت نے جانے کا قصد کیا ہے۔ اتنے میں جناب نے سادگی سے اپنی کھیڑی (دیسی جوتا) اتاری اور بیچ کو ہمارے درمیان بٹھا دیا۔ یہ دیکھ کر الیاس صاحب نے لمبی سانس بھری اور میرے کان میں سرگوشی کی "بیہہ جاچتی لاکے۔" میری ہنسی نکل گئی۔ تب مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ اُن کے افسانوں کے کردار کہاں سے آتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ہم دونوں چھٹی کے دن کہوٹہ سے آگے پہاڑیوں کے بیچ سرسبز ویرانوں میں واقع ایک گاؤں میں ایک شادی میں شرکت کو جا نکلے۔ تازہ ہوا اور دیہی ماحول میں الیاس صاحب کھل اُٹھے، گویا اپنے اصل میں لوٹ آئے ہوں۔ میں اُس شادی میں شرکت کے لیے کراچی سے راول پنڈی آیا تھا، وقت محدود تھا، سو الیاس صاحب سے شریکِ سفر ہونے کی درخواست کی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان خصلت اور گفت گو میں جیسا سفر میں کھل کر سامنے آتا ہے، عمومی نوعیت کی نشست میں نہیں آتا۔ اُس سفر میں دل کھول کر باتیں ہوئیں اور میں نے الیاس صاحب کو وسیع القلب، خوش گوار اور ہم درد رفیق پایا۔ وہ میر پور میں اپنے قیام کے قصے، وہاں کے کرداروں کی انوکھی عادات، پُرلطف تجربات اور چٹکلوں کے حوالے سے گفت گو کرتے رہے۔ بعد ازاں ایسی کئی ملاقاتیں ہوئیں جن میں انھوں نے مزاح سے بھرپور واقعات سنائے اور قہقہے لگائے۔ عمومی طور پر دکھوں کا بیان اور زندگی کی مشکلات کا تذکرہ اپنی جانب متوجہ کر کے وقتی ہم دردی سمیٹنے کا آسان طریقہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قابلِ قدر ہوتے ہیں وہ لوگ جو دوسروں کے لیے باعثِ مسرت اور ہم درد ثابت ہوتے ہیں، جن کے پاس بیٹھنے کی بار بار خواہش ہو، ان سے حالِ دل بیان اور مشورہ کرنے کو جی چاہے۔ الیاس صاحب ایسے ہی مُربی دوست ہیں۔ بہر حال اُس روز ہم کہوٹہ سے آگے ایک جگہ جا ٹھہرے، وہاں سے آگے گاؤں تک کوئی پکا رستہ نہ جاتا تھا۔ پیدل ایک نالا پار کر کے کھیتوں اور پہاڑی رستوں سے ہوتے ہوئے دوپہر کی شادی تک جا پہنچے۔ وہاں گھر کے باہر کرسیاں بچھی تھیں اور اندر سن ساٹھ ستر کی دہائی والی گوٹے اور سجاوٹ کی پلاسٹک کی اشیا والی آرائش تھی۔ صاحبِ خانہ بہت تپاک سے ملے۔ الیاس صاحب سب کچھ غور سے دیکھتے رہے، پھر میرے کان میں بولے "یہاں کی تزئین و آرائش دیکھ کر مجھے پرانے وقتوں میں خطۂ پوٹھوہار میں چلنے والی پرائیوٹ ٹیکسیاں اور لاریاں یاد آ گئی ہیں، جنھیں انواع و اقسام کی اشیا سے سجا کر انوکھا عجوبہ بنا دیا جاتا تھا۔" کمرے میں گھر کے حضرات کی بلیک اینڈ وائٹ تصاویر آویزاں تھیں جن کے صرف ہونٹوں پر سرخی تھی۔ وہ دن، وہ ماحول،

الیاس صاحب کا ساتھ اور یوں گردشِ وقت کا تھم جانا ایک مختلف تجربہ تھا۔ ہمارے میز بان اور ان کے اہلِ خانہ پرانے اور نئے دَور کی عجب آمیزش میں زندہ تھے۔ میز بانوں سے وابستہ ایک عجیب واقعہ ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ اُن کے ایک بزرگ طویل بیماری کے بعد فوت ہوگئے ۔ ہر طرف سوگ کا عالم تھا۔ ایسے میں جنازے کو یادگار بنانے کے لیے اس کی فلم بندی کا اہتمام کیا گیا۔ میّت کی گھر سے روانگی کو لمحہ بہ لمحہ کیمرے میں محفوظ کیا گیا۔ جب میّت کو جنازہ گاہ اور قبرستان روانہ کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو مرحوم بزرگ کی چار پائی کو کھلے ٹریکٹر ٹرالی پر رکھا گیا، ان کی بند آنکھوں پر سن گلاسز لگا دیے گئے اور کلوز اَپ میں فلم بنی شروع ہوگئی۔ آہستہ آہستہ کیمرا مرحوم بزرگوار کے سن گلاسز کو فوکس سے نکال کر بین کرتے رشتے داروں اور احباب کو کلوز اَپ میں لانے لگا۔ ٹریکٹر چلا، بین اور آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں اور دور پار کے قصبے سے ایک ٹرالی اپنے اوپر چار پائی اور چار پائی کے اوپر سن گلاسز لگائے میّت کو لیے ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر جھٹکے کھاتی روانہ ہوئی۔ ساتھ میں سوگوار اور چاک و چوبند کیمرا مین بھی تھا۔

محمد الیاس کی زندگی ایک دل چسپ کہانی کی مانند ہے۔

دریائے چناب کے ایک ملاح کی بیٹی سے شادی کرنے والے راجپوتانی سیال کی کڑی میں پیدا ہونے والا بچہ الیاس اپنے بچپن میں بزرگوں کو دیکھتا آیا کہ وہ اپنی ذات ''سیال'' فقط اس لیے چھپاتے تھے کہ ''ہیر رانجھا'' کا تذکرہ نہ چھڑ جائے اور ''بے غیرتی کے مرقع'' کا حوالہ اُن کے لیے شرمندگی کا باعث نہ بن جائے۔ تقسیمِ برصغیر کے وقت اڑھائی سالہ ننھے الیاس کو اُس دور کی بہت سی نشانیاں بعد میں اس طرح یاد رہیں کہ چند سننے والے دنگ رہ جاتے اور بیش تر اسے سنی سنائی باتوں کا شاخسانہ قرار دیتے۔ اُس کے دادا جی امام الدین، درحقیقت درویش اور اللہ لوک امام مسجد تھے جو سادگی کے اُس دور میں ایسے پارسا تھے کہ لوگ ان کے نام سے پہلے بسم اللہ پڑھتے۔ وہ ادھیڑ عمری میں موسمِ برسات کی ایک صبح فجر کی نماز پڑھا کر عالمِ بے خودی میں کسی ان جانی منزل کی جانب ایسے روانہ ہوئے کہ آج تک اُن کی یا اُن کی قبر کی کوئی خبر نہیں۔

برصغیر میں ایسے کئی درویش صفت ملنگ مزاج لوگ رہے جو کسی عرس پر، میلے پر یا ویسے ہی کسی ان جانی خواہش کے تحت دنیا تیاگ کر جوگی ہو گئے اور ایک معمہ بن گئے۔

میں ایک ایسے بالکے کو جانتا ہوں جو دیوانہ نہ تھا، فقط درویشوں کے ایک ٹولے کی عرس پر دھمال سے متاثر ہو کر اُن میں شامل ہوا اور جہاں گردی پر نکل گیا۔ اُس کے سب اہل و عیال انتقال کر گئے، بس ایک بوڑھی بہن ہے جو آج بھی اُس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اُس بوڑھی ماں کو کیسے بھول سکتا ہوں جو دیوانگی کی حدود میں قدم رکھ رہی تھی۔ بیٹے نے ٹرین میں سوار کرایا، دوسرا بیٹا منزل کے اسٹیشن پر ماں کا انتظار کرتا رہا۔ ٹرین آ گئی، ماں نہ آئی۔ وہ دونوں بیٹے آج بھی ماں کی زیرِ استعمال اشیا کو دل گیری سے چومتے ہیں اور آب دیدہ

ہو جاتے ہیں۔ ''اگر ہمیں پتا لگ جائے کہ ہماری ماں فوت ہوگئی تو دل کو قرار آ جائے۔ اُس کی گم شدگی کا معمہ مارے ڈالتا ہے۔''

ننھے الیاس کے والد نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر اپنا آبائی علاقہ گجرات چھوڑا اور ہارون آباد، بہاول نگر میں دکان ڈال لی۔ تقسیم کے وقت مسلمان جاں بازوں نے غیر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھائیوں کی دکانیں بھی لوٹ لیں۔ انھی دکانوں میں ایک والد کی دکان بھی تھی۔ نتیجتاً باپ نے بقیہ سامان ایک زمین دار کے پاس امانتاً رکھوایا، بیوی بچوں کو ننھیال میں چھوڑا اور فکر روزگار میں نکل پڑا۔

وقت طوفانی ہواؤں کے دوش پر تیرتے بادلوں کے گالوں کی طرح تیزی سے گزر گیا۔

والد کی واپسی ہوئی اور یہ خاندان اُس زمین دار کے ہاں کچھ عرصے کے لیے قیام پذیر ہوا۔ الیاس صاحب کی یادداشت میں تیس کنال کا گھر اور احاطہ، لکڑی کا پھاٹک، گیٹ اتنا بڑا جیسے ہاتھی گزارنے کے لیے بنایا گیا ہو، سردیوں کی گہری دُھند آلود شامیں اور قصباتی ماحول آج بھی پہلے روز کی طرح نقش ہیں۔ نقش تو اس گھرانے سے وابستہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ گھر کا مالک کیم شحیم سانولی رنگت کا سفید ریش بزرگ جس کے سر پر غیر معمولی بڑی پگڑی ہوا کرتی تھی اور وہ لوئی اوڑھتا تھا، احاطے کے بائیں جانب مویشیوں کے باڑے، شام کو خاصی تعداد میں مویشی جن میں گائے، بھینسیں، بیل اور اونٹ شامل تھے کا لوٹنا، برآمدے کے آگے چار دیواری کے ساتھ کیاریوں میں لگے پھول دار پودے، احاطے میں سایہ دار درختوں کی بہتات اور عقیقے کا وہ بکرا جو والد لایا تھا اور ننھے الیاس نے پہلی مرتبہ قربانی اپنی آنکھوں سے دیکھی، آج بھی اس طرح تازہ ہیں جیسے تازہ گیلا رنگ۔

نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہا، کبھی بہاول نگر سے جلال پور جٹاں تو کبھی جوہر آباد۔

شہر شہر کی ہجرت نے ننھے الیاس کو ہر قسم کی علاقائی تہذیب کے گوناگوں ہولی کے رنگوں سے مزین پنجاب کے دھرتی سے آشنا کر دیا۔ اس جہاں گردی نے اُس سے بچپن نہ چھینا بلکہ چار انوکھے ذائقوں سے آشنا کر دیا۔ تحریر و ادب کی دھنک رنگ غبار بھری خواب آلود دُنیا، انوکھے ست رنگے کرداروں کا جہانِ دل چسپ، روزگار کے متنوع پکوانوں کا خوش ذائقہ دسترخوان اور رومان و نسوانی نفسیات کے ادراک و مشاہدے کی اَن جانی کہکشاں۔

ابھی ننھا الیاس چوبارے پر چار پائیاں جوڑ کر گھر گھر کھیل رہا تھا، چولھا جلا کر جلیبیاں پکوڑے بنا رہا تھا اور مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہا تھا کہ اُسے جلال پور جٹاں کے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں لمبے دبلے خشخشی داڑھی والے سخت گیر بزرگ اُستاد ماسٹر رانجھا تھے۔ کھانے پینے کے اتنے شوقین کہ اسکول کے باہر خوانچہ فروشوں سے بچوں کی پسندیدہ اشیائے خورد و نوش منگوا کر میز پر دھر لیتے اور سبق کے دوران کھاتے

رہتے۔ چاول کے مرنڈے اُن کے پسندیدہ تھے۔ ننھے الیاس کی والدہ انھیں خوش کرنے کے لیے حلوہ بنا کر بھیجا کرتیں جو وہ پڑھانے کے دوران کھاتے رہتے۔ سالانہ امتحانات میں پاس ہونے والے بچے اپنے اساتذہ کے گلے میں ہار ڈالتے تھے۔ البتہ ماسٹر رانجھا کے رانجھے کو خوش رکھنے کے لیے اُن کو پھولوں کے بجائے چھوہارے، ناریل، خشک میوہ جات پروئے ہار ڈالے جاتے۔ وہ خوش ہو جاتے اور اگلے سبق کے دوران ہاروں میں سے آسان دست رس میں پا کر میوہ جات کھاتے رہتے۔ ننھے الیاس نے پہلی چند جماعتوں میں اوّل پوزیشن حاصل کی تو اس کی والدہ نے چھوہاروں کے ساتھ ایک روپے کا کرنسی نوٹ بھی پرو دیا جس پر ماسٹر صاحب اُن کی جوہر شناسی سے بہت متاثر ہوئے۔

تعلیم سے لگاؤ کے باعث بچے کو مطالعے کی ایسی لت پڑی کہ فٹ پاتھ پر بکنے والے قصّے کہانیاں، لوک داستانیں، جادو ٹونے (بنگال اور مصر کا جادو)، کیمیا گری، حکمت، جڑی بوٹیوں کے خواص، عمرو عیار، حاتم طائی، الف لیلیٰ کی کہانیاں، شیخ سعدی کی تصنیفات اور مختلف قسم کے شاستر تیرہ چودہ برس کی عمر تک چاٹ ڈالے۔ خط لکھنے کی استعداد اتنی بڑھی کہ دوسری جماعت ہی میں والد صاحب کو خط لکھا جس میں ''قبلہ وکعبہ والد صاحب دو جہان کے بادشاہ'' جیسے القابات استعمال کیے۔ اسی صلاحیت کی بنا پر نیم خواندہ اور ناخواندہ لوگ بچے سے اپنے خطوط پڑھوانے اور لکھوانے لگے۔ ذہن کی ہیئتِ ترکیبی کچھ ایسی رہی اور نئے الفاظ کے لیے ایسی قدرتی دل چسپی رہی کہ کوئی نیا لفظ سنتے ہی ذہن پر مرتسم ہو جاتا۔

ماسٹر رانجھا کے بعد زندگی کی پگڈنڈی پر کئی انوکھے کردار کھڑے ملے جن سے لامحدود انسانی نفسیاتی جہتوں کے مشاہدے کا موقع ملا۔

عملی زندگی میں معاشی خوش حالی اور کاروباری آسودگی کے بعد ایک بحران نے اپنی لپیٹ میں ایسا لیا کہ میرپور میں سرامکس اور ٹائلز کی ڈسٹری بیوشن ملنے کے بعد دفتر کے بجائے شوروم میں بیٹھنا پڑا۔ ٹائلز کے شوروم میں پیچھے کر کے میز لگوا رکھی تھی۔ وہاں ایک خادمِ خاص، عمر میں خاصا بڑا فوجی فتح محمد ان کا معاون ہوا۔ اُسے تکریم میں حوال دار صاحب کہنا شروع کر دیا۔ وہ سپاہی میرپور کا مقامی اور نہایت شریف اور ایمان دار تھا۔ اب اُسے شہر میں حوال دار کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ایک روز حوال دار کے قریبی رشتے دار اُسے ملنے آئے جن میں ایک سابق فوجی بھی تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ فوجی عزیز کو حوال دار کہا جا رہا ہے تو اُس نے الیاس صاحب کو علیحدگی میں متنبہ کیا کہ غلط رینک بتانا جرم ہے جس پر سزا ہو جایا کرتی ہے۔ اس پر الیاس صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ انھوں نے اُسے اپنے ادارے میں ترقی دے کر سپاہی سے حوال دار کر دیا ہے چناں چہ اُس کی تنزلی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ عزیز چاہے تو فوج میں شکایت کر دے۔ وہ لاجواب ہو گیا مگر الیاس صاحب پر ''شریکے'' (قریبی اعزا کا حسد آمیز جذبۂ مسابقت) کا ایک اور دَر وا کر گیا۔

بعد ازاں فتح محمد نے پندرہ برس بعد الیاس صاحب کے ہاں سے تب ملازمت چھوڑی جب اُس کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔

میر پور میں قریباً ہر نوجوان کے خواب کی منزل انگلینڈ ہوتی تھی۔ ایک روز الیاس صاحب نے دیکھا کہ اُن کے شوروم کے باہر سے دیہاتی وضع کا ایک نوجوان اندر جھانکتا ہوا تین چار مرتبہ گزرا۔ جب وہ چوتھی بار گزرا تو ہاتھ اُٹھا کر بولا ''اندر آ سکناں؟ (اندر آ سکتا ہوں؟)'' الیاس صاحب اُس کی سادگی پر ہنس پڑے کہ یہ کون سی عدالت ہے جس میں آنے کے لیے اجازت چاہیے۔ اُسے بلا لیا۔ اُس نے مقامی زبان میں عاجزی سے اپنی بپتا سنائی۔ وہ گاؤں سے آیا تھا، اَن پڑھ تھا، اور اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا جو پچھلے بیس برس سے برطانیہ میں آباد تھے۔ ماموں ان کے خطوط کا جواب نہ دیتا تھا۔ چناں چہ الیاس صاحب نے ایک جذباتی خط لکھا جس میں لکھا کہ اگر ماموں کا ارادہ شادی نہ کرنے کا ہو تب بھی خون کا تعلق ختم نہیں ہونا چاہیے، پس وہ اپنے ارادے کی اطلاع کر دے۔ اُس دیہاتی کی ماں اور ممانی کے نام کیھڑو بی بی اور سر دہ بیگم ایسے منفرد تھے۔ خط ایروگرام میں بند کر کے اِسے اہتمام کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔

تین چار ماہ بعد وہی جوان، برائے فروخت مال کی طرح سجا سجایا شوروم میں داخل ہوا۔ اُس نے ہاتھوں میں مہندی لگا رکھی تھی اور دانت مسوڑھوں سمیت نمایاں ہو رہے تھے۔ اُس کے دیہاتی ماں باپ باہر کھڑے اشتیاق سے اندر دیکھ رہے تھے اور ہنسے جا رہے تھے۔ اُس ایروگرام نے معجزاتی اثر دکھایا تھا۔

اس موقع پر میر پور کے ایک متمول خاندان کے اکلوتے پڑھے لکھے بیٹے کا تذکرہ برمحل ہے جو اسلام آباد کا تعلیم یافتہ تھا اور برطانوی شہریت کی حامل لڑکی سے شادی کا خواہش مند۔ چناں چہ ان لوگوں نے برطانیہ کے ایک کھاتے پیتے پاکستانی گھرانے سے رشتہ طے کر لیا اور شادی پاکستان میں انجام پائی۔ واپسی پر دلہا دلھن اکٹھے واپس گئے۔ مانچسٹر ایرپورٹ پر اُترتے ہی دُلھن نے دلھے سے کہا۔ ''تجھے انگلینڈ آنے کا شوق تھا، تو آ گیا۔ اب اگر میرا شوہر بن کر اپنے حقوق حاصل کرنے یا پابندیاں لگانے کی کوشش کی تو ایسا سبق سکھاؤں گی کہ عمر بھر یاد کرو گے۔'' ایسے بہت سے خاندانوں کا الیاس صاحب نے مشاہدہ کیا جن کے لڑکے کی اوقات ولایت میں جانوَر سے بھی بدتر ہوئی۔

دوسری جانب ایسا بھی ہوا کہ پولیس کے ایک حوالدار کی بیٹی کی شادی برطانیہ میں مقیم برادری کے ایک شریف خاندان میں ہوئی۔ لڑکی کو وہاں کی قومیت ملی تو اُس نے اپنے ہم عمر شوہر سے طلاق لے کر باپ کی عمر کے امیر کبیر شخص سے شادی کی، جائداد اپنے نام کروائی، ایک ایک کر کے سب بہنوں کی بہترین شادیاں کیں، اکلوتے بھائی کو انگلینڈ بلا کر اعلیٰ تعلیم دلوائی اور بالآخر ماں باپ کو بھی وہیں بلوا لیا۔

واقعاتی ترتیب پیچھے کی جانب سرکتی ہے۔

نویں جماعت تک طالب علم محمد الیاس کی جماعت میں پہلی پوزیشن آتی رہی۔ اس دوران اسکول بھی بدل گیا۔ امریکی امداد سے وسیع عریض رقبے پر تعمیر کردہ عالی شان اور پر شکوہ عمارت والے گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر برطانیہ پلٹ تھے۔ وہ داڑھی کے بغیر کٹر مولوی تھے جو ڈنڈے کے زور پر نماز پڑھاتے تھے۔ خاصے عمر رسیدہ تھے مگر لڑکوں کو سمجھا رکھا تھا کہ کوئی انھیں چچا نہ کہے، کیوں کہ یہ غیر شرعی فعل ہے۔ مسلمان ہونے کے ناتے سب بھائی بھائی ہیں، اسی لیے انھیں بھائی جان کہا جائے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اچھی بھلی ورسٹڈ کی پتلون کے عین ہپ والے مقام پر آٹھ انچ مربع کا پیوند لگا کر ہاتھ میں بید لیے دندناتے پھرتے اور پیوند کے حوالے سے فخریہ اعلان کرتے کہ یہ سنتِ رسولؐ کا عملی مظاہرہ ہے۔ حالاں کہ اُن کے پاس دیگر عمدہ ولایتی سوٹ تھے مگر اُن کے جذبۂ ایمانی نے اُن میں بھی پیوند لگا رکھے تھے۔ درحقیقت غبارے کی طرح پھولے جسم پر ٹانکا گیا پیوند بہت بدنما دکھتا تھا چوں کہ یہ شوقیہ لگایا گیا تھا نہ کہ ضرورت کے تحت۔ حقیقی کردارِ نبویؐ کا تقاضا تو ایسے عمل بالضرورت، تقویٰ اور شایستگی کا تھا۔

لوگوں کے باہمی تعلقات میں فرقہ واریت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ البتہ گنتی کے چند لوگ ڈھکے چھپے انداز میں دوسرے فرقے کے بارے میں ناگفتنی کہہ جاتے۔ الیاس کے والد کے ایک دوست یو پی کے مہاجر تھے جو عام گفت گو میں ''برخوردار''، ''میاں صاحب زادے'' اور ''میرے عزیز'' جیسے الفاظ بکثرت استعمال کرتے۔ الیاس ان کی گفت گو سننے کا بہت شائق تھا، چناں چہ قریب میں بیٹھ کر اپنی پیٹھ اُن کی جانب کر کے بہ ظاہر کسی کام میں مصروف ہو جاتا، درحقیقت اس کے کان اُن کی گفت گو کی جانب لگے ہوتے۔ چناں چہ ایک مرتبہ بزرگوار نے ایک چھوٹے سے فرقے کے حوالے سے ہوش رُبا انکشافات کیے جن میں مردے کے اعضا کی مخصوص انداز میں صفائی، چاول اُبال کر اُن کے وسیع ڈھیر کے بیچ اغوا شدہ بچے کو پکا کر تبرکاً کھانا اور دیگر رونگٹے کھڑے کر دینے والی رسوم شامل تھیں۔ تجسس سے مجبور ہو کر الیاس نے اُس اقلیتی گروہ میں دوستی پیدا کی، اُن کی محافل میں شریک ہوا اور اُن میں کھانا پکاتے وقت تشویش آمیز اشتیاق سے بچے کا انتظار کیا جسے پکایا جانا تھا، حتیٰ کہ اُن کے مردے کے غسل میں بھی شریک ہوا۔ وائے حسرت ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اس تجربے نے الیاس کے ذہن میں مل جل کر رہنے والے مختلف فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کی باہمی غلط فہمیوں کو نہ صرف عیاں کر دیا بلکہ ان میں دروغ گوئی کے عنصر کو بھی نمایاں کر دیا۔

بعد کی زندگی میں توہمات کے حوالے سے عملی تجربہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ یہ بات معروف تھی کہ رات کو درخت کے نیچے یا آسیب زدہ جگہ پر پیشاب کرنے والے کی پکڑ ہوتی ہے چناں چہ الیاس نے خود جا جا کر ایسی جگہوں پر پیشاب کرنے کا عملی تجربہ کیا اور پکڑ میں آنے کا منتظر رہا لیکن مایوس لوٹا۔

اسی دوران محمد الیاس کو افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا، کچھ عرصہ رہا اور طویل مدت کے لیے ختم

ہو گیا۔اس کی تحریک اپنے مالک مکان چودھری یعقوب کی وجہ سے ہوئی جن کے ہاں شمع کراچی، شمع لاہور اور ڈائرکٹر جیسے فلمی رسالے آتے تھے۔ پریم چند کے افسانے کفن نے ہائی اسکول کے طالب علم کو بہت متاثر کیا۔ بہت سے افسانوں پر رائے دیتے ہوئے یہ چودھری یعقوب کو کہہ بیٹھا "ان سے بہتر افسانہ تو میں خود لکھ لوں۔"اِس پر چودھری یعقوب نے بہترین افسانے کا بنیادی کلیہ بیان کیا"اچھے افسانے کی تعریف ہی یہی ہے کہ قاری اسے پڑھ کر کہے کہ وہ خود بھی ایسا لکھ سکتا ہے لیکن لکھنے بیٹھے تو لکھ نہ پائے۔"

لکھنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر محمد الیاس نے "بڑا باپ" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا اور "ڈائرکٹر" کو بھیج دیا۔وہاں افسانہ چھپ گیا جس کی اس لڑکے کو بے اندازہ خوشی ہوئی۔ایک دو اور افسانے "شمع" کراچی میں شائع ہو گئے۔اب اس نے اپنے آپ کو ادیبوں کی صف میں تصور کر لیا۔

اُن دنوں حبیب جالبؔ کی نظم "دستور" کا بہت چرچا تھا۔انھوں نے یہ نظم مری کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی اور اُسے لوٹ لیا تھا۔سامعین ہر مصرع کے اختتام پر آواز سے آواز ملا کر کہتے۔"میں نہیں مانتا" اور اتنا جوش وخروش پیدا ہوا کہ مجمع اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

محمد الیاس کے ایک دوست مقامی شاعر مظفر حسن لاہور جا رہے تھے۔وہاں انھیں حبیب جالبؔ سے ملنا تھا۔لاہور میں یہ پاک ٹی ہاؤس پہنچے تو وہاں ابھی حبیب جالبؔ نہیں آئے تھے چناں چہ یہ مال روڈ پر واقع "ڈائرکٹر" کے دفتر چلے گئے۔بہت بڑی میز کے پار تھری پیس براؤن سوٹ پہنے، سر پر میچنگ فیلٹ ہیٹ رکھے سانولی رنگت کا کلین شیوڈ ادھیڑ عمر شخص بیٹھا نظر آیا۔ڈیل ڈول متناسب تھا۔دیکھنے سے یوں گمان ہوتا تھا گویا "بنکاک کے شعلے" جیسی فلم کا کردار ہو۔وہ ایڈیٹر فضل حق تھے۔محمد الیاس سے وہ بہت تپاک سے ملے اور پائپ بھر کر کثیف دھویں کے بادل اُگل کر قہقہے لگاتے ہوئے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔

واپسی پر پاک ٹی۔ہاؤس میں بائیں دیوار کے ساتھ کونے میں لگی میز پر حبیب جالبؔ اور مظفر حسن آمنے سامنے بیٹھے تھے۔حبیب جالبؔ سے تعارف ہوا تو وہ بہت تپاک سے ملے۔ان کی ہیئت دیکھ کر الیاس کو دکھ ہوا۔شیو بڑھی ہوئی تھی، سر کے گرد جھالر نُما بالوں کے گچھے بے ترتیبی میں اُفقی سمت کھڑے تھے، ملگجا میلا کُرتا پاجامہ پہن رکھا تھا، میز سے نکلی داہنی ٹانگ پر سلوٹیں پڑنے سے پاجامہ سپرنگ بنا ٹخنے سے اوپر اُٹھ گیا تھا۔

اس سے پہلے معروف و یکتا پینٹر معظم کی حالت بھی محمد الیاس نے دیکھ رکھی تھی۔استاد معظم ایک ماہر فن تھا مگر روزگار کے لیے سنیما بورڈ پینٹ کرتا تھا۔پانچ فٹ دو انچ کا دُبلا اور نحیف و نزار فن کار زیادہ تر سیاہ یا براؤن پتلون اور سفید قمیص پہنے، پان چبار ہا ہوتا اور سگریٹ سلگا رکھا ہوتا۔اُس قدرتی مصور کا دایاں ہاتھ کمال چابک دستی سے بڑے بڑے ہورڈنگز پر تصویریں بنا کر اُن میں زندگی پھونکتا چلا جاتا۔دس فٹ کی

بوسیدہ کوٹھڑی میں چار پائی ڈالے وہ نابغہ مصور کچے رنگوں کی بند کھلی پیکلنگز اور لتھڑے برتن اور برشوں کے بیچ بے چارگی کی تصویر بنا لیٹا ہوتا۔ پورے دن میں دیسی کا آدھا پوا، بڑے گوشت کے تکے کبابوں کی ایک پلیٹ، چائے اور سگریٹ پر اُس کا گزارا تھا۔

اِن دو مثالوں سے الیاس نے ابتدائے جوانی میں ایک سبق سیکھ لیا کہ وہ تنور جہاں دو آنے کی روٹی اور مفت دال ملا کرتی تھی اور مزدور مشقت کر کے کیڑے مکوڑوں کی طرح جمگھٹا لگائے ہوتے تھے، وہاں فن کارداد و تحسین کے ڈونگروں کے عوض ایک وقت کا کھانا خریدنے کے متحمل بھی نہ تھے۔

کئی دہائی بعد کی بات ہے کہ یہی حقیقت محمد الیاس صاحب کی بیگم تزئین تاباں صاحبہ نے ان الفاظ میں دہرائی ''ایک بیوی کو شوہر کی نظم کی بہ نسبت اُس کے ہاتھوں میں بچوں کے جوتے اور کپڑے کہیں زیادہ خوشی دیتے ہیں۔''

چناں چہ ابتدائی خاندانی معاشی مشکلات کی بِنا پر ترکِ تعلیم کر کے جب محمد الیاس کو عملی زندگی میں قدم رکھنا پڑا تو اس نوجوان کی کاروباری حس تیز اور عزم پختہ تھا۔ اپنے والد کو سول لائنز کی مین روڈ پر پیدل گھر آتے دیکھ کر، جب ایک خالی تانگا اُن کے قریب سے گزر گیا تھا، نے محمد الیاس کو کام کر کے والد کی مشکلات میں کمی کرنے پر آمادہ کیا۔

چناں چہ میونسپل کمیٹی میں چنگی محرر کے لیے بھرتی میں شامل ہوا، ملتان میں پی ڈبلیوڈی میں ورکس سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ نقشہ نویسی کی عارضی نوکری کی، اے جی پی آر میں ملازمت کی، کراچی میں ہیوی ڈیوٹی والو اور پارٹس سپلائی کرنے والی نجی کمپنی میں بہی کھاتوں اور دیگر معاملات کی نگرانی کی، اے جی پی آر میں دوبارہ ملازمت کی، معدنیات کی سپلائی کا ذاتی کاروبار شروع کیا، ماربل چپس کی ایکسپورٹ کی، سوپ سٹون کا کاروبار کیا، اپنی فیکٹری لگالی اور وسیع پیمانے پر گرائنڈنگ میٹریل کی سپلائی کا کاروبار آزاد کشمیر سے اس طرح کام یابی سے چلایا کہ آزاد کشمیر چیمبر آف کامرس کی ایگزیکٹو باڈی کا ممبر چنے جانے کے بعد ڈاکٹر محبوب الحق کے ساتھ میٹنگز میں شرکت کے لیے نمایندگی دی جانے لگی۔

اسی دوران دو ہوش رُبا واقعات ہوئے۔

معدنیات کی تلاش و ترسیل کے لیے دشوار گزار علاقوں میں جانا پڑتا۔ چناں چہ محمد الیاس صاحب کی شہرت ایک کام یاب اور رئیس کاروباری کی اس طرح پھیلی کہ قبائلیوں نے انھیں اغوا کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ معدنیات کی دست یابی کے اشتہارات شائع ہوئے تو دس پندرہ قبائلی پٹھان ان کے دفتر میں گھس آئے اور انھیں جمرود میں عمدہ معدنیات دکھانے کا لالچ دیا۔ چھٹی حس نے انھیں خبردار کیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے دوست اور کولیگ دفتر میں ساتھ بیٹھے تھے، چناں چہ انھیں ٹال دیا گیا اور وہ مایوس واپس چلے

گئے۔الیاس صاحب اس کے بعد بہت محتاط ہو گئے۔

اسی طرح پنجاب میں واقع ایک فاؤنڈری میں معدنی ڈولومائیٹ سپلائی کرنے کا ٹھیکا ملا۔وہ فاؤنڈری ابھی تازہ تازہ مالکان کو نیشنلائزیشن کے بعد واپس ملی تھی اور وہاں ایشیا کا سب سے بڑا فرنس لگایا گیا تھا۔ایک مرتبہ الیاس صاحب وہاں flux کے طور پر استعمال ہونے والے ڈولومائیٹ کے ٹرک لے کر گئے،گیٹ پاس جاری ہو گئے لیکن اکاؤنٹس میں اس کا اندراج نہ ہوا تھا چناں چہ اس کی اطلاع عمر رسیدہ مالکان میں سے ایک کو دی گئی تو اُس نے اکاؤنٹنٹ کو بلالیا۔اکاؤنٹنٹ نے پاس دیکھ کر ان کی تصدیق کی اور اجازت چاہی کہ اگر کتابوں میں اندراج کے دوران کہیں صرف نظر ہو گیا ہے تو وہ اسے دوبارہ دیکھ لیتا ہے۔ اتفاقاً اُس وقت وہ مالک وہاں کام کی نگرانی کر رہا تھا جو بقیہ بامروّت بھائیوں کے برعکس بدزبان تھا اور بدمعاشوں کے ذریعے ڈسپلن بحال رکھنے پر یقین رکھتا تھا۔چناں چہ اُس نے ادھیڑ عمر معزز اکاؤنٹنٹ کے ساتھ وہ گالم گلوچ کیا کہ الیاس صاحب کا سر شرم سے جھک گیا۔اُس روز کے بعد الیاس صاحب نے کاروباری ترقی کے مواقع موجود ہونے کے باوجود اُس فاؤنڈری کا رُخ نہ کیا۔

معمولی ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کر کے فیکٹری لگانے والے خود ساز انسان کو جہاں ایسے عمدہ لوگ ملے جنھوں نے بُرے معاشی حالات میں سہارا دیا وہیں ایسے لوگ بھی کم نہ تھے جن سے دھوکا کھایا۔ افسوس تو یہ ہے کہ زیادہ سہارا ان سے ملا جن سے توقع نہ تھی اور فریب ان سے جن پر اعتبار کیا۔یقیناً انسان زیادہ تر دھوکا اُسی سے کھاتا ہے جس پر اعتماد کرتا ہے۔

روزگار کے ان سلسلوں نے کشمیر کے سرسبز پہاڑی غالیچوں،پوٹھوہار کی سرخ گنجی پہاڑیوں،گجرات کے دھول اُڑاتے قصبات سے لے کر کراچی کی ہوا پر تیرتی سرمئی شاموں تک کا سفر کرایا۔بھانت بھانت کے تاجر ملے اور خواتین سے بھی واسطہ پڑا۔ایسا ہی واسطہ جیسا چاند کو سمندر سے ہوتا ہے،چاند چودھویں کو مدوجزر پیدا کرتا ہے لیکن فاصلے پر رہ کر۔ان قطعی افلاطونی تعلقات نے انسانی جذبات سے متصادم مصنوعی اقدار پر چلنے والے حساس انسان کو اعتراف کرنے پر آمادہ کیا۔"میں کافی حد تک اپنا دامن بچا کر نکلنے میں کام یاب رہا لیکن ستم شعار مجاہدے اور کڑی مشق سے گزرنے کے باعث میری شخصیت مکمل نہ ہو پائی۔"

اسی لیے نسوانی مزاج زیادہ تر مشاہدے میں آیا اور بہت کم تجربے میں۔وادئ سون کی تراشیدہ بدن والی سرخ وسپید لڑکی جسے سرتاپا سفید لباس میں دیکھ کر آسمانی حور کا تصور اجاگر ہوتا،اپنی حسین اور قدرتی خمار بھری آنکھوں سے تکا کرتی،چند ایک لڑکپن کی جذباتی محبتیں جن میں خون سے خط لکھے جاتے یا میلی کچیلی بھک منگی،حیاسوز اخلاق کی مالک چنگڑیاں جنھوں نے اِس خیال کو تقویت دی کہ عورت لباس ہی میں بھلی لگتی ہے۔اِس کے سوا جو کچھ ہے یا تو عائلی زندگی میں ہے یا مشاہدے میں۔

شرفا میں ایک وصف بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے کہ وہ شریر اور رومانی ایڈونچر کے شائق لوگوں کی جانب جلد مائل ہوجاتے ہیں تاکہ اپنے مزاج کے اس تشنہ پہلو کی تشفی کرسکیں۔

چناں چہ الیاس صاحب کو ایک کولیگ اور دوست جسے 'شکاری' کہا جاتا تھا، اور چند دوسرے دفتری ساتھیوں کے ساتھ ایک مکان میں اکٹھے رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں الیاس صاحب کو 'مولوی' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ شکاری کی زندگی کا اوّلین مقصد آسان دست رس میں آجانے والی خواتین سے راہ ورسم بڑھانا تھا۔ وہ اپنے ہدف کے بارے میں کم وبیش درست اندازہ کرلیتا تھا۔ ایک بیش قیمت وصف اور بھی تھا جو قرونِ اولیٰ کے قاضیوں میں پایا جاتا تھا، سبھی کو برابر بلا امتیاز جانتا، رنگ ونسل، امارت وغربت، عمر اور دیگر عوامل کو قطعی خاطر میں نہ لاتا۔ سبھی کو ایک نظر سے دیکھتا اور رجوع کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ چند ایک بار نشانہ خطا بھی ہوجاتا، چناں چہ پٹیوں میں لپٹا ٹوٹی ہڈیوں اور سوجے جسم کے ساتھ کسی اسپتال میں بغرضِ علاج پایا جاتا۔ اونچے مقاصد کی راہ میں آنے والی معمولی رکاوٹوں کو وہ قدرت کا امتحان جانتا اور پھر سے اپنے عزائم کے حصول کے لیے نئے حوصلے سے رواں ہوجاتا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ دفتر کے راستے میں ریلوے لائن کے پار اور سول لائز کے بیچ وسیع رقبے پر فصل کاشت ہوتی جس کے بیچ میں چند فٹ رستہ پیدل چلنے والوں کے لیے چھوڑا گیا تھا۔ وہیں شکاری کا سامنا سفید یونی فارم پہنے ایک دائی سے ہوجاتا تھا۔ ایک روز اُس نے دائی کا راستہ کچھ ایسے روکا کہ اُس کی ہنسی نکل گئی۔ چناں چہ بات آگے بڑھ گئی۔ پہلی ملاقات کے بعد وہ واپس ہوا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو شکاری نے بتایا کہ دائی کا تکیہ کلام ''بسم اللہ'' تھا۔ چناں چہ ہر جنبش پر بے اختیار بول دیتی ''بسم اللہ۔'' اس تکیۂ کلام سے اُٹھتا غبار بارش سے بیٹھتی دھول کی طرح بیٹھ جاتا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ اُس کا کیا جاتا تھا تو سنجیدگی سے بولا ''گناہ گار ضرور ہوں، کافر نہیں۔''

نوجوان الیاس کے لڑکپن کا واقعہ ہے کہ اس کے ہم سائے میں ایک انتہائی حسین لڑکی رہتی تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ الیاس سوچا کرتا کہ لڑکی کو اتنا بھی حسین نہیں ہونا چاہیے۔ اس گھرانے سے ان کے اہلِ خانہ کے گھریلو مراسم تھے۔ چناں چہ ایک دوسرے کی جانب آنا جانا لگا رہتا۔ الیاس اور اُس لڑکی کی معصوم دوستی تھی۔ لڑکی کی پھوپھی الیاس کو اکثر اپنے گھر بلا کر یہ کہہ کر اندر کمرے میں لڑکی کے ساتھ بھیج دیتی ''تم لوگ گپ شپ کرلو'' اور تنہا چھوڑ دیتی۔ اُس کی خواہش اپنی بھتیجی کو خراب کرنے کی تھی تاکہ اپنی بھابھی سے کوئی ان جانا انتقام لے سکے مگر ان کی دوستی پہاڑی چشمے کے بہتے پانی کی طرح پاک رہی۔

وقار کے منافی تو بہت سے مردوں کے اطوار بھی ہوتے۔ پنڈی میں ملازمت کے دوران ویسٹرج میں کراچی کے ایک بزرگ کولیگ کے ہم راہ ایک قیام گاہ میں اکٹھے رہنے کا اتفاق ہوا۔ الیاس صاحب

جوان آدمی تھے۔ وہاں ایک چلبلی شرارتی لڑکی نے ان کی طرف التفات کی۔ یہ حسبِ فطرت اُس سے کنی کترانے لگے۔ اُس نے ''توجہ دلاؤ نوٹس'' بھیجنے شروع کر دیئے۔ ایک روز آدھ درجن جوان بچوں کے والد، سینئر کولیگ نے جذبات سے مغلوب آواز میں لجاجت سے درخواست کی ''ارے پرنس! ہم پر ایک احسان کر دو۔ وہ لونڈیا سالی آپ کے ساتھ بالکل بھی نہیں جچتی۔ ہم ہیں کہ بستر پر اکیلے پڑے ساری رات لوٹیں لگا دیں، نیند نہ آوے۔ اُسے ہم سے ملا دو۔''

ملتان میں ملازمت کے دوران الیاس صاحب نے عورت کا وہ روپ بھی دیکھا جو اس مردانہ برتری والے معاشرے کی بیش تر محروم و مجبور عورتوں کا ہوتا ہے۔ کوچوان، راج مزدور، منیاری کے دکان دار اپنی عورتوں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرتے کہ انھیں گرمیوں میں ایک چھوٹے سے کمرے تک محدود کر دیتے جہاں وہ کھانا پکاتیں، سوتیں، یہاں تک کہ قضائے حاجت کرتیں۔ شاموں کو ایسی کوٹھڑیوں سے عورتوں کی کراہوں اور سسکیوں کی آوازیں آیا کرتیں جب اُن کے شوہر اُنھیں پیٹا کرتے اور وہ بے بسی سے مار کھاتے کھاتے بوڑھی ہو کر اندھی قبروں کی خوراک بن جاتیں۔

بد دماغ اور لالچی دامادوں کے ہاتھوں سسرال کو بے بس ولا چار دیکھا۔ ادھر دامادوں کی فرمائشیں ختم نہ ہوتیں، اُدھر سالے اور سُسر دن رات محنت سے کمائی گئی روزی ان کے قدموں میں ڈال ڈال کر ختم ہو جاتے۔

ختم تو بہت سالوں بعد محمد الیاس نامی باپ بھی ہو گیا تھا جب وقت نے ایک لمبی زقند بھری اور اُس کے لختِ جگر نے مندتی معصوم آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھا تھا، ننھے سے دہن سے خون تھوکا تھا اور خاموش ہو گیا تھا، پھر دوبارہ کہیں اور جا گنے کے لیے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے شاید یہ راز پا لیا تھا جو وہ پکار اُٹھا تھا ''موت روشنی کے مکمل خاتمے کا نام نہیں، یہ چراغِ حیات کو گُل کر دینا ہے کیوں کہ صبح طلوع ہو رہی ہوتی ہے۔''

شاعرِ عالم، فقیرِ ہند اقبال محرمِ راز تھا جو کہہ گیا ؎ موت کو سمجھا ہے غافل، اختتامِ زندگی، ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی۔

لاکھ توجیہات سہی، دلِ ناپرساں کو ایسے اندوہ میں کوئی راز کوئی حقیقت اطمینان نہیں دیتی ماسوائے خونِ دل کے چشم کے رستے پھوٹنے، قلم کے رستے بہہ نکلنے، اظہار کے لامحدود ذرائع اختیار کرنے کے۔

محمد الیاس نے قلم تھاما اور اسے کاغذ پہ پھر سے پابۂ رقص کر دیا، یہ رقص ایک دہقان، ایک پینڈو، میلے میں ناچتے آدمی کا رقص تھا۔ جو بھی تھا رقص بے خودی تھا، جنوں میں تھا یا شاید رقصِ بسمل تھا۔

ایک روز مجھے بتانے لگے ''میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا جب مجھ سے چھوٹا بھائی طویل علالت کے بعد چار سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ مرنے سے دو روز پہلے میں نے دیکھا کہ وہ بستر پر پڑا میری رنگین

پنسلوں سے کھیل رہا تھا۔ میں نے پنسلیں چھین لیں اور وہ روتا رہا۔ اُس کی موت کے بعد ایک ہی خواب معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دیکھا کہ میں اُس کو ساری پنسلیں، ایک ساتھ مٹھی میں لیے، دے رہا ہوں مگر وہ نہیں لے رہا۔ بیٹے کی موت کے بعد میرا کاروبار سے بھی دل اُچاٹ ہو گیا۔ میرے ملازم میرا سامان آہستہ آہستہ چرا رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ میں بے خبر ہوں۔ ایسا نہیں تھا۔ مجھے سب خبر تھی۔ میں نیم خوابیدہ ذہن اور تھکی تھکی نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہوئی۔ بیٹا آخری غسل کے بعد جس طرح چار پائی پر پڑا تھا، اُس کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے، وہ سب جاگتی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔"

سناتے سناتے چونک گئے اور بولے۔

"بیٹے کی موت کے بعد بھائی والے خواب آنے بند ہو گئے۔ رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ غم میں بھی نشہ ہوتا ہے۔ ہلکا ہلکا درد عجیب طرح کا سرور دینے لگتا ہے۔"

سچ بات تھی۔ حق بات تھی۔ جن لوگوں کو غم کا نشہ ہو جائے وہ غم کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جس طرح بعض نشئی بچھو کے ڈنک سے نشہ حاصل کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ غم سے ڈسواتے ہیں اور دھیما سکون حاصل کرتے ہیں، خوشی میں غم گین ہو جاتے ہیں اور اچھی خبر کے بطن سے آفت کی پیدائش کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

محمد الیاس ان سے مختلف تھا۔ اُس کی راکھ سے جس ققنس نے جنم لیا تھا وہ غم کی ٹوپی سے طنز و مزاح کے خرگوش برآمد کرتا تھا۔ ساری عمر خودکشی کا سوچنے والا ادیب قلم سے لفظوں کو لچکتی مٹکتی زندگی دیتا تھا۔ محمد الیاس ققنس، محمد الیاس وسیلہ، محمد الیاس کوزہ گر۔

محمد الیاس کے افسانے ایک دیہاتی کے افسانے ہیں جس کے ناخنوں میں مہندی کے نشانات آنکھوں میں سرمہ ہے، کُرتے پر عطر کے داغ ہیں اور بالوں سے سرسوں کے تیل کی خوشبو آتی ہے۔ محمد الیاس کے افسانے ایک صوفی درویش کے افسانے ہیں جس نے کلائیوں میں چاندی کے کڑے پہن رکھے ہیں، گلے میں رنگین پتھروں، موتیوں کی مالا ہے، ہونٹوں پر ہلکا تبسم ہے اور باتوں میں ولائت کی مہک ہے۔ محمد الیاس کے افسانے کامیاب تاجر کے افسانے ہیں جو پجارو، پراڈو میں سفر کرتا ہے، عمدہ ولایتی مشروب پیتا ہے اور اعلیٰ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے سنگِ مرمر، ٹائلوں سے مزین اور جھومر کی طرح لٹکتے فانوسوں والے بنگلوں میں رہائش رکھتا ہے۔ محمد الیاس کے افسانے ایک عورت کے لکھے افسانے ہیں جو اُن کے اندر کہیں چھپی بیٹھی ہے اور رومان کی دھیمی لو پر بخور کی طرح دھواں دھواں مہک دیتی ہے، لاڈلے بیٹے کی باوقار ماں ہے، ظالم کو چوان کی نحیف و مظلوم بیوی ہے، مردوں کی ہوس ناک نظروں کا سامنا کرنے والی باکردار ملازمہ ہے۔ محمد الیاس کے افسانے لوگوں کا بول و براز اٹھانے، ہر جھڑکی پر ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے

گڑگڑانے، بوسیدہ پھٹے کپڑے، باسی سالن، خراب ہوئے ادھ کھائے خربوزے، آم، آلو بخارے اور دیگر پھل وصول کر کے شکر گزار ہونے والے چوہڑے اور بھنگی کے افسانے ہیں۔ محمد الیاس کے افسانے داڑھی پر کنگھا کرتے، مہندی رنگ بالوں پر پاک ستھرے کپڑے کا عمامہ پہنے، گھن گرج سے چمکتے قصبے کے امام کے قصے ہیں، یہ ایک ہاتھ سے چھڑی اور دوسرے سے پتلون سنبھالتے فربہ، سرخ چمکتی آنکھوں والے پولیس اہل کار کی خوشہ چینیاں ہیں اور 'بڈاوے' یا دیگر جان وروں اونٹ، کتا، گدھا، مرغے وغیرہ کی وہ باتیں ہیں جو یا تو محمد الیاس سمجھتا ہے یا پھر کوئی اور ایسا جو تمام مخلوقِ خدا کو ایک اکائی سمجھتا ہو۔

دانش کدہ ہندوستان کی ایک قدیم کہاوت ہے۔ ''چند چیزیں آنکھ کو بھاتی ہیں، اُن چیزوں کو پانے کی جستجو کرو جو دل چھولیں۔''

گوئٹے کہتا ہے ''وہ شخص جو ایک خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے، اُس کے استعمال ہی میں حقیقی مسرت پاتا ہے۔'' ولادیمیر نبوکوف نے سرگوشی کی ''ہم صرف خیالات کی دنیا میں زندہ نہیں بلکہ اشیا کے بیچ زندگی بسر کرتے ہیں، وہ الفاظ جو تجربے اور مشاہدے کے بطن سے جنم نہیں لیتے، مردہ الفاظ ہوتے ہیں۔''
ایسے میں ایڈگر ایلن پوجیسا سحر طراز کہاں پیچھے رہنے والا تھا، افسانے کا ایک کلیہ بیان کیے بغیر نہ رہ سکا ''افسانے کو ایک ہی مزاج کا حامل ہونا چاہیے، اس کا ہر لفظ اور سطر اُسی مزاج کی تخلیق میں معاون ہونے چاہئیں۔'' کلیے کا ذکر ہوا اور چیخوف کا سا اُستادِ افسانہ کچھ نہ کہے ممکن نہیں، اُس نے مطالبہ کیا ''مجھے مت بتاؤ کہ چاند اپنی چاندنی میں دمک رہا ہے، مجھے شیشے کے ٹکڑے پر اُس کا عکس دکھاؤ۔''

بات گھوم پھر کر افلاطون کی جانب آتی ہے جس نے کہا تھا ''ہم ایک بچے کو آسانی سے معاف کر سکتے ہیں جو تاریکی سے ڈرتا ہے مگر المیہ تب ہے جب جواں مرد روشنی سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔''

روشنی تو محمد الیاس بھی ہمیں دِکھاتا ہے۔ اس روشنی میں معاشرہ اپنی تاب ناکیوں سے دمکتا ہے تو اپنی گراوٹ، غلاظت اور بدبو کی آلودگی سے آزردہ کرتا ہے، اُبھارتا ہے اور مصنوعی روایات کے اسیر معاشرے کو بہ جائے غلاظت صاف کرنے کے اُسے چھپا دینے کی افسوس ناک روش اختیار کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

مارٹن لوتھر کنگ ایسے سیاہ فام، سفید روح نے کہا تھا ''تاریکی تاریکی کو نہیں نکال سکتی، فقط روشنی ایسا کر سکتی ہے۔ نفرت نفرت کو نہیں نکال سکتی، فقط محبت ایسا کر سکتی ہے۔''

ایسے لوگ، سر پھرے، راست راہی جب بھی لالٹین لے کر اندھیر نگری میں نکلے تو دُھتکارے گئے۔
سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، عیسیٰؑ مصلوب ہوئے، احمدِ مُرسلؐ کی تعلیمات کو ابتدا میں (نعوذ باللہ) غلط قرار دے کر انھیں ایذا پہنچائی گئی، صوفیائے کرام کی تعلیمات کو شروع میں باطل قرار دیا گیا۔ ان سب میں ایک بات مشترک تھی کہ ان کے خیالات معاشرے کی مروّجہ رسوم و روایات کے خلاف تھے۔ بالآخر فتح سچ کی

ہوئی اور روشنی نے اندھیرے کی جگہ لی۔

ادیبوں میں کئی ایک کو پابندِ سلاسل کیا گیا، یہ جانے بغیر کہ فکر کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ ارتقائی علوم کے سرخیل شہرۂ آفاق فلسفی چارلس ڈارون نے اپنے عمل بھر کے تجربے کو ایک جملے میں یوں قید کر دیا تھا جیسے شہزادی کی جان توتے کے بدن میں ''تاریخی ارتقائی مطالعہ بتاتا ہے کہ نہ وہ باقی رہے جو طاقت ور تھے، نہ وہ جو ذہین ترین تھے بلکہ وہی باقی رہ گئے جنھوں نے تبدیلی سے سمجھوتا کیا اور اپنے آپ کو حالات اور ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔'' اس کا اشارہ ڈائنوسار ایسے طاقت ور اور قدیمی لومڑی ایسی ذہین مخلوقات کے معدوم ہو جانے اور ان مخلوقات کے قائم دائم رہ جانے کی جانب تھا جنھوں نے وقت کے ساتھ ماحول سے سمجھوتا کیا اور ارتقائی عمل اختیار کیا جیسا کہ موجودہ دور کے چرند، پرند اور انسان۔

اُردو افسانے میں محمد الیاس کا نام اُس طرح اُبھر کر سامنے نہ آیا اور وہ عوامی مقبولیت نہ پا سکا جس کے یہ مستحق تھے۔ اس کی بنیادی وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ امر بنا کہ اردو افسانہ عام قاری سے محروم ہو چکا تھا۔ کسی پڑھے لکھے راہ گیر سے منٹو، احمد ندیم قاسمی یا غلام عباس کا پوچھ لیجیے، غالب امکان یہی ہے کہ وہ ان ناموں سے شناسائی رکھتا ہوگا۔ البتہ اسی کی دہائی اور اُس کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں کا پوچھیے، وہ بغلیں جھانکنے لگے گا۔ اس تلخ امر کا تجزیہ کیا جائے تو اِس کی اہم وجہ بیچ کی وہ ''خالی دہائیاں'' ہیں جب افسانہ قاری سے دور ہو چکا تھا۔ اس خلا کو پاٹا نہ جا سکا۔ دوسرے عوامل میں سے ایک امر یہ بھی ٹھہرا کہ عوامی سطح پر مقبول ادبی رسائل جو نئے ادب کے ترجمان اور پرورش گاہ قرار پاتے ہیں، ایک مخصوص چھوٹے سے حلقے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ وہ ادبی سرگرمی کا ماحول جو نئے ادیبوں میں جذبۂ مسابقت اور قوتِ تخلیق پیدا کرتا تھا، معدوم ہوتا چلا گیا۔ ادیب کے ادب تخلیق کرنے کی وجوہ میں catharsis، شہرت اور وسیع تر قارئین کا حلقہ جہاں وہ اپنی بات سُنا سکے، ناگزیر عناصر تھے۔ آہستہ آہستہ شہرت اور وسیع حلقۂ قارئین تو غیب میں تحلیل ہوتا چلا گیا فقط catharsis رہ گیا۔ چناں چہ آج کے ادیب کے سامنے یہی مقصدِ اولیٰ رہ گیا ہے۔

محمد الیاس کے نمایندہ افسانے کسی لحاظ سے ماضی کے بڑے ادیبوں کے عمدہ افسانوں سے کم تر نہیں۔

محمد الیاس کے ہاں مزاح مخصوص علاقائی رنگِ ظرافت میں کھلتا ہوا ہے۔

''کمپنی کی تمام لاریوں کے اندر باہر بے شمار نعرے، جملے، اشعار، اقوالِ زریں، ہدایات اور فرمودات لکھے ہوتے۔ لیکن نئی لاری آ جاتی تو رشید خان پینٹر کو بلوا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دیتا اور چند لگے بندھے جملے لکھوا کر قلبی سکون محسوس کرتا۔ پیشانی اور پشت پر سب سے اوپر ''میں نوکر سب دربارں دی۔'' ذرا نیچے ''پنجاب پولیس کو سلام۔'' ''ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔'' ''ماں کی دعا جنت کی ہوا''، پچھلے بمپر پر

'لوڑنوٹاں دی' 'اندر جا بچا' 'خواتین اور بزرگوں کا احترام کریں۔ کنڈکٹر کو مستورات کے لیے نشستیں خالی کروانے کا اختیار حاصل ہے۔' 'عملے کی شکایت اڈا منیجر رشید خان سے کریں۔' ڈیزل ٹینک پر 'ڈیزل جی کھلا ای کھاہ۔' 'بریک کمپریسر پر 'جانی چُس کر' اور مین گیٹ کی سیڑھی پر سامنے 'احتیاط سے میرا و یررات کا معاملہ ہے' جیسا پُر مغز اور منفرد جملہ لکھوانا کبھی نہ بھولتا۔ حالانکہ بسیں دن کے اوقات میں بھی چلتی تھیں اور رات کے وقت سفر کرنے والوں کے لیے یہ ضروری انتباہ ایک ایسی جگہ لکھا ہوتا جہاں روشنی نہ ہونے کے باعث کوئی آسمانی مخلوق ہی پڑھ سکتی تھی۔'

بعض موضوعات جنھیں محمد الیاس نے چھیڑا ہے، وہ متقاضی ہیں کہ اُنھیں پُر مزاح انداز میں پیش کیا جائے۔ اب یہ مصنف کی خداداد صلاحیت ہے کہ لطافت اور طنز خود بہ خود کہانی میں پھول، بوٹے، پرندے کاڑھتا چلا جاتا ہے۔ زیریں سطح پر حُزن ہے جو ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

باپ بیٹے کی محبت کی دل کو چھو لینے والی محبت کی ایک سچی کہانی ہے۔

یہ وہی کہانی ہے جس کی کوکھ سے باقی تمام کہانیوں نے جنم لیا۔

یہ وہی کہانی ہے جسے محمد الیاس نامی باپ نے 'بوسۂ وداع' کے عنوان سے کچھ ایسے لکھا کہ بہت دیر میں جا کر لکھا۔ آنکھوں سے ٹپکتے آنسو الفاظ کی سیاہی کو دُھندلاتے تھے اور بار بار لکھواتے تھے۔ ایک خاکہ قدرت اللہ شہاب نے بھی 'ماں جی' کے نام سے کچھ ایسے لکھا تھا کہ آنسو تھمتے نہ تھے۔ وہ مرگ متوقع تھی کہ ماں جی حیاتِ مستعار کے بے شمار دن تسبیح روز و شب میں گن چکی تھیں۔

نوعمر لاڈلی اولاد کی موت سے بڑا غم شاید کوئی اور نہیں۔ کوئی اور جانے نہ جانے، محمد الیاس ضرور جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے، شاید اسی لیے قلم کو بگٹٹ دوڑا رہا ہے، کئی بچے تخلیق کر رہا ہے تاکہ اپنے لختِ جگر کھوتے مالے باگلے حیدر سانول کا غم بھول سکے۔ اردو افسانے کو مخصوص طرزِ نگارش سے زندگی آمیز و خرد افروز تحریریں دے رہا ہے۔ اپنے بارے میں پیارا، مخلص اور دنیا تیاگی دوست اور دھرتی کی سوندھی مٹی سے اُگتے، پھوٹتے شاہ کار افسانوں کا خالق کوزہ گر کہتا ہے۔ 'میرے دن ہی جانے کتنے رہ گئے ہیں۔ نہ معلوم کسی روز عرفان جاوید یا پروفیسر عبدالحیٔ کی کال آئے اور بیوی بتائے کہ الیاس تو پچھلے مہینے فوت ہو گئے تھے۔' 'جوگی تھا سو اُٹھ گیا، آسن رہی بھبھوت۔' 'اگر کہانی روٹھ گئی اور موت بھی نہ آئی تو بڑی ذلت اُٹھانا پڑے گی۔'

اِک تارا*

ایوب خاور

* اِک تارا: ایک تار کا تنبورا (آلۂ موسیقی)، ایک ستارا (شاعری کی غنائیت اور موسیقیت کی موزونیت سے آلۂ موسیقی اور پردۂ سیمیں پر کمال کی وجہ سے دمکتا ستارہ)

''میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات میں سے ایک واقعہ ہے'' ایوب خاور نے کھڑکی سے باہر پارک میں کھیلتے متمول آبادی کے خوب صورت صحت مند بچوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا'' جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو وہاں میرا ایک ہم جماعت تھا جس سے میرا مقابلہ رہتا تھا۔ وہ پڑھائی میں خاصا تیز تھا، کم میں بھی نہ تھا۔ کبھی وہ اوّل آ جاتا تھا تو کبھی میں۔ تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے میں مزدوری بھی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک جگہ مزدوری کرنے گیا۔ دن بھر خوب دل لگا کر محنت کی۔ جب شام کو میں معاوضہ لینے کے لیے گیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔'' یہاں پہنچ کر ایوب خاور نے توقف کیا، اپنے باہم جکڑے ہاتھوں کو غور سے دیکھا، میری منتظر نگاہوں کو تکا اور بولے'' سامنے وہی میرا ہم جماعت کھڑا تھا۔ دراصل میں نے جہاں مزدوری کی تھی وہاں کا مالک میرے اُسی ہم جماعت کا باپ تھا۔ وہ پیسوں کی ادائی کے وقت اپنے باپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے بھی اعتماد سے اپنا معاوضہ وصول کیا۔ آخر دن بھر محنت کی تھی، کوئی چوری تو نہ کی تھی۔''

ایوب خاور نے مسکراتے ہوئے کہا'' میں چوری بھی کر لیا کرتا تھا۔ چوری کے گُڑ کا مزا ہی الگ ہے اور چوری کر کے کھایا گیا اچار تو لطف ہی بڑھ کر دیتا ہے۔''

مجھے مسکراتا دیکھ کر انھوں نے بات جاری رکھی'' میرا بچپن بہت تلخ حالات میں گزرا۔ البتہ بچپن کی چند خوش گوار یادیں ایسی ہیں جو میری روح کو اپنے نرم ہاتھوں سے تھپکتی رہتی ہیں۔ بچپن کے کھیل خواہ گلی ڈنڈے، سائیکل کے رِم کو بغیر گرے چھڑی سے لڑھکائے جانے یا لکن میٹی کا کھیل ہو میری یادداشت کے علاوہ ذات کا بھی حصہ بن چکے ہیں۔ بچپن میں مَیں نے اپنے ہاتھوں سے اناج کی کٹائی بھی کی۔ گندم کا ٹانا تو مجھے بالکل ایک فن کی طرح لگتا ہے۔ کبھی یوں بھی نظر آتا ہے جیسے ہمارا کاشت کار ایک ایسا فن کار ہے جو اپنے ہاتھوں سے زمین کے سینے پر پھول بوٹے کاڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت کی وجہ سے مجھے آج بھی ہاتھوں کے کاموں میں ایک گونہ مسرت محسوس ہوتی ہے۔''

اماوس کی ایک بھیگی رات کی بھیگی ساعتوں میں ایوب خاور کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

دراصل بات ہی کچھ ایسی تھی۔ گفت گو مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئی باپ کی محبت اور محفوظ بچپن کی طرف آ نکلی تھی۔ میرا موقف تھا کہ لوگ ماں کی مامتا اور محبت کا اتنا شد و مد اور موثر تذکرہ کرتے ہیں کہ باپ کی محبت جو ایک محفوظ بچپن کی ضامن ہوتی ہے پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ ایوب خاور نے مجھے غور سے دیکھا اور بھیگی آواز میں بولے۔'' عرفان جی! آپ کی بات اپنی حد تک تو ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن اس کا سب پر اطلاق نہیں ہوتا۔''

یہاں پہنچ کر وہ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ میرے تجسس کو دیکھتے ہوئے انھوں

نے گویا ایک فیصلہ کر لیا۔ ہمارے درمیان درجنوں ملاقاتوں میں فنونِ لطیفہ سے لے کر خانگی مسائل تک بے شمار موضوعات پر بات ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے انھوں نے کبھی اپنے بچپن کی محرومیوں کا کھل کر تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پس وہ رات ان کے بچپن، محروم بچپن کی یادوں کی نذر ہوئی۔ ''عرفان جی! کہنے کو تو ہمارا ایک بھرا پڑا کنبہ تھا۔ ہم چار بھائی اور ایک بہن تھے۔''

یہاں پہنچ کر وہ ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ سے بولے ''میری تو دو دو مائیں تھیں۔ ایک حقیقی اور ایک سوتیلی۔ میرے باپ نے دو شادیاں کی تھیں۔ لیکن ایسے بھرے پُرے کنبے میں بھی میں نے وہ تنہائی دیکھی کہ اس نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ جو میری حساس طبیعت ہے۔ یہ احساسات کو دل کے نرم ہاتھوں سے ٹٹول کر شعروں کی شکل میں نظم کرنا، بات کرتے کرتے کہیں کھو جانا اور ہجوم میں یک دم تنہا ہو جانا۔ یہ سب اسی دور کی عطا ہے۔''

نمی کی ایک مہین چادر ان کی آنکھوں میں اُتر آئی۔ انھوں نے نظریں چرا لیں اور لمبی سانس بھر کر بات جاری کی۔ ''میں نے تو اپنی حقیقی ماں کو صرف محنت کرتے ہی دیکھا۔ اَن تھک محنت۔ مجھے تو بس شاید سوتیلی ماں نے پالا۔ والد نے دوسرے بیاہ کے بعد ایک برائے نام تعلق رکھا۔ بس کبھی کبھار مالی طور پر سہارا دے دیا کرتے تھے۔ ایسے میں مجھے اپنی زندگی اس حد تک بوجھ محسوس ہوتی تھی کہ شاید میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا کہ ایک مرتبہ جب میری سوتیلی ماں مجھ سے برتن دھلا رہی تھی تو میں نے اپنے ہاتھ پر چھری مار لی۔ اس سے میری ایک رگ کٹ گئی تھی۔ بچپن میں محنت کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ میں نے چکوال میں تعمیراتی کاموں میں مزدوری کی ہے۔ اینٹیں لگائی ہیں۔ گارا بھی بنایا ہے۔ لیکن اصل میں آپ کے قریبی رشتوں کا احساسِ لاتعلقی ہے جو آپ کو مار دیتا ہے۔ میرے سر پر میری ماں اور باپ کا سایہ موجود رہا لیکن میرے باپ کا لاتعلقی کا رویہ، حقیقی ماں کی اَن تھک اور خاموش محنت اور سوتیلی ماں کا سخت رویہ مل کر کچھ ایسا تلخ آمیزہ بنے کہ میں جب بچپن کی حدوں سے نکل بھی آیا تو بھی یہ آمیزہ میرے حلق سے اُترتا رہا اور رگوں میں دوڑتا رہا۔''

ایوب خاور نے چائے کی پیالی پرچ میں رکھی اور اپنے ہاتھ سامنے پھیلا کر استفسار کیا۔ ''کیا یہ ہاتھ ایک فن کار اور شاعر کے ہاتھوں کے علاوہ محنت کش کے ہاتھ نہیں لگتے۔ پر اِن ہاتھوں نے جب قلم تھاما تو آج تک تھام رکھا ہے۔ میرا یقین ہے کہ ہم قصباتی، دیہاتی لوگوں کی تعلیم میں استادوں کا بہت کردار ہوتا ہے۔ سخت اور ظالم اساتذہ کی وجہ سے جہاں بہت سے بچے شروع ہی میں اسکولوں سے بھاگ جاتے ہیں وہیں پر خوش قسمتی سے اچھے اور مخلص اساتذہ قلم سے محبت کی ایسی لت ڈالتے ہیں جو بہت دیر تک ساتھ چلتی ہے۔ میرے دادا کا نام نُور خان تھا۔ وہ بہت شفیق انسان تھے۔ انھی کے ایک ہم نام استاد نُور خان، ویسے ہی

شفیق اور مخلص، مجھے ابتدا میں مل گئے تھے۔ وہ دادا کی طرح ریٹائرڈ فوجی تھے۔ انتہائی راست اور جذباتی آدمی تھے۔ سبق پڑھاتے ہوئے اس میں اس طرح ڈوب ڈوب جاتے کہ شدتِ جذبات سے ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی۔ تعلیم کو مذہب جانتے تھے۔ پس یہ ان کا بھڑکایا ہوا شعلہ تھا جو ساری زندگی میرے سینے میں چراغ بن کر روشن رہا ورنہ میں شاید علم میں اس طرح دل چسپی نہ لیتا۔ کلاس رُوم کی کھڑکی کے ساتھ میں میرا ڈیسک تھا۔ جب سورج کی روشنی چھن چھن کر ڈیسک پر پڑتی تو میں اس سے وقت کا تعین کرلیا کرتا۔ میں نے اپنے ڈیسک پر ایک نشان لگا رکھا تھا۔ جب روشنی اس نشان تک آ جاتی تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ پس اسی دھوپ چھاؤں میں زندگی گزر گئی۔ آپ نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جب آپ نے میٹرک کیا تھا اور آپ کا گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ہوا تو آپ کے والد صاحب نے پورے خاندان کی دعوت کی تھی۔ اِدھر جس دور میں میں نے میٹرک کیا تو اس پر خوشی منانا تو کجا میرے ماں باپ نے مجھ سے نتیجے کا پوچھا تک نہ تھا۔ بلکہ شاید ان کے علم میں بھی نہ تھا کہ میں نے تعلیم کا ابتدائی زینہ عبور کرلیا ہے۔ اور شاید انھیں اس سے دل چسپی بھی نہ تھی۔ میں نے کہا نہ تھا کہ لاتعلقی کا رویہ مار دیتا ہے۔''

عمومی طور پر زندگی کی رَو سے بھرپور ایوب خاور اس بھیگی رات کو ماضی کی یادوں میں گم تھے۔ انھیں کتھارس کی ضرورت تھی۔ وہ گویا ہوئے ''آپ نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ میرے ڈراموں میں قصباتی ریلوے اسٹیشن، تالاب اور ٹرین کی پٹڑیاں کیوں کر اس تواتر سے سامنے آتی ہیں۔ میرے بچپن کے چکوال میں ایک پرانا پُرسکون ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس میں ایک بہت اونچی سی کھڑکی تھی، بلٹی کا گودام تھا اور محرابیں تھیں۔ اس کی سال خوردہ دیواروں اور سامنے سے گزرتی ریل کار آج بھی مجھے ہانٹ کرتی ہیں۔ چکوال میں ایک پرانا تالاب تھا جس میں سیڑھیاں اترتی تھیں۔ میرے گاؤں کے قبرستان میں درختوں میں گھرا ہوا ایک تالاب بھی میری توجہ کا مرکز رہا۔ یہ سب چیزیں شاید میرے تحت الشعور میں اس طرح اتر گئی ہیں کہ کبھی خوابوں اور کبھی ڈراموں میں ابھر آتی ہیں۔ بچپن میں میں اکیلی پٹڑی پر دور تک چلا جایا کرتا تھا۔ بہت بعد میں میں نے اداکارہ عارفہ صدیقی کو اسی طرح ایک ڈرامے میں پٹڑی پر چلایا۔ نہ صرف بچپن کی اس یاد کو بلکہ پیاز کو دبا کر توڑنے اور اس کا تلخ رس بہا دینے کے بعد اسے استعمال کرنے اور خوراک کے سامنے احترام سے بیٹھنے کو بھی میں نے ڈراموں میں استعمال کیا ہے۔ بچپن کی ان یادوں کے ساتھ یہ بات بھی میرے لیے باعثِ اطمینان رہی کہ اس دور کی محرومیاں میرے ارادوں کو کم زور کرنے کے بجائے مضبوط کرنے کا باعث بنیں۔ میرا تایازاد بھائی فلمیں دیکھنے کا شوقین تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے بوٹ جرابیں پہنے دیکھا۔ سو کپڑوں کی بٹیاں پیروں پر باندھ کر میں نے بوٹ جرابیں پہننے کا شوق پورا کرلیا۔ شوق تو وقت کے ساتھ اور بھی ابھرتے رہے۔ اس دور میں ٹی۔ وی تو تھا نہیں۔ ریڈیو پر ڈرامے سنائے جاتے تھے۔ سو ریڈیو کا

شوق کچھ ایسا جاگا کہ بزمِ طلبہ میں حصہ لیا۔ جو طلبہ دو مرتبہ انعام لے لیتے تو تیسرے جشنِ تمثیل میں اعزازی پروڈیوسر بن جاتے تھے۔ قاسم جلالی، محسن علی، منور سعید اور پروین شا کر وہیں سے نکلے۔ سو میں بھی اعزازی پروڈیوسر کے لیے منتخب ہوا۔ یاور مہدی صاحب انچارج تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی بہت اہم تھی۔''

ایک روز شکیل عادل زادہ صاحب کو میں نے اپنے ہاں کراچی میں کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اب تک ان سے تعلق شناسائی اور گرم جوشی سے ہوتا ہوا قلبی بندھن میں بندھ چکا تھا۔ کھانے کے دوران گفت گو موجودہ شاعری کی جانب رُخ کر گئی۔ انھوں نے ایوب خاور کی شاعری کا خاص تذکرہ کیا۔ جب میں نے ان سے ایوب خاور سے تعلق کا پوچھا تو وہ مسکرا دیے اور پُر معانی خاموشی اختیار کر لی۔

چند روز بعد ہماری ایک اور ملاقات طے ہوئی تو شکیل بھائی کہنے لگے ''کیوں نہ آپ کی ایوب خاور صاحب سے ملاقات کروائی جائے۔ شاعر تو بہت اچھے ہیں پر اِنسان تو کمال کے ہیں۔'' شکیل صاحب اور ایوب خاور میڈیا سے متعلق ایک ہی ادارے سے وابستہ تھے۔

اُس شام شکیل بھائی کے ہم راہ ایک اور صاحب تھے۔ دیسی حلیہ، پختہ رنگت، گھنگھریالے بال اور کھوئی کھوئی نظریں۔ ایوب صاحب کا سراپا میرے تصور میں ایک نفیس سنہرا چشمہ لگائے کنپٹیوں پر سفید ہوتے بالوں اور ملائم نسوانی ہاتھوں والے شخص کا تھا۔ ان صاحب نے گاڑی میں سے پھولوں کا ایک گل دستہ نکالا اور شکیل بھائی کے ساتھ چلتے ہوئے مجھ تک آئے اور گل دستہ میرے حوالے کرتے ہوئے بغل گیر ہو گئے۔

''مجھے پھول بہت پسند ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی پسند کرتے ہوں گے۔ ایوب خاور کہتے ہیں مجھے۔''

وہ شخص مجھے پہلی ہی ملاقات میں بہت اپنا اپنا سا لگا۔ کھری بات بے ٹوک انداز میں کہنے والا ایوب خاور اور میں پہلی ہی ملاقات میں یوں گھل مل گئے گویا بہت پرانا ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

ایوب خاور کون ہے؟ ایوب خاور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک جناتی قامت کا شخص نہیں۔ ایک ذہین با صلاحیت فن کار اور خوب صورت شاعر ہے۔ اس کی اصل خوبی اس کا ایک نچلے متوسط طبقے سے اٹھ کر ایک ایسے معاشرے میں اپنا قابلِ رشک مقام بنانا ہے جہاں اکثر اوقات صلاحیت پر تعلق مقدم ٹھہرتا ہے۔ اس آدمی نے اُس دور میں ادب و ذرائع بصر و سمع میں مرتبہ حاصل کیا جب فقط پی ٹی وی ہوتا تھا اور ادب کے اساتذہ کی نسل کے چند لوگ ابھی باقی تھے۔ ان حالات میں مقام بنانے کے لیے جہدِ مسلسل، بیش تر صلاحیت اور قابلِ رشک خوبی درکار تھی۔ ایوب خاور ایک ایسے آدمی کا نام ہے جس نے ''ضیا محی الدین شو''، ''جو جانے وہ جیتے'' اور ''نیلام گھر'' جیسے عمدہ پروگراموں کی ہدایت کاری کی۔ راول پنڈی، کراچی، پشاور اور لاہور کے ٹی وی اسٹیشنوں پر تین دہائیوں (1975 سے 2005) تک داد سمیٹی، کئی ایوارڈ حاصل کیے، پرائڈ آف پرفارمنس کا اعزاز اپنے نام کیا اور عشاق شعر و ادب کو شاعری کی چار کتابیں بھی تحفہ کیں۔

گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال، نیشنل کالج شرف آباد کراچی اور کراچی یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے نے خداداد صلاحیت کی بنا پر بعد ازاں کئی اہم تعلیمی اداروں میں لیکچر دیے۔ چند پرائیویٹ چینلوں میں کئی برس کام کرنے کے بعد اب یہ عالم ہے کہ ایک ذو معنی جملہ میں بہ قول خود ''آج کل میں جو پروگرام کر رہا ہوں اس کا ایک بڑا حصہ اسٹیج کے مزاحیہ اداکاروں نے سنبھال رکھا ہے اور ان کے ساتھ چند برس رہ کر میں خود بھی ان جیسا ہو گیا ہوں۔''

ایوب خاور کی ذات کے سبزہ زار میں جہاں بے شمار خوبیاں انکھیلیاں کرتی نظر آتی ہیں وہیں چند پالتو خامیاں بھی ڈکراتی ہیں۔ وہ بے باک سچے آدمی ہیں، پسند و ناپسند کا بے دھڑک اظہار کر دیتے ہیں، سراپا فن کار ہیں، پرُخلوص ہیں، اپنی کسی بھی کوتاہی کا وسعتِ قلب کے ساتھ اعتراف کر لیتے ہیں اور پرُتخیل ہیں۔ کسوٹی پر پرکھا جائے تو شخصیت میں چند دیگر اجزا کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ زود رنج ہیں، جلد برہم ہو جاتے ہیں، اضطراب دیگر سے بڑھ کر ہے اور ضعیف العقیدہ بھی ہیں۔ جادو ٹونے پر یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ اپنے بہت سے معاملات زندگی میں اُس کے اثر انداز ہونے کے قائل ہیں۔

ایوب خاور کا تکیہ کلام ہے ''ہے نا''، ''غالباً'' وہ اپنے اس تکیہ کلام سے خود بھی ناواقف ہیں۔ بات کرتے کرتے مخاطب سے کوئی سوال داغ دیتے ہیں یا کسی معاملے پر رائے دے کر دیکھتے ہیں اور استفہامیہ انداز میں یا اپنی بات کی تائید و تصدیق کے لیے بے اختیار بول اٹھتے ہیں ''ہے نا؟'' بعض اوقات شدتِ جذبات میں مخاطب کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ تالی کی صورت میں تھام کر اور دبا کر گرم جوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی فن و ادب میں پرورش پی ٹی وی اور ان ادبی محافل میں اُسی دور میں ہوئی جب زبان، بیان اور تلفظ پر خاصی توجہ دی جاتی تھی۔ چناں چہ عام گفت گو میں لہجے کے زیر و بم اور زبان کی درستی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ جب بولتے ہیں تو بہ ظاہر یوں نظر آتا ہے جیسے جملے بنا کر بول رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ان کا حقیقی لب و لہجہ ہے۔ اس معاملے میں اس درجے پر پہنچ چکے ہیں کہ برس ہا برس سے اداکاروں کی زبان، لہجے اور تلفظ کی درستی کر رہے ہیں۔ یوں مزاج میں ایک ایسا عنصر داخل ہو گیا ہے ہر لفظ کی صحت کی جانچ کے بعد ادائی کی وجہ سے گفت گو میں تکلف در آتا ہے۔ نئے شناسا شاید یوں جانیں کہ ایوب الفاظ بنا بنا کر ادا کر رہے ہیں۔

ایوب خاور سے میرے تعلق کو زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ گفت گو مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئی رجحان ساز ادیب احمد ندیم قاسمی کی جانب ہوئی تو ان کی آواز بھرا گئی۔ قاسمی صاحب کو فوت ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایوب خاور نے گلوگیر لہجے میں کہا ''میرا باپ مر گیا۔'' یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ کمرے میں سوگ میں بھیگی خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد شکیل عادل زادہ گویا ہوئے ''واہ کیا وضع دار آدمی تھے۔'' ایوب

خاور نے اجازت لے کر غسل خانے کا رخ کیا۔ جب وہ لوٹے تو ان کی سرخ ہوتی آنکھیں اب تک نم تھیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کراچی میں میں، میرے ہاں شکیل بھائی اور ایوب جی اکٹھے تھے۔ ابھی کھانے کا انتظام ہو رہا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ میں نے معلوم کیا کہ تو پتا چلا کہ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اب مہمان آپ کے گھر ہوں، بجلی چلی جائے اور کوئی متبادل انتظام نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ خیر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں دونوں مہمانوں کے ہم راہ ٹیرس پر آ گیا۔ کراچی میں رات کو سمندر کے قریبی علاقوں میں تازہ سمندری ہوا بہتی رہتی ہے۔ سو اس رات ٹیرس کے ساتھ چند درخت اور بیلیں لہلہا رہے تھے۔ ایسے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک، شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔

پھر سوال کیا کہ یہاں ''غیرتِ ناہید'' کی ترکیب سے کیا مراد ہے۔ وہ اور شکیل بھائی سوچ میں چلے گئے۔ خوب بحث چھڑی۔ کئی فون موبائل پر ملائے گئے۔ بجلی آ بھی گئی۔ میں کھانے کے لیے درخواست کرتا رہا۔ لیکن اب جب تک یہ گرہ نہ کھلنا تھی کھانا شروع نہ ہو سکتا تھا۔ قصہ مختصر، کھانے کا آغاز اس شعر کے پڑھے جانے کے خاصے وقت کے بعد ہی ہو سکا۔ ایوب صاحب کے اندر سے شاعری کا سیلِ رواں جاری ہے، امیجری اور تشبیہات کی رنگین آب شار آپ کے مشامِ جاں کو شرابور کر رہی ہے، نقرئی فوارے سے چاندی کی پھوار جاری ہے، اِدھر آپ نے کوئی اپنا ذاتی مسئلہ بیان کیا، اُدھر شاعری کی رواں ندی خشک ہو گئی اور وہ آپ کے مسئلے کو اپنا مسئلہ جان کر پوری ہم دردی سے آپ کی پریشانی میں شریک ہو گئے۔ جب تک کوئی حل سامنے نہ آیا ان کی پُرخلوص اور تشویش آمیز توجہ آپ کی جانب مرکوز رہے گی۔ جب وہ چلے بھی گئے تو آپ کے مسئلے کو ساتھ میں لے گئے اور فون کر کے پیش رفت پر آگاہی حاصل کر رہے ہیں تاوقتیکہ کوئی حل سامنے نہ آ جائے۔

عمومی طور پر مرد ادیب، خواتین ادیباؤں کو رعایت دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ایوب خاور اس معاملے میں میرٹ پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ اس کا بانگِ دہل اظہار بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک الیکٹرانک میڈیا کا تعلق ہے تو اس پر بھی وہ کسی خاتون کو حسن و نزاکت کی رعایت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ یہ بے اعتنائی یارانِ چمن کو دل گرفتہ کر دیتی ہے۔

اُن کی ہر موضوع اور ہر ادیب کے فن پر ایک باقاعدہ سوچی سمجھی رائے ہے۔ ایک روز سارہ شگفتہ کے ادبی مرتبے کی بات چل نکلی تو وہ گویا ہوئے۔ ''سارہ شگفتہ کی خود ساختہ مظلومیت نے اسے شہرت تو ضروری دی مگر جو لوگ اسے قریب سے جانتے ہیں اور اس کے گھر برپا ہونے والی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے وہ ضرور جانتے ہیں کہ چند شعرا کی خود ساختہ جلاوطنی سے حاصل ہونے والی شہرت اور سارہ شگفتہ کی بے لباس شاعرانہ شہرت کم و بیش ایک ہی طرح کی دو چیزیں ہیں۔''

بہت سے شاعر اپنی عمدہ شاعری اور چند ایک اپنی شخصیت کی بوالعجبیوں اور سنک کی وجہ سے معروف ہو جاتے ہیں۔ سارہ شگفتہ کو انھوں نے دوسرے زمرے کے شعرا میں شمار کیا۔ سارہ شگفتہ نے امرتا پریتم اور دیگر کئی لوگوں کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس کی مختصری زندگی اور شاعری پر کتب تحریر کی گئیں، مضامین لکھے گئے اور ڈرامے بنائے گئے۔ ایک طبقہ اس کی غریب گھرانے میں پیدائش، چھوٹی عمر کی شادی، متعدد طلاقوں، اپنے بچوں سے جبری علیحدگی، دماغی شفاخانے میں علاج کے باوجود عمومی نوعیت کی اجتماعیت پر اپنے ذاتی تشخص کو فوقیت دینے، اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے اور جدوجہد کے باعث ثقافتی اور ادبی اشرافیہ تک رسائی کو قابلِ قدر جانتا ہے۔ جب کہ دوسرا طبقہ اس کی حدود وقیود سے ماورا ہوتی ہوئی آزاد خیالی، چار شوہروں سے لگا تار طلاق، کئی مردوں سے تعلقات اور خودنمائی کی بے محابا خواہش کو سطحیت سے تعبیر کرتا ہے۔ سارہ شگفتہ نے 29 برس کی عمر میں ٹرین کے آگے آ کر خودکشی کر لی تھی۔

قدیم عرب قبائلی معاشرت میں شاعروں کو جنگ میں جوش بیدار کرنے، محبت کے جذبات کو ہوا دینے اور دیگر معاملات کے علاوہ اس بنا پر بھی فضیلت حاصل ہوتی تھی کہ ان کی حسیات، مع چھٹی حس تیز ہوتی تھیں۔

جس رات ایوب خاور نے یہ شعر کہا تھا تو سوچا بھی نہ تھا کہ اگلے روز وہ پروین شاکر کو قبر میں اتار رہے ہوں گے اور یہ شعر پروین پر سچ اور برمحل ہو جائے گا۔ گمان کا کوئی لمحہ تھا، القا کی ساعت تھی یا پیش خبری کا کوئی عجب وقت تھا کہ ایوب خاور سے یہ شعر سرزد ہوا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مر جائے گا، چاند اک قبر کے سینے میں اُتر جائے گا۔

''میری یونی ورسٹی فیلوز میں پروین شاکر، فاطمہ حسن اور شاہدہ حسن نے نہ صرف میری شادی کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ پروین میری اور میری بیوی کی بہت اچھی دوست تھی۔ وہ ایک حقیقی شاعرہ تھی، اس کے کسی بھی مجموعے کے کسی بھی صفحے کو کھول کر کوئی بھی شعر پڑھ لیجیے، اس کی شاعرانہ خوبی کی گواہی مل جائے گی۔ وہ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے بعد صحیح معنوں میں شاعری کی وارث تھی۔''

ایوب خاور نے چشمہ اُتارا، آنکھوں کو انگوٹھوں سے مَسل کر آرام دیا اور اپنی عینک دوبارہ پہن کر بات جاری رکھی۔

''جس صبح اُس کا انتقال ہوا اس سے پچھلی شام کو میری اُس سے فون پر طویل بات ہوئی۔ میں اسلام آباد ہی میں تھا۔ اگلے روز پی ٹی وی اسٹیشن پر ہماری ملاقات بھی طے ہو گئی۔ اُسی رات میں نے چند مصرعے موزوں کیے جو اک چاند کے قبر میں اُتر جانے سے متعلق تھے۔ اگلے روز ہم اُس کے جنازے میں شریک تھے۔ جتنی خوب صورت وہ خود تھی اس سے زیادہ خوب صورت اس کی شاعری تھی۔''

''یروشلم کے قریب دریائے اُردن کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹا سا قصبہ نُما شہر ہے جس کا نام

بیت اللحم ہے۔ بیت اللحم میں کلیسائے ولادت (Church of nativity) ہے۔ یہ دنیا کے قدیم ترین کلیساؤں میں سے ایک ہے۔ روایات کے مطابق اس کلیسا کے بغل میں نیچے وہ غار ہے جہاں حضرت عیسیٰ یسوع مسیح کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کلیسا میں داخلے کے لیے ایک پستہ قامت دروازہ ہے۔ دروازے کی بلندی چار فٹ اور چوڑائی دو فٹ ہے۔ اس کی چوکھٹ پر تین بڑے پتھر ہیں۔ دروازے سے گزرنے کے لیے جھک کر گزرنا پڑتا ہے۔ پس یہ مختصر دروازہ اسی لیے بنایا گیا ہے کہ جو کلیسا میں داخل ہو جھک کر داخل ہو۔ ایسے پست قامت دروازے قدیم وقتوں سے درباروں، خانقاہوں اور اعلیٰ مرتبت کے مکینوں کی حویلیوں میں مشرقِ وسطیٰ، عرب، اسپین، اطالیہ اور دیگر قدیم بستیوں کے بلند پایہ یا جاہ وجلال والوں کی چوکھٹوں پر نصب رہے ہیں" میں نے ایک گفت گو کے دوران عرض کیا۔

"ایک ایسا دروازہ منیر نیازی نے بھی اپنی بیٹھک پر بنوا رکھا تھا تا کہ جو ان کے ہاں داخل ہو جھک کر داخل ہو۔" ایوب خاور نے اس موضوع پر گفت گو کے دوران مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔

"کم از کم بندہ اپنی عزت خود تو کرے اور جس حد تک ممکن ہو، دوسروں سے بھی کروائے۔" میں نے بات بڑھائی تو ایوب خاور کی آنکھیں منیر نیازی کے تذکرے سے چمک اٹھیں۔ وہ کراچی چھوڑ کر لاہور چلے آئے تھے۔ سو ہماری کراچی کی شکیل عادل زادہ صاحب کی معیت میں ہونے والی روایتی ملاقاتوں کی جگہ لاہور چھاؤنی میں میرے آبائی گھر میں ملاقات ہو رہی تھی۔ بات لاہور میں مقیم اہلِ قلم واہلِ دل کی چل نکلی تھی سو منیر نیازی تک جا پہنچی تھی۔ ایوب نے سامنے کی دیوار پر آویزاں تصدق سہیل کی بنائی رنگوں کی برسات میں بھیگتی پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے اور منیر نیازی کو یاد کرتے ہوئے کہا "ایک خوب صورت انسان، صحیح معنوں میں ایک مختلف شاعر اور ایک ایسے اسلوب کا شاعر جس کی نقل کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کے استعارے، اس کی تشبیہیں اس کی اپنی تھیں، اس کی نظموں کا جنگل سرسبز ہونے کے باوجود ہوا اس کے درختوں کی شاخوں سے لپٹ لپٹ کر رویا کرتی تھی۔ کسی اَن ہونی کے ہونی کی آس میں، کسی دشت کے دریا ہونے کی آس میں، کسی راستے کے منزل ہونے کی آس میں اور کسی خواب کے حقیقت ہونے کی آس میں۔ ذاتی زندگی میں وہ بہت خود پرست تھے اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ اِن جیسا خوب صورت ان کے اردگرد کوئی تھا بھی نہیں، وہ بہت مشکل سے کسی کو شاعر مانتے تھے، وہ معیار کے قائل تھے تعداد کے نہیں سو وہ کم گفتار بھی تھے، وہ اپنی طنزیہ گفت گو کے حوالے سے بھی اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے، ادبی شخصیات کے حوالے سے بھی ان کے جملہ بازی کی شہرت تھی۔ انھوں نے اپنے گھر کی بیٹھک میں ایک بہت پستہ قد کھڑکی نما دروازہ رکھا ہوا تھا جس سے اندر جانے کے لیے ملاقاتیوں کا فی جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ وہ زود گو ہرگز نہ تھے لیکن جتنی شاعری انھوں نے کی وہ ان کی منتخب شاعری تھی۔ لوگ ان سے ان کی وہی نظمیں اور غزلیں سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے جو وہ کئی

کئی بار سن چکے ہوتے تھے لیکن ہر بار ایسا ہی لگتا تھا کہ جیسے پہلی بار سن رہے ہیں۔ مجھ سے بھی ان کا شعر سن لیجیے ۔
میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا، عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا۔"

ایک شام عجب واقعہ ہوا۔ اتفاقی طور پر ہم دونوں اسلام آباد میں موجود تھے سو ملاقات کا طے ہوا۔ انھوں نے اُس وقت کے ایک ابھرتے ہوئے جوان ادیب سے ملنے ایک معروف ہوٹل میں جانا تھا سو مجھے بھی وہیں مدعو کر لیا۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو مجھے کمرا نمبر بتا دیا۔ کمرے میں وہ ادیب موجود نہ تھے، ایوب اکیلے بیٹھے تھے۔ میں نے جب موصوف کا پوچھا تو بتایا کہ اُن کی چند فین لڑکیاں ملنے آئی ہیں سو وہ لابی میں اُن کے ہم راہ ہیں۔ مجھے خاصا نامناسب لگا کہ ایوب جی جیسے منجھے ہوئے تجربہ کار ادیب و فن کار کو بٹھا کر میزبان وہاں سے خود چلے گئے ہیں۔ میں ایوب خاور کے ہم راہ بیٹھ گیا۔ وہ نشست کوئی دو گھنٹے تک رہی۔ بیچ میں میزبان چند لمحوں کے لیے تشریف لائے اور دوبارہ خواتین مداحوں میں چلے گئے۔ تب میری نظروں کے سامنے وہ بڑے ادیب گزر گئے جن سے میں نے لفظ لکھنا سیکھا، احمد ندیم قاسمی، اے حمید، عبداللہ حسین، شکیل عادل زادہ اور دیگر۔ میں نے اُن کی وضع داری کا سوچا، دورِ جدید کے جوان ادباء میں سے چند ابھرتے ہوئے ناموں کی بے مروّتی کا خیال آیا اور دل مسوس کے رہ گیا۔

بہر حال یہ اُسی شام کی نشست کا مکالمہ ہے جب ایوب خاور نے چند لمحوں کی خاموش اداسی کے بعد کہا۔

"زندگی نے مجھے بہت کچھ دیا۔ ایک لڑکی کو چاہا تھا۔ وہ آج میری بیوی ہے۔ میرے جیسا لڑکا جو چھوٹے سے ہُنر سے اٹھا اس کا ہاتھ احمد ندیم قاسمی جیسے لیجنڈ نے تھاما۔ "فنون" کے غزل نمبر میں انعام ملا۔ 1977 میں "لا ریب" جو ایک حادثے کے بعد بھیجی کو قاسمی صاحب نے بہت سراہا۔ بعد ازاں "سیپ" اور "اوراق" وغیرہ میں چھپا۔ کچھ قدرت کی مہربانی اور کچھ محنت ایسا رنگ لائی کہ عطاء الحق قاسمی اور اصغر ندیم سید جیسے اعلیٰ لکھاریوں کو ٹی۔ وی پر متعارف کروانے کا سبب بنا۔ اپنے عروج کے دور میں تین برس تک "نیلام گھر" کیا۔ وہاں طارق عزیز نے بہت متاثر کیا جس کے اندر کا جن مائیک کو دیکھ کر بیدار ہو جاتا ہے۔ جب میں یہ سب کچھ ٹی۔ وی پر کر رہا تھا تو ساتھ ہی میرے اندر کا انسان ظلم کے خلاف مزاحم ہونے پر آمادہ رہتا تھا۔ اسی جذبے کا شاخسانہ میری نظمیں "ابھی جنازہ اُٹھا نہیں ہے"، "ابھی موسم نہیں آیا" وغیرہ ہیں جو ضیاء الحق کے دورِ جبر و استبداد کے خلاف لکھی گئیں۔ جب وہ دورِ ابتلا ختم ہوا تو میرے تخلیقی وفور نے ٹی۔ وی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ ٹی۔ وی یقیناً اعلیٰ پائے کے فن کاروں کی درس گاہ رہا ہے۔ گو اب نئے دور میں حالات بدل رہے ہیں اور بہت سے اداکار اور اداکارائیں مقصدِ فن کو بالائے طاق رکھ کر دیگر منفی رجحانات کو تقویت دے رہے ہیں۔"

منفی رجحانات سے میں ان کا اشارہ سمجھ گیا۔ جب صلاحیت پر تعلق کو فوقیت حاصل ہو جائے تو گراوٹ آتی ہے۔ فلم ٹی وی پر ''کاسٹنگ کاؤچ'' کی ترکیب خاصی بدنام ہے۔ اس سے مراد وہ گدے دار صوفہ یا بستر ہے جہاں پر ڈائریکٹر یا فلم ساز نوآموز اداکاراؤں (بعض اوقات اداکاروں) کا امتحان لیتے ہیں اور استحصال کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ معاملہ ہے کہ دورِ جدید میں بعض امیدواران ازخود اس امتحان سے گزر کر کامیابی کا راستہ پانے کی خواہش مند ہو جاتی ہیں۔ بہرحال پی ٹی وی خاندانی اور پڑھی لکھی لڑکیوں کے لیے جائے محفوظ سمجھا جاتا تھا' اب بے شمار چینلوں کی بھرمار وطومار نے معاملات کو کچھ ایسی نہج پر ڈال دیا کہ قیمتی ملبوسات، الیکٹرانک آلات، آسائشوں کے حصول کے لیے، اور بعض صورتوں میں مجبوری کے تحت فقط گزراوقات کے لیے، وہ کچھ کر لیا جاتا ہے جو کسی فن کارہ کے شایانِ شان نہیں۔

ڈرامے کے تذکرے پر اُن کی آنکھوں میں ایک چمک دوڑ جاتی ہے۔ جس سے عشق کرتے ہیں تو انتہا کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی سے پیار کیا تو ٹی۔ وی ڈراموں کا سلسلہ ان کے افسانوں کے حوالے سے ''قاسمی کہانی'' بنا ڈالا۔

گل زار سے محبت نے جوش مارا تو ''گل زار کلاسکس'' کے نام سے ان کے افسانوں پر ڈراموں کا ایک سلسلہ بنا ڈالا۔ گل زار کہانیاں اتنے عمدہ طریقے سے فلمائی گئیں کہ کئی ڈرامے تو بھارتی آرٹ فلموں کے مقابل ٹھہرتے ہیں۔ کمرشل ازم مزاج کو زیادہ نہ بھایا اس لیے لکیر کے فقیر نہ ہوئے اور بند کمروں میں ایلیٹ کلاس کے کلچر پر مقامی ثقافت کو ترجیح دی۔ اداکاروں سے ایسا کام کرایا کہ زمانہ عش عش کر اُٹھا۔ قصباتی ثقافت کی ایسی عمدہ عکاسی کی کہ یہ ڈرامے ناظرین کے حافظوں پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئے۔ حقیقی زندگی تو یہی ہے جو اِن کے ڈراموں میں نظر آتی ہے۔ کہنے کو تو گریفیٹی آرٹ بھی آرٹ کی ایک قسم ہے مگر بہرحال یہ استاد اللہ بخش کے فن پاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کمرشل ازم جتنا بھی دوڑ بھاگ لے، اسے واپس حقیقت کی جانب ہی آنا ہوگا۔

اُسی شام پرانے اداکاروں کو یاد کرتے وقت ان کی آواز میں رومان سادر آیا۔

''ایک مرتبہ میری بیگم کو اچانک اسپتال داخل ہونا پڑا۔ اُس دور کی ایک بہت نفیس اداکارہ تھیں، جو اِن کے لیے اپنے گھر سے کھانا پکا کر لایا کرتی تھیں۔ اسپتال کے دیگر مریض اور ان کے تیماردار حیران تھے کہ اتنی معروف اداکارہ اپنے گلیمر کے ساتھ اتنی سادہ مزاج بھی ہو سکتی ہیں۔ میری بیگم تو تن درست ہو گئیں پر وہ اداکارہ بہت جلد چلی گئیں۔''

''وہ کون تھیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''خالدہ ریاست'' یہ نام لے کر ایوب نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ پھر بولے ''کراچی ٹیلی

وژن کے ڈرامے ''دھن'' کے دوران ہمارے درمیان خلوص بھری دوستی کا آغاز ہوا۔ اُس کی ہر کسی سے دوستی نہیں ہوسکتی تھی۔ بہت کھری بات بے دھڑک کہہ دیتی تھی۔ اداکاری کے لیے اس کا چہرہ اور آنکھیں ڈائلاگ کے محتاج نہیں تھے۔ اس کی خاموشی بولا کرتی تھی۔ اس کے تاثرات میں وہ شدت اور اظہار تھا کہ میں اکثر اس کے ڈائلاگ کم کردیا کرتا تھا کیوں کہ اس کے ایکسپریشن الفاظ سے زیادہ طاقت ور ہوتے تھے۔ بعد میں آنے والی اداکاراؤں میں شاید ماہرہ خان ہے جس میں مجھے کچھ درجہ یہ صلاحیت نظر آتی ہے۔''

یہ اُسی شام کا ذکر ہے، اُسی شام کا جب ہمارا میزبان اپنی مداح خواتین میں گھرا بیٹھا تھا کہ مجھے ایک معصوم بے ضرر اداکار یاد آ گیا جو اپنی ایک مداح ساتھی فن کارہ کے ساتھ رسمی تعلق سے بڑھ کر رومان کے اُس درجے تک پہنچ گیا جہاں سے واپسی کو کوئی زینہ نہ آتا تھا۔

اداکار ننھا (رفیع خاور) جس نے اداکارہ نازلی کے عشق میں خودکشی کرلی تھی، کے ذکر پر ایوب خاور نے اُس کی ایک عجیب عادت کا ذکر کیا۔

''اسے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ مشہور پروگرام ''الف نون'' میں ننھے کے اس حقیقی خوف کو کمال احمد رضوی نے اس کے کردار کا حصہ بنا کر ایک قسط لکھی تھی۔ ننھا کے انتقال پر میں نے اس پر ایک پروگرام کیا تھا جس کا اختتام الف نون کی متعلقہ قسط کے اس ڈائلاگ پر کیا تھا 'نہ کرالن، لائٹ آف نہ کرنا، مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔''

''بہ طور انسان کیسے تھے، آپ کا تو اس سے خاصا تعلق رہا؟'' میں نے پوچھا تو ایوب جی نے بے ساختہ کہا۔

''وہ بہت ہنس مکھ تھا۔ خوش لباس اور خوش مزاج شخصیت کے ساتھ ساتھ وہ ایک نازک دل کا فربہ انسان تھا۔ اس میں فلمی اداکاروں والے نخرے ہرگز نہ تھے۔ مزاح کا عنصر اس کے اندر بے ساختہ تھا۔ اس کی کامیڈی میں بناوٹ کا عنصر نہ ہوتا تھا، مزاح اس سے سرزد ہوتا تھا۔ اس کی خوش مزاجی ایک طرف، اس کے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ اور قہقہے ایک جانب مگر اپنی ذاتی زندگی کی شاہ راہ پر کانٹے اس نے اپنے ہاتھوں سے بچھا لیے تھے۔''

ایوب خاور جہاں ایک بے باک فن کار ہیں وہیں سہمے ہوئے انسان بھی ہیں۔ اسی خوف نے ان کے اندر ضعیف الاعتقادی کی پرورش کی ہے۔ چند گھریلو معاملات میں پریشانی آ گئی تو بہت وثوق سے بتانے لگے کہ متعلقہ فرد نے جادو ٹونا کیا ہے۔ اسی کے باعث معاملات الجھ گئے، کئی پریشانیاں بہ یک وقت آ گئیں اور گھر کے حالات ناقابلِ اصلاح حد تک بگڑ گئے۔

اسی طرح ایک پرانا واقعہ ہے کہ ایک خاتون نے کچھ اس انداز سے پیش قدمی کی کہ یہ نادانستہ

طور پر بے بس ہو گئے۔ ان کے اعصاب جکڑے گئے۔ اس حوالے سے خاصی بے مزگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ''عرفان جی! یقین جانیے اس نے باقاعدہ طور پر عمل کروایا تھا'' خاصے تیقن سے بولے۔ غالباً ان کا ذہن کسی نفسیاتی خلفشار کی جانب نہ گیا تھا۔

میں نے اس یقین کے سامنے کوئی توجیہہ پیش کرنی مناسب نہ سمجھی مبادا اسے تردید سمجھ کر بے لحاظی پر محمول کریں۔

بعد ازاں دونوں معاملات از خود صحیح ڈھب پر آ گئے اور زندگی پگڈنڈیوں سے شاہ راہ پر لوٹ آئی۔ ضعیف الاعتقادی کیا ہے اور استحکام سوچ کیا یہ ایسے معاملات ہیں جن میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، میرا سچ کسی اور کا جھوٹ ہو سکتا ہے۔

بنیادی طور پر فہیم انسان ہیں۔ کراچی کی ثقافت پر بات ہوئی تو کہنے لگے کہ بڑے شہروں کی آبادی چھوٹے شہروں سے ہجرت کر کے آنے والوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک بڑے شہروں کے مختلف علاقوں میں کئی علاقوں کی ثقافت کی جھلکیاں نظر آیا کرتی تھیں۔ اب الیکٹرانک کلچر کا زمانہ ہے۔ بڑے شہروں کی تو بات دور رہی اب قصبات و دیہات کا حقیقی کلچر بھی معدومی سے دوچار ہے۔ سو چند برسوں، دہائیوں کی بات ہے علاقائی ثقافت قصہ ہائے دور دراز معلوم ہوں گے۔

فن اداکاری میں سلطان راہی پر تنقید کے حوالے سے ایک مخصوص موقف رکھتے ہیں۔ ایک نشست میں اس بارے میں کہنے لگے کہ سلطان راہی فلم بینوں کے اندر جبر کے خلاف جذبے کی علامت تھا۔ وہ مارشل لا کے زمانے میں اینگری مین کے طور پر عوامی غصے اور ردعمل کی تحلیل کا ذریعہ تھا۔ سلطان راہی کسی نہ کسی شکل میں اپنے سے پہلے بھی موجود تھا اور بعد میں بھی موجود ہے۔ آج کے زمانے میں ڈبلیو ڈبلیو ایف کی کشتیاں وہ کردار ادا کر رہی ہیں۔

ایوب خاور انسان کی ازلی پریشانیوں اور دکھوں پر پیچ و تاب کھاتا ہی رہے گا، بھلے یہ غم بڑھتے رہیں۔ اِنسان کی بے بسی پر کُڑھنا اس کی فطرت میں ہے۔ وہ خارج کے عناصر کا بھرپور جائزہ لے کر انہیں داخل میں جذب کرتا رہے گا اور شاعری کی شکل میں یہ پھول پتیاں بناتا اور ڈراموں کی صورت مجسمے تراشتا رہے گا۔ فردا کا سورج جب ہمیں اس دھرتی پر نہ پائے گا تب بھی اس کی گُل کاریاں اور مجسمے فن کی بساط کے کھلاڑی بن کر زندہ رہیں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ خاموش بھی ہو جائے تو تب بھی اس کے تراشے ہوئے صنم بولتے رہیں۔

ٹھیک ٹھاک آدمی

افتخار بخاری

''میری زندگی کی یادگار راتوں میں سے ایک منیر نیازی کے ساتھ گزاری رات ہے۔ میں وزارتِ خارجہ میں ملازم تھا۔ ایک دن مجھے صغیر ملال کا فون آیا کہ اُس شام منیر نیازی صاحب اُس کے ہاں مہمان ہیں۔ سو رات کا کچھ انتظام کرنا ہے۔ میری رسائی مختلف سفارت خانوں تک تھی۔ چناں چہ ایک مہربان پروٹوکول افسر کی وساطت سے انتظام ہو گیا۔ میں شام کو ساز و سامان لے کر صغیر ملال کے ہاں پہنچ گیا اور سب مشروبات و ماکولات اس کے حوالے کر کے اجازت چاہی۔ صغیر کسی طور راضی نہ ہوا اور مجھے ٹھہرا لیا۔ وہیں من موہنے منیر نیازی سے ملاقات ہوئی۔ بالوں کی ایک لٹ جو بار بار اُن کی پیشانی پر گر جاتی تھی کو سنوارتے اور سنبھالتے ہوئے انھوں نے ایک نظم اور غزل کے چند اشعار سنائے۔ وہ نرگسیت کا مجسمہ تھے، خود شناس بھی تھے اور خود پرست بھی، کسی دوسرے کو اور اُس کی کم ہی سنتے تھے۔ پس رات کو باتیں کرتے کرتے آبدیدہ ہو گئے اور پھر رونے لگے۔ ہم پریشان ہو گئے۔ وہ زار و قطار رو رہے تھے اور انھی الفاظ کی گردان کر رہے تھے ''اوئے توں صغیر ملال ایں تے میں کبیر ملال'' (تُم صغیر ملال (چھوٹا دکھ) ہو اور میں کبیر ملال (بڑا دُکھ)۔''

سیال کوٹ کی گھنی سرسبز جموں کے پہاڑوں کے قدموں میں سلطنت برطانیہ کے وقتوں سے قائم چھاؤنی کے وسط میں لیٹی آمد و رفت کے لیے شاہ راہ پر چہل قدمی کرتے ہوئے افتخار بخاری صاحب نے مجھے یہ بات سنائی تو مجھے صغیر ملال یاد آ گیا تھا۔ وہی سیماب صفت اور ذہین صغیر ملال جس نے ''بیسویں صدی کے شاہ کار افسانے'' جیسا انمول تحفہ اردو ادب کو دیا، کئی نظمیں لکھیں، افسانے تحریر کیے اور جوانی میں مَر گیا۔

''صغیر ملال کہا کرتا تھا کہ اُس نے ادب سے بیاہ رچا رکھا ہے، وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ میری اُس کی گہری دوستی تھی، ہم ہم راز و ہم مشرب تھے۔ مجھے بیرونِ ملک جانا پڑ گیا۔ اسی دوران وہ کراچی چلا گیا اور اس نے شادی بھی کر لی بہ قول اُس کے ''دوسری شادی۔'' آخری مرتبہ وہ مجھے لاہور میں پاک ٹی ہاؤس میں ملا۔ وہ خاصا کمزور اور بیمار لگ رہا تھا۔ مجھے بہت تپاک سے ملا۔ چند ماہ بعد اُس کی وفات کی خبر ملی۔ میں بہت رنج میں بھی نہیں روتا پر صغیر کے مرنے پر زار و قطار رویا تھا۔ اُس کی موت کے غم کا گھاؤ آج بھی میرے دل پر موجود ہے۔''

بخاری صاحب نے دُکھ سے ''ہوکا'' بھرتے ہوئے کہا۔ میں صغیر ملال سے نہیں ملا، اُسے دیکھا نہیں، لیکن اُس سے ایک اَن جانا تعلق محسوس کرتا ہوں۔ شاید دنیا کے سبھی لوگوں کے دکھ زیریں سطح پر سانجھے ہوتے ہیں۔ صغیر کا ایک دوست سناتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ادبی اجلاس میں وہ اور صغیر شریک تھے۔ ادبی مباحث چل رہے تھے اور تازہ شاعری پڑھی جا رہی تھی۔ اجلاس کے بیچ دوست اٹھ کر باہر آیا اور ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر اُس نے سگریٹ سُلگا لی۔ اتنے میں صغیر بھی سر جھکائے کچھ بڑبڑاتا باہر آ گیا۔ وہ مضطرب تھا اور گویا حصارِ جنوں میں تھا۔ اُس نے دوست کو نہ دیکھا اور قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

دوست نے جب سنا تو وہ خود کلامی کر رہا تھا۔

''سب دھوکا ہے، بکواس!''

غالباً یہی اضطراب اور بے چینی افتخار بخاری اور صغیر ملال میں قدرِ مشترک تھی اور جڑت کی وجہ تھی۔

اُن دنوں میرا قیام سیال کوٹ میں تھا۔ ایک روز مجلسِ ترقی ادب لاہور کے دفتر میں احمد ندیم قاسمی

صاحب شفقت سے پوچھنے لگے کہ میری افتخار بخاری صاحب سے تو خوب ملاقات رہتی ہوگی۔اس کے بعد بخاری صاحب کی شاعری کی خاصی تعریف کی۔ میں نے اعتراف کیا کہ میں بخاری صاحب سے ناواقف ہوں۔
سیال کوٹ واپسی پر میں افتخار بخاری صاحب کا تذکرہ بھول چکا تھا۔ ایک روز اپنے بچپن کے قریبی دوست اور سیال کوٹ کے صنعت کار عاصم بشیر سے ادب پر بات ہو رہی تھی۔ عاصم بشیر کو بین الاقوامی ادب سے خاص لگاؤ ہے جسے امریکا میں تعلیمی قیام نے جلا بخشی۔ وہ کہنے لگا۔
''میرے خالو گبریئل گارشیا مارکیز، کافکا، پابلو نیرودا، بورخیس اور البرٹ کامیو کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ باقی تخلیق کاروں کو میں نے پڑھ رکھا ہے، یہ مارکیز کا ناول ''تنہائی کے سو برس'' کیسا ہے؟'' سیال کوٹ کے خالص دھاتی، مشینی، کاروباری ماحول میں کسی کا ادب کو اس حد تک جان لینا میرے لیے خوش گوار حیرت لے کر آیا۔
تب تک وہ علامہ اقبال، فیض احمد فیض، خالد حسن والا سیال کوٹ نہ رہا تھا۔ شاید ابھی مٹی میں نمی اور زرخیزی باقی تھی، کچھ دبی، کچھ خفتاں۔ معلوم ہوا کہ بخاری صاحب شاعر ہیں، ادب کا شوق رکھتے ہیں، وکیل ہیں اور سارا دن کچہری میں سائلوں کے ساتھ سر کھپاتے رہتے ہیں۔ کوئی اُن کی شاعری سے تعلق کو نہ جانتا تھا۔ اُن کے چند اشعار ہیں۔

کچھ ایسے حادثے بھی زندگی میں ہوتے دیکھے ہیں
کہ انساں بچ تو جاتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا
عجب ساتھی ہے دکھ کی دھوپ ہی میں ساتھ چلتا ہے
کہیں چھاؤں ذرا آئے تو پھر سایہ نہیں رہتا
پھر اپنے آپ سے اک گفت گو سی چل نکلتی ہے
کوئی انساں زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہتا
میں اپنے دل کے دروازے پہ اکثر اب بھی جاتا ہوں
مگر اس گھر میں اب کوئی مرے جیسا نہیں رہتا

تب میں طالب علمی کے تازہ پانی کے رنگین بلوریں حوض سے نکل کر عملی زندگی کے خشک رستوں پر آیا تھا۔ میں صبح نو سے شام پانچ کی روٹین کا قیدی تھا اور سیال کوٹ کے صنعتی علاقے کی بغل میں واقع دفتر میں بیٹھا کھڑکی سے باہر ٹرکوں ٹرالوں میں لدے مال کو اڑا پسروریاں سے دھول اُڑاتی سڑک پر آتے جاتے دیکھا کرتا یا بے تاثر سپاٹ چہروں والے کاری گروں کی میکانکی انداز کی آمد و رفت کو تکا کرتا۔ چھابڑیوں پر جھریوں والے پھل سجائے تھکے اطوار والے خوانچہ فروشوں کے چہروں کی شکنیں گنا کرتا یا گانوں کی کیسٹیں بیچتے حجاموں کی دکانوں سے بہتے جھاگ آلود گدلے پانیوں کا گاڑھا سست بہاؤ دیکھا کرتا۔
شام کو افتخار بخاری صاحب کے ہم راہ سیال کوٹ چھاؤنی کی ٹھنڈی سبز ہوا اور تازہ ہریالی کی کچی مہک میں سانس لیتے عام ٹریفک کے لیے ممنوع مال روڈ (حالیہ قائد اعظم روڈ) کی طوالت اپنے قدموں سے ماپا کرتا۔ ہم آٹھ دس کلومیٹر کی لمبی دوطرفہ سیر کے دوران فوجی کوارٹروں، گرجا گھروں، انگریز کے زمانے کے سنگ ہائے میل، ملٹری افسران کے نفیس لان والے سجے بنگلوں کو دیکھتے اونچے لمبے درختوں

کے بیچ سے یوں گزرتے کہ صاف موسم میں جموں کی پہاڑیوں پر کالی کے مندر کی روشنیاں نظر آتیں، سیہ اور لومڑ ہمارا رستہ کاٹتے اور نارنگی، مالٹے کے باغات کے قریب جھاڑیوں میں جگنو ٹمٹماتے نظر آتے۔

پانچ برس کے دوران ہم نے سیکڑوں شامیں یوں چہل قدمی کرتے گزاریں کہ سردیوں میں سٹرس فروٹ کی کھٹی میٹھی مہک، بہاروں میں موتیے، رات کی رانی اور گلاب کی بھینی بھینی خوشبو، برساتوں میں موسلادھار بارش کے بعد کی گیلی مہکار اور گرمیوں میں آندھی جھکڑ طوفانوں میں چکراتی گھومتی گرد کے ذرّات کی مٹیالی ہبکار میں موٹے موٹے جامنوں اور شیریں آموں کی مخصوص مٹھاس ہمارے ساتھ سفر کرتی۔ قدرت کی نیرنگیوں میں ادب و فلسفے کی گفت گو روح کو سیراب کر دیتی۔ افتخار بخاری صاحب ادب کے شہری مراکز سے برسوں سے دور تھے، مطالعہ اور فکر فقط روح کی تراوت کے لیے کرتے، نمود و نمایش کے خواہاں کبھی نہ رہے تھے اس لیے قطعی منفرد اور حقیقی خالص سوچ کے مالک ٹھہرے۔ ''ہمارے موجودہ ادب کا عالمی ادب میں وہی مقام ہے جو دنیا میں ہمارے معاشرے کا ہے، یعنی یہ اب تک خام ہے'' ایک روز تاسف سے کہنے لگے۔ ''مجھے یہ بات بہت پہلے سمجھ میں آ گئی تھی کہ دنیا میں لوگ دو طرح کے انسانوں کی عزت کرتے ہیں۔ پہلے وہ جو آپ کو فائدہ پہنچا سکیں، دوسرے وہ جو آپ کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس بات کا انحصار آپ پر ہے کہ آپ کتنے حریص یا بزدل ہیں۔ میں کبھی بھی دنیادار نہیں رہا لہٰذا نہ کسی سے ڈرا ہوں اور نہ ہی کسی کی خوشامد کی ہے۔'' بخاری صاحب نے سادگی سے اپنے اشعار سنائے۔

کون سخی ہے جس نے اک شب جینے کا سامان کیا، کس نے چاند کا سکہ ڈالا شام کی خالی جھولی میں، نانک ہو یا شاہ حسین، بخاری ہو یا بھگت کبیر، سب نے ایک ہی درد لکھا ہے اپنی اپنی بولی میں۔

بخاری صاحب کو دکھ تو کئی ہیں، پر بے اولادی کا دکھ سب پر بھاری ہے۔ مرزا نوشہ، غالبؔ کو بھی ایسا ہی دکھ تھا۔

سیال کوٹ کے ایک مذہبی متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والا افتخار نامی بچہ ٹاٹ پر بیٹھ کر پرائمری تعلیم حاصل کرتا ہے، میٹرک تک پہنچتے پہنچتے اسکول کا ذہین ترین طالب علم گردانا جاتا ہے، شہر کی سرکاری لائبریری میں موجود ادب کی کتابوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے، سڑک پر گرے کاغذ کو بھی پڑھ ڈالتا ہے، عالم وارفتگی میں یوں بے چین رہتا ہے کہ گھر میں بھی ٹک کر نہیں بیٹھتا اور صحن میں ہمہ وقت چلتے ہوئے دن بھر میں درجنوں میل کا سفر طے کر لیتا ہے، شاعری کا شوق پیدا ہوتا ہے، سیکڑوں نظمیں غزلیں لکھ ڈالتا ہے، اسلام آباد میں ملازمت اختیار کرتا ہے، وہاں جلیل عالی، نثار ناسک، انوار فطرت، صغیر ملال، یوسف حسن، تنویر سپرا جیسے ادب کا 'سودا' رکھنے والوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور ایک اہم فیصلہ کر لیتا ہے۔

وہ تب تک کی لکھی سیکڑوں نظمیں غزلیں پھاڑ کر جلا دیتا ہے۔

''شاعری کی لت ایسی لگی تھی کہ میں صفِ اوّل کے طلبا سے گر کر درجہ دوم کے طالب علموں میں آ گیا تھا۔ راول پنڈی جا کر احساس ہوا کہ اب تک جو جھک ماری تھی وہ مریضانہ ذہن کی سستی شاعری کے سوا کچھ نہ تھا'' گھنٹا گھر چوک کے قریب چائے خانے کے باہر رکھے بینچ پر دودھ پتی پیتے ہوئے بخاری صاحب نے اعتراف کیا۔

اتنے میں چائے خانے کے مالک نے مددگار لڑکے کو خاص سیال کوٹی انداز میں گھرکی دی "اوئے ماماں توں صاب دی دُدھ پتی وِچ ملائی نہیں پائی؟" (اے لڑکے تم نے صاحب کی دودھ پتی پر بالائی نہیں ڈالی) اب تک میرے کان بڑے، چھوٹے ہر کسی کے لیے مخصوص سیال کوٹی لفظِ تخاطب "ماماں" کے عادی ہو چکے تھے۔

اس آواز سے گفت گو کی لڑی ٹوٹ گئی اور جملے بے ترتیبی سے گر کر بکھر گئے۔ بخاری صاحب نے جملے چنے اوران کی ترتیب لگا کر لڑی کے دانے پھر سے گننے لگے۔ بخاری صاحب بھی کھلے ڈلے سیال کوٹیوں کی طرح اونچی آواز میں بولتے ہیں اور سینے سے اُبلنے والا بلند آہنگ قہقہہ لگاتے ہیں۔ نہ جانے اردو زبان میں آسمان کو چیر ڈالنے والے فلک شگاف قہقہے کی ترکیب کس طرح رائج ہوئی، فلک شگاف تو عموماً ماتم ہوتا ہے۔ اللہ اللہ، اِک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔

سو اُس پر رونق چوک کے خوانچہ فروشوں، جوتے گانٹھنے والوں، قلعی کرنے والوں، توے پر بکروں کے گردے، کپوروں کی کٹا کٹ بنانے والوں اور رسیاں بُننے والوں کے بیچ میں بیٹھے جڑی بھنووں، سمٹی چال، اونچے قہقہوں اور ذہین چمکتی آنکھوں والے بخاری صاحب نے جملے چنتے، گنتے ہوئے کہا۔

''اپنے کُل کلام کو آگ لگا دینے کے بعد گویا نئے جنم میں، بورخیس نے بھی چالیس برس کی عمر میں نیا جنم لیا تھا، وہ استاد تھا، میں ادنیٰ شاگرد، میں نے اپنی پہلی نظم ''چودھویں صدی کی آخری نظم'' راول پنڈی کے حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھی۔ سامعین نے اسے پسند کیا، میں نے احمد ندیم قاسمی کے ''فنون'' میں شائع کرنے کی غرض سے بھجوا دی۔ چند ماہ بعد راول پنڈی کے پاک ٹی ہاؤس یعنی ''داتا ریستوران'' میں بیٹھا تھا کہ اختر امام رضوی آ گئے۔ وہ کہنے لگے ''یار بخاری میں لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملاقات ہوئی، تمھارا پوچھتے ہوئے کہہ رہے تھے ''یہ آدمی کون ہے، بہت اچھا شاعر ہے۔'' کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ قاسمی صاحب فتح محمد ملک صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں اور نثار ناسک ملنے چلے گئے۔ ملک صاحب نے ہماری خوب تواضع کی۔ اتنے میں قاسمی صاحب تشریف لے آئے۔ یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ نثار ناسک نے میرا تعارف کروایا تو انھوں نے رسمی علیک سلیک کے بعد توجہ دوسری جانب کر لی۔ میں نے ہمت کر کے انھیں بتایا کہ میں نے ایک نظم انھیں اشاعت کے لیے بھجوائی تھی۔ انھوں نے عنوان کا پوچھا تو عرض کیا ''چودھویں صدی کی آخری نظم۔'' وہ چونک گئے اور مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے ''اچھا تو آپ افتخار بخاری صاحب ہیں، میں تو آپ کو بڑی عمر کا سنجیدہ آدمی سمجھا تھا، آپ تو ابھی لڑکے ہیں۔'' انھوں نے نظم کی خوب تعریف کی اور بتایا کہ یہ نظم ''فنون'' کے اگلے شمارے میں شامل ہے۔ بعد ازاں انھوں نے میری خوب حوصلہ افزائی کی۔ وہ نظم ادبی حلقوں میں میری ابتدائی پہچان کا باعث بنی۔ اس کے بعد میری شاعری تواتر سے فنون میں شائع ہوتی رہی اور قاسمی صاحب سے اُن کے وصال تک خط و کتابت جاری رہی اور رابطہ رہا۔''

افتخار بخاری کو ان کے شعبۂ روزگار میں بہت کم لوگ بہ طور شاعر جانتے ہیں۔ وہ قصداً بھی اپنا تعارف بہ طور شاعر نہیں کرواتے کیوں کہ اس طرح ایک شخص کا عملی آدمی کے بجائے خیالات میں گم اور حال سے عدم موجود شخص کا تصور اُبھرتا ہے۔

ایک مرتبہ افتخار بخاری کے ایک دوست نے ان کا کسی سے تعارف کرواتے ہوئے اُسے بتایا ''یہ بہت اچھے شاعر ہیں۔'' انھوں نے فوری طور پر وضاحت کی ''نہیں۔ میں ٹھیک ٹھاک آدمی ہوں۔''

معروف ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے بخاری صاحب کے دل چسپ واقعات ومشاہدات ہیں۔فراز کے واقعات کا ضمناً تذکرہ اُن کے خاکے میں ہو چکا ہے۔

ایک ٹی وی پروگرام میں منیر نیازی صاحب نے کہا کہ ہر دور کا ایک شاعر ہوتا ہے اس دور کا شاعر میں ہوں۔ ایک ملاقات میں بخاری صاحب نے منیر نیازی صاحب سے استفسار کیا کہ اب زندگی بہت بگاڑ کا شکار ہو چکی ہے اور یہ دور بہ قول اُن کے بدبودار ہو چکا ہے تو کیا وہ اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہیں۔ نیازی صاحب نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہنے لگے ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں جس دور کا شاعر تھا وہ گزر گیا'' نیازی صاحب سے بخاری صاحب کی آخری ملاقات اُن کی ہمشیرہ کے سسر کی رسم چہلم پر ہوئی۔ وہ اُن کا آخری سال تھا ''مجھے اُن کے ہاتھ اتنے پیارے لگے کہ بے اختیار چوم لیے'' بخاری صاحب نے بتایا۔

''1994ء میں جب میری کتاب ''زمین پر ایک دن'' شائع ہوئی۔ اشرف سلیم نے کہا کہ گل زار نے تمھاری کتاب کی فرمائش کی ہے۔ سو میں نے کتاب انھیں بھجوا دی۔ انھوں نے رسید بھجوائی اور تعریف بھی کی۔ انھوں نے لکھا کہ وہ ''فنون'' کی وساطت سے میرا کلام پڑھتے رہے ہیں۔ جس دور میں پاکستان میں گل زار کو صرف ایک نغمہ نگار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ بندہ تو ایک نہایت خوب صورت اور منفرد شاعر ہے۔ یہ یقیناً فلموں کے علاوہ بھی لکھتا ہوگا۔ جب ''فنون'' نے گل زار کی شاعری متعارف کروائی تو مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے اُسے پہلے پہچان لیا تھا۔ دو تین برس تک خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ گل زار کی طبع موزوں ہے مگر باقاعدہ علمِ عروض سے واقفیت نہ رکھتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ قاسمی صاحب جنھیں وہ بابا کہتے تھے، اُن کا کلام اشاعت سے پہلے درست کرتے تھے۔ پھر گل زار نے ضرورت کے تحت عام فلمی شاعری شروع کر دی۔ میں نے انھیں لکھا کہ اُن کے موجودہ گیت گل زار کے نہیں بلکہ سمپورن سنگھ کے لگتے ہیں۔ یہ بات شاید انھیں بُری لگی جس پر میں آج بھی شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔'' بعد ازاں افتخار بخاری صاحب کو اُن کی شاعری کے مجموعے 'درد کہاں جاتے ہیں مائے' کی اشاعت کے بعد بھی ہندوستان سے گل زار صاحب کا توصیف کا خاص فون آیا۔

سائنسی ذہن اور دلیل کے قائل افتخار بخاری بعض معاملات حیرت وتجسّس کو انسانی فہم وادراک کی نارسائی اور ایک جہانِ دیگر کے وجود کی موجودگی سے وابستہ کرتے ہوئے ایک مکتوب میں مجھے لکھتے ہیں۔

''میں نے ہمیشہ زندگی میں سائنسی سوچ ہی کو قبول کیا ہے۔ بغیر ثبوت اور تجربے کے کسی بات کو مجھ سے منوانا قریباً ناممکن ہے۔ مگر میری زندگی میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ میں ماورائے فہم امکانات کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں ان کے ہونے پر اتنا ہی یقین کرتا ہوں جتنا اپنے یا مادی دنیا کے وجود پر کرتا ہوں۔ میں اس لحاظ سے اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہوں جو ایسے تجربات سے محروم رہے ہیں۔ وہ اس جہاں کے ایک حصے سے ناواقف رہ گئے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ جذبات تھے یا

روحیں یا کوئی اور چیزیں مگر وہ موجود تھیں اور میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا ان کا معمول تھا۔ بستر میں سوتے ہوئے ایک مرتبہ کسی نے میرے پیر کے انگوٹھے کو پکڑلیا۔ میں گھر میں اکیلا تھا اور گھر والے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں پیر جھٹک کر جاگ گیا اور سوچا کہ یہ کوئی بلی ہے۔ میں کمبل اوڑھے لیٹا رہا مگر اب کی بار کسی نے دونوں انگوٹھے پکڑ لیے۔ میں نے کمبل جھٹکے سے پرے پھینک دیا اور ٹیوب لائٹ جلا دی۔ کمرے میں کوئی شے نہیں تھی اور نہ کسی چیز کے داخل ہونے یا نکلنے کا راستہ تھا۔ وقت دیکھا تو رات کے دو بجے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگرچہ یہ چیز مجھے نقصان نہیں پہنچائے گی مگر رات آرام سے گزارنے بھی نہیں دے گی سو گھر کو تالا لگا کر بس اسٹینڈ پر پہنچا اور چائے کے کھوکھے پر وقت گزارا یہاں تک کہ صبح کی اذان ہو گئی۔ واپس گھر پہنچا اور دیکھا کہ سب حسب معمول ہے۔ روشنی کے گولے اور چلتی ہوئی روشنی کی شکل میں متعدد بار یہ چیزیں بچپن تک ہی مجھے نظر آتی تھیں۔ جب بھی والد صاحب کو بتاتا تو وہ ٹال دیتے کہ تم خوامخواہ ڈرتے رہتے ہو۔ یہ باتیں زیادہ تر لوگوں کے لیے میرے نفسیاتی وہم سے زیادہ کچھ نہیں سمجھی جائیں گی مگر میں کہوں گا کہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی محض وہم ہی ہے۔

ایک واقعہ ایسا ہے کہ جس کی کوئی وضاحت ممکن ہی نہیں۔ میرے والد صاحب کے کچھ دوست مہمان آئے ہوئے تھے۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ برس کی ہوگی۔ والد صاحب مہمانوں کے ساتھ اوپر والی منزل پر کمرے میں باتیں کر رہے تھے اور ساتھ حقے کا دور چل رہا تھا۔ میں ان کی گفت گو سننے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں سلجھے ہوئے لوگ ہوتے تھے ان کی گفت گو صاف ستھری اور روحانیت کے حوالے سے بھی ہوتی تھی۔ اب تو بڑوں کی گفت گو اس لائق نہیں ہوتی کہ بچوں کے سامنے کی جاسکے۔ جب رات کافی ہو گئی تو والد صاحب نے کہا کہ صبح اسکول بھی جانا ہے جاؤ نیچے جا کر سو جاؤ جہاں میری والدہ اور بھائی بہن سو رہے تھے۔ نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں جہاں لائٹ نہیں تھی۔ جب میں آدھی سیڑھیاں اتر گیا تو میں نے دیکھا کہ کوئی ایک انگارا گھمار ہا ہے جس سے دائرہ بن رہا ہے۔ ہم بچے اس زمانے میں اکثر کسی تنکے کے ایک سرے کو آگ لگا کر رات کو گھما کر دائرہ بناتے تھے یہ ایک کھیل سا ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی خوف نہیں آیا کیوں کہ میں سمجھا کہ میرا بھائی ہے جس نے تنکے کو آگ لگا رکھی ہے اور گھما رہا ہے اور خود مجھے اندھیرے کے باعث دکھائی نہیں دے رہا۔ میں نے اس کا نام لے کر کہا یہ تنکا تم گھمار ہے ہو؟ وہ دو انگارے بن گئے۔ مجھے پھر بھی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ میں نے کہا دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہیں؟ وہ تین ہو گئے۔ میں ڈر کر واپس بھاگا اور والد صاحب کو قصہ بتایا۔ وہ ہنس پڑے اور مجھے ساتھ لے کر بستر تک چھوڑ گئے۔ وہاں میرے بہن بھائی والدہ سب گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ یوں اس رات کسی مافوق الفطرت ہستی نے اشاروں کی زبان میں مجھ سے باقاعدہ گفت گو کی اور بتایا کہ میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ بہت بعد میں والد صاحب نے میرے بار بار پوچھنے پر صرف اتنا بتایا کہ وہ ان کا کوئی واقف ہے اور میرے ساتھ دل لگی کرتا ہے اور اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ اس بارے میں کوئی سوال نہ کروں۔ والد صاحب کی وفات کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

ایک رات چھاؤنی کے پرے کنارے پر واقع چائنیز ریستوران میں چکن کارن سوپ پیتے ہوئے جہاں گردی و سیاحت کی باتیں سنائیں۔ بیش تر سفر معاش کے لیے تھے، چند عالم بینی کے لیے۔

سی گل کی کہاوت ہے ''ایک گھڑی والے شخص کو درست وقت معلوم ہوگا، دو گھڑیاں پہننے والا شخص تذبذب کا شکار رہے گا۔''

بخاری صاحب جنرل ضیاء الحق کے ابتدائی دور میں اُردن چلے گئے۔ اُردن خوب صورت لوگوں، جدید معاشرت اور آزادروی کے دل دادگان کا ملک ہے۔ بخاری صاحب وہاں پاکستانی سفارت خانے میں ملازم تھے۔ اُردن کی زندگی اور لینڈ سکیپ نے انھیں بہت متاثر کیا۔ وہ ہمیشہ سے گوشہ نشین اور تنہائی پسند رہے ہیں۔ سنانے لگے ''ژاں پال سارتر نے کہا تھا'' جب آپ اکیلے میں تنہائی محسوس کر رہے ہوں تو یقیناً آپ بُری صحبت میں ہیں۔'' اُردن میں مجھے اکیلے میں تنہائی محسوس نہیں ہوئی بلکہ اپنے آپ سے خوب ملاقاتیں رہیں اور میں ایک اچھی صحبت میں رہا۔ میں نے اپنے ساتھ لمبی سیریں کیں اور بہت باتیں کیں۔''

انھوں نے دنیا کے نرالے رنگ دیکھے، بھانت بھانت کی خدائی سے واسطہ پڑا۔ وہیں بحیرۂ مردار، پیٹرا، جرش، بحیرۂ احمر اور جبلِ عمان کو دیکھا، محسوس کیا، جذب کیا اور ذات کا حصہ بنالیا۔ ایک روز برف باری میں اپنی تنہائی کے ہم راہ پھرتے ہوئے اُنھیں ایک امریکی گورا ساڈھول گیا۔ عجب آدمی تھا وہ اور عجب قلندرانہ باتیں تھیں اُس کی۔ اُس سے متاثر ہو کر اُن کے اندر سے ایک نظم ''آدمی'' پھوٹ نکلی۔ ایک ہزار 72 دن اُردن میں گزار کر بے چینی کے گُل رنگی اُڑن قالین پر بیٹھ کر ورجینیا، امریکا میں جا اُترے۔

ورجینیا کے خالص امریکی ماحول میں مختلف ثقافتوں کی Melting Pot (کٹھالی) میں رنگ رنگ کی ثقافتی حلیم اُبلتی بنتی دیکھی۔ اس نے مزاج میں برداشت اور نظر میں وسعت پیدا کر دی۔ ہر خیال، مذہب اور نسل کے لیے دل میں جگہ اور احترام یوں آ گیا جیسے سیاہ قلمی گلاب میں خوشبو۔

ایک شام ہم قائدِاعظم روڈ کے کنارے لگے بینچ پر بیٹھے تھے۔ ہمارے پیچھے قدیم گرجا گھر تھا اور سامنے مسجد۔ میں نے گزارش کی کہ ہم میں سے بیش تر لوگ نومسلم ہیں۔ اگر پچھلی پیڑھی پر نظر ڈالی جائے تو چار پانچ نسلیں پہلے زیادہ تر لوگوں کے آباؤ اجداد ہندو، جین یا بُدھ تھے۔ جب ہم ہندو کو گالی دیتے ہیں تو اپنے باپ (آباء) کو گالی دیتے ہیں۔ اس بات سے انھوں نے نہ صرف قطعی طور پر اتفاق کیا بلکہ کہنے لگے ''جہاں گردی نے مجھے سکھایا ہے کہ ہر شخص قابلِ عزت اور کسی حد تک درست ہے۔''

اس کے بعد توقف کیا اور کہنے لگے ''وہاں میں نے سیکھا کہ چوں کہ ہم انگریزوں کی کالونی رہے ہیں، ہمارے تعلیمی نصاب میں انگریزی ادب موجود رہا ہے اس لیے ہم میں سے بیش تر لوگ انگریزی ادب سے مرعوب ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ روسی، ہسپانوی، جرمن، پرتگیزی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں انگریزی سے بڑا ادب موجود ہے۔ میں عربی، فرنچ، انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی اچھی طرح پڑھ لیتا ہوں۔ امریکا، فرانس، جرمنی اور یورپ کے دیگر ممالک میں برس ہا برس رہ کر میں اپنے فرسودہ نظریات کی قید سے آزاد ہوا۔ اُردن میں محمود درویش، نزار قبانی، سمیع القاسم، نازک الملائکہ کی عربی شاعری نے میرے شاعری کے بارے میں بنیادی تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔ میں نے عربی اور فرنچ کی تو با قاعدہ درسی تعلیم حاصل کی اور ان کے جواہر پاروں کا ادنیٰ پارکھ بنا۔ جو لطف اصل زبان میں فن پارہ پڑھنے کا ہے وہ ترجمہ میں نہیں۔''

اندھے ہو جانے والے فلسفی شاعر بورخیس کی شاعری معلوم اور نا معلوم کے بیچ مقام بے یقینی پر معلق ہو کر اثر پذیر ہوتی ہے۔ اُس کی نظم ''اُسے نیند نہ آئی'' کا اپنا کیا ہوا ترجمہ بارہا سنایا۔ ''نیند نہ آئی'' استعارہ بھی ہے اور آفاقی فکر کا اشارہ بھی۔ نیند، چین اور سکون کی علامت بھی ہے اور اطمینان کا اظہار بھی۔ یہ انسانی نفسیاتی و بدنی ضرورت بھی ہے اور مکمل پُر اطمینان ''موت'' کی اصطلاح بھی۔ اس بہ ظاہر سادہ، معنی طور پر پُر پیچ اور فکر کے کواڑ کھٹکھٹاتی نظم کا موثر ترجمہ پہلی قرأت میں پوری طرح نہیں کھلتا۔ نظم کچھ یوں ہے ۔

''وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، دیر تک، اسے نیند نہ آئی، اُس نے آنکھیں موند لیں، بیتے ہوئے واقعات کو یاد کیا، مگر اسے نیند نہ آئی، وہ دیوار پر آویزاں گھڑی کی، ٹک ٹک گننے لگا، مگر اُسے نیند نہ آئی، اس نے تکیے کے نیچے سے خواب آور گولیاں، نکال کر کھائیں، مگر اُسے نیند نہ آئی، وہ بستر سے اٹھا اور الماری سے پستول نکال کر، ساری گولیاں اپنے سر میں اُتار لیں، وہ مر گیا، مگر اُسے نیند نہ آئی۔''

معلوم اور نا معلوم کے بیچ ایک نازک حد قدیم ادوار سے فلسفیوں، صوفیوں اور شاعروں کو حیران اور متوجہ کرتی آئی ہے۔ وجود اور عدم وجود کا 'وقت' کے ساتھ باہمی تعلق ہنوز حل طلب گتھی ہے۔ کیا وقت ایک تصوراتی علامت ہے، موازنے کا پیمانہ ہے یا کائناتی رو کا حقیقی وجودی ٹکڑا ہے، بہر حال دانش ورانِ افرنگ و مشرق کی دل چسپی کا محور ہے۔

ایک روز سیال کوٹ کی پہاڑی پر موجود خانقاہ کی قدیم سیڑھیوں پر جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے کہنے لگے ''صوفیا کرام کی دھیمی میٹھی باتیں بھی تو شاعری ہیں۔''

جب ہم موتیے کے ہار، اگر بتیاں، چاول کی دیگیں اور مقدس چادریں بیچنے والوں کی گلی سے نکل آئے تو کہنے لگے ''شاعری کی کئی قسمیں ہیں۔ میرے مطابق جب کوئی فن اپنے کمال کو چھوتا ہے تو وہ شعر میں ڈھل جاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ڈیگو میراڈونا کا ایک فٹ بال میچ میں گول دیکھ کر بے اختیار کہا تھا ''یہ فٹ بال نہیں شاعری ہے۔ عمدہ فلم بھی نظم ہوتی ہے۔ فرانسیسی زبان سیکھنے کے دوران مجھے فرنچ فلم ڈائریکٹر 'فرانسوا تروفو' کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ وہ بہت جلد دنیا کو چھوڑ گیا۔ اس کی وفات پر فرانس میں قومی سطح پر سوگ' کا اعلان کیا گیا تھا۔ اُسے وہاں کے لوگ سارتر کی طرح پیار کرتے ہیں۔ اس کی فلمیں Tirez Surla, La Chambre Verte L'efant Terrible, Pianist, Largent Depoche فلمیں نہیں سانس لیتی نظمیں ہیں۔''

مجھ سیلانی کے ٹھکانے بستی بر قدمِ مارگلہ سے ہوتے ہوئے شہر برلب بحر تک ہجرت کرتے رہے۔ میں جہاں قدم ریز ہوا، زمیں چلنے لگی۔ ایک روایت زندہ رہی، کراچی، حیدر آباد، لاہور، اسلام آباد، ملتان، رحیم یار خان، پشاور، ٹھٹھہ، کوئٹہ کہیں بھی گیا تو فون پر رابطہ رہا۔ ایسا درجنوں بار ہوا کہ لاہور اسلام آباد کا سفر جی ٹی روڈ سے فقط اس لیے کیا کہ وزیر آباد سے سیال کوٹ کا رخ ہو سکے۔ وہاں بخاری صاحب منتظر ہوتے، میں اور وہ قائد اعظم روڈ کا رخ کرتے، اِک سرے پر گاڑیاں کھڑی کرتے، شام میں گھلتی ملتی سہ پہر میں آٹھ دس کلومیٹر پیدل واک کرتے اور واپسی پر وہ اپنے گھر کی راہ لیتے اور میں لاہور یا اسلام آباد کی۔ گویا یہ سب آٹھ دس کلومیٹر

اور دو تین گھنٹے کی رفاقت کی بات ہے، یہ سب دل کے معاملے ہیں۔ بخاری صاحب ہوں اور سیال کوٹ چھاؤنی کے درخت نہ ہوں یا وہ پیڑ و شجر ہوں اور البیلے بخاری صاحب نہ ہوں، بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بنا۔

ایک مرتبہ ہماری ملاقات کو چار پانچ برس گزر گئے۔ میں کراچی کے گدلے پانیوں کا جان و ر ٹھہرا اور وہ جنگلی فضاؤں کے باسی۔ سو ایک اہتمام کے تحت میں سیال کوٹ ان سے ملنے پہنچا اور مال روڈ (قائداعظم روڈ) کا رخ کیا۔ مجھے کراچی کے یکساں موسم کی عادت ہو چلی تھی۔ ابھی ہم نے واک شروع ہی کی تھی کہ آندھی جھکڑ طوفان کا ایک دور چلا اور بجلی چلی گئی۔ ہر سُو گھپ اندھیرا تھا یا سیاہ بادلوں میں لپکتی بے آواز بجلیوں کی رگیں۔ آندھی تیز ہوئی، بلند و بالا درخت یوں جھومنے لگے جیسے ابھی ٹوٹنے کو ہوں، خشک مٹی اور بکھرے پتے تیز ہوا میں گھمن گھیریاں کھانے لگے، کڑک کی آوازوں کے ساتھ چھوٹی ٹہنیاں ٹوٹ کر سڑک پر بکھرنے لگیں۔ میں مسحور تھا، مجبور تھا۔ بارش کا چھینٹا پڑا اور ٹپاٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ آندھی کچھ تھمی اور بارش کی عمودی لہراتی چادریں زمین پر جل ترنگ کرنے لگیں۔ وہ رات ایک امانت تھی میرے اور بخاری صاحب کے بیچ۔ سو آج دامن الٹائے دیتے ہیں۔ کراچی کے کئی برس کے خشک موسموں کے بعد اُس آندھی بارش اور پانی کی بوندوں کے ساتھ پتوں کے برسنے نے گویا مجھ پر ایسا جادو پھونکا کہ میں اپنے آپ کو اور بخاری صاحب کو فراموش کر بیٹھا۔ گویا کسی ہپناٹک ٹرانس میں چونڈہ گراؤنڈ کے نزدیک درختوں کے گھنے جھنڈ سے گزرنے لگا۔ بادلوں کی گرج اور درختوں کی گھناوٹ۔ سیے گزرتی سرسراتی ہوا میں بخاری صاحب میرے ساتھ لپکے کہ مجھے مزید آگے جانے سے روکیں مبادا میں کسی درخت کے کم زور تنے یا بجلی کی ننگی تار کی زد میں آجاؤں۔ مجھے محسوس ہوا کہ بارش میری روح پر برس کر اُسے سیراب کر رہی ہے اور دل کو نرم کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کہ بخاری صاحب خاموش ہو گئے اور ساتھ چلنے لگے۔ اُس رات گھنٹوں چلتے ہوئے ہم نے کوئی بات نہ کی، کسی موضوع پر ایک جملہ بھی نہ بولا۔ بس تیز بارش کی موسلا دھار بوندوں میں بھیگتے رہے، درختوں کے اُڑتے پتے ہمارے چہروں پر چپکتے رہے، تنکے اور جھنکاڑ ہمارے بالوں میں الجھتی رہی اور ہم چلتے رہے۔ نہ جانے کیوں اُس رات مجھے ایک ایسا شخص بہت یاد آیا جو بہت پہلے فوت ہو چکا تھا۔ مجھے اُن دیکھا ناصر کاظمی بے تحاشا یاد آیا۔

دانائے نفسیات کہتے ہیں کہ ایک آدمی کی زندگی میں ایسے لمحات کی تعداد مٹھی بھر سے زیادہ نہیں جب وہ بے خود ہو کر سرشاری کی ایسی کیفیت میں چلا جاتا ہے جہاں بے پناہ مسرت اُسے اپنی ماں کی ممتا بھری گود میں بھر کر ہلکورے دینے لگتی ہے۔

ہم نے بعد کی ملاقاتوں میں اُس رات کا تذکرہ نہ کیا۔ اور بہت سے تذکرے کیے سوائے اُس عجیب بے پایاں رات اور بے پناہ دیوانگی کے۔

ایک لمحۂ گزراں میں مَیں نے اُن سے تسلسل سے شاعری نہ کرنے کا شکوہ کیا تو قلندرانہ دبی دبی ہنسی ہنسے اور کہنے لگے "پابلو نرودا نے کہیں کہا تھا کہ شاعری جوان آدمی کا کام ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے بڑھاپے میں بھی جوان رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ جذبات تھک کر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ منیر نیازی نے بھی تو کہہ دیا تھا۔ غم کا وہ زور اب مرے اندر نہیں رہا، اس عمر میں مَیں اتنا شمر ور نہیں رہا۔

میرے بارے میں دوست کہتے تھے کہ میری بے چینی کبھی مجھے ایک چھت تلے دوراتیں گزارنے نہیں دیتی۔
اب یہ عالم ہے کہ ایک رات بھی اپنی چھت سے دور گراں محسوس ہوتی ہے۔"

بخاری صاحب نے مجھ سے بے مایہ کو جدید ادب کے نئے نئے رنگوں سے روشناس کیا ہے۔ البرٹ کامیو اور والٹیئر کے بے شمار حوالے دیے اور جملے دہرائے۔ البرٹ کامیو نے مضمون "The myth of sisyphus" میں لکھا تھا کہ جب پنڈورا باکس کھلا تو سب سے آخر میں امید باہر نکلی۔ اسی طرح کسی کا قول سنایا "امید مردے کو قبر میں بھی آرام سے سونے نہیں دیتی۔" یا پھر "میں انسانیت سے محبت کرتا ہوں، انسانوں سے نہیں۔" کامیو کا ایک جملہ دہراتے ہوئے کئی مرتبہ کہا کہ پیدائشی طور پر شکل قدرت کی جانب سے عطا ہوتی ہے مگر بعض بدطنیت لوگوں کے حسین چہروں پر نحوست اور پاکیزہ لوگوں کے غیر جاذب چہروں پر ملاحت اور کشش آجاتی ہے۔ کامیو کا جملہ ہے۔

"Alas, after a certain age every man is responsible for his face." (آہ، ایک خاص عمر کے بعد ہر شخص اپنے چہرے کا خود ذمہ دار ہوتا ہے)۔

افتخار بخاری نہ تو ایک عظیم شاعر کا نام ہے اور نہ ہی معروف دانش ور کا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں چھپا ہوا ایک ایسا گم نام شخص ہے جو حقیقی معنوں میں پڑھا لکھا دانش ور ہے۔ اُس کا قلندرانہ مزاج نمود و نمائش سے گریزاں اور خانہ نشینی کی جانب مائل ہے۔ وہ سخن کچہری میں بیٹھا درویش ہے۔

اُس نے کم شاعری کی ہے اور اس سے بھی کم محافل میں دانش بگھاری ہے۔ ایسے لوگ ہی کسی معاشرے کی اصل روح ہوتے ہیں، عامیوں میں بیٹھے فہیم۔ یہ سوسائٹی کے ڈھانچے کی دیرپا ساگوانی لکڑی سے تعمیر کرتے ہیں۔ ایسے خلوت نشین صاحبانِ ادراک معاشروں میں زندگی کی حرارت کا باعث اور تابندگی کی وجہ ہوتے ہیں۔

افتخار بخاری صاحب شاعری اور غیر ملکی شاعری کے تراجم کے دوران اس کے انتخاب میں پرت در پرت فلسفیانہ سوچ خود دریافت کردہ اور ایجاد شدہ خوشبودار اور شربتی اصطلاحات کو خوب استعمال کرتے ہیں۔

شاعری میں صوفیانہ فلسفے کو گوندھنے والے اساتذہ میں ایک جانب جلال الدین رومی، عمر خیام، سعدی، حافظ شیرازی، فرید الدین عطار اور اقبال ہیں تو مغربی فلسفیانہ مباحث کو شعری رنگ میں رنگنے والوں میں ہومر، نطشے، شیلے، نیرودا، ایلیٹ اور کرک گارڈ نمایاں ہوتے ہیں۔

نئے دور کی شاعری میں گریہ وزاری اور محبت و محرومی کی مسلسل گردان یکسانیت کا باعث ہے۔ فلسفیانہ سوچ کا شاعری میں چلن کم تو ہوا ہے مگر آج بھی موجود ضرور ہے۔ عمدہ نوجوان شاعر نئے سانچے تراش رہے ہیں جن سے اعلیٰ پائے کے اشعار ڈھل کر نکلتے ہیں۔

افتخار بخاری کے ہاں فلسفیانہ گتھیوں کو موزوں اصطلاحات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو ذہن رسا کی خامہ فرسائی کی عکاس ہیں۔ اِن میں عوامی تقاضے کے تحت دمکتے عام فہم اشعار کا استعمال کم ہے۔ بہ قول ٹامس کارلائل "کم زور آنکھیں دمکتی چیزوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔"

عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے کہا تھا۔

''ایک ناظر جب اپنے آپ کو ایک پتھر کا مشاہدہ کرتے ہوئے پاتا تو ہے، علم طبعیات کی رو سے، وہ درحقیقت پتھر کا مشاہدہ نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اُس مشاہدے کے اپنے اوپر ہونے والے اثرات کا تجزیہ کر رہا ہوتا ہے۔''

بند، متعفن اور پُر جبر معاشرت میں مکالمے کا رستہ ہی بند ہو جاتا ہے، فلسفیانہ مباحث تو بعید از قیاس ہیں۔ اس کی مماثلت شاہ دولہ کے آہنی ٹوپیاں پہنے چوہوں سے کیا جانا حقیقی موازنہ ہے۔ شاہ دولہ کے چوہوں کی آہنی ٹوپیاں بنانے والے، کوتاہ نظر فیصلہ کاروں کے بارے میں مدر ٹریسا نے کہا تھا ''اگر تم لوگوں کے ہر فعل کو خود ساختہ ترازو میں تولنے بیٹھ جاؤ گے تو تمھارے پاس خلقت سے محبت کا وقت نہیں رہے گا۔''

بخاری صاحب کی شاعری اور بین الاقوامی شاعری کے توانا اور زرخیز تراجم میں اُردن میں گزری رات کا منظر ہے، ورجینیا کے ہوٹل کے کمرے کے بستر کی چادر کی شکنوں کا احوال ہے، پیرس میں نارٹرڈیم کے کلیسا کے پچھواڑے میں واقع فلیٹ کے کمرے کی کھڑکی سے دریائے سین کے کنارے جوڑوں کو تکتے تکتے، فلیٹ میں بیٹھے دو سایوں کی روداد ہے یا ذہنِ رسا کی کرشمہ سازی ہے۔

اُردو ادب میں، بہ قول محمد حسن عسکری کے سے دانش مند نقاد کے، وہ ادیب زیادہ معروف ہوئے جنھیں کوئی ''سودا'' تھا۔ یعنی وہ مخصوص سانچے کی نثر نگاری یا شاعری کرتے تھے، خاص رنگوں میں رنگے ہوتے تھے اور اپنے پسندیدہ موضوعات کے قیدی تھے۔ اس معاملے میں استثنا یقیناً ہے۔ یہی ''سودا'' تخلیق کار کی بہ یک وقت قوت اور کمزوری بن جاتا ہے، اس میں وہ کمال کو پہنچ سکتا ہے لیکن پھر وہ ایک کنویں کی مخلوق ہو جاتا ہے، بحرِ بیکراں کا باسی نہیں۔

افتخار بخاری صاحب کو کوئی خاص ''سودا'' نہیں۔ ہاں اُن کے ہاں چند موضوعات صراحت سے در آتے ہیں۔ یہ موضوعات دہرائے تو جاتے ہیں پر ان کے رنگ بدل جاتے ہیں۔ ان میں تنہائی، جدائی، اداسی، آنسو، چاند، اساطیر اور آفاقیت زیادہ نمایاں ہیں۔

نہ جانے وہ کون سا غم ہے جس نے بلند بانگ قہقہے لگانے والے شاعر کو درونِ خانہ رنجیدہ رکھتا ہے کہ وہ اپنا دکھ کائناتی غم کے اندر لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔ یہ اُس کی رقیق القلبی اور حساسیت ہے جو ہر نفس کے دکھ کو محسوس کر کے لفظوں میں پھونک دیتا ہے۔ بہ قول بلھے شاہ 'میں جانیا دُکھ مینکوں، اُچے چڑھ کے ویکھیا، گھر گھر ایہا اگ''

افتخار بخاری ایک درویش ہے۔ برگد کے سائے میں، فریدالدین عطار کا سیانا پرندہ ہے، یونانی اساطیر کا بڑی آنکھوں والا دانش مند پکھیرو ہے یا پھر سامِلوں کی بھیڑ میں بیٹھا ایک شاعر ہے جو سیّد بھی ہے، بخاری بھی ہے، وکیل بھی ہے، صاحبِ دلیل بھی ہے یا پھر ایک سایہ ہے، گمان ہے، مجنوں کا گیان ہے، وقت کی کتاب میں لکھی نظم ہے۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا۔ سمٹی ہوئی مٹی کو بکھرنے نہیں دیتا، اک ڈر مرے اندر مجھے مرنے نہیں دیتا۔

---

irfanjaved1001@gmail.com

عرفان جاوید لاہور میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور، انجینیئرنگ یونی ورسٹی لاہور اور سندھ یونی ورسٹی حیدر آباد سے تعلیم حاصل کی۔ بیرونِ ملک سے کئی کورسز کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اپنے تعلیمی دور کے دوران، نوے کی دہائی میں احمد ندیم قاسمی کے مستند ادبی رسالے "فنون" سے کیا۔ ان کی تخلیقات پاک و ہند کے قریباً تمام نمایاں اور موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ "کافی ہاؤس"، خاکوں کی معروف کتاب "دروازے"، آصف فرخی اور محمد الیاس کے افسانوں کے انتخاب مع تنقیدی تعارف "سمندر کی چوری" اور "مورتیں" شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں شامل خاکے ادبی جرائد کے علاوہ روزنامہ "جنگ" میں "سرخاب" کے عنوان سے سلسلہ وار شائع ہوئے ہیں اور قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

پروین شاکر دادی بنی تو اُسے فوت ہوئے اُنیس برس پانچ روز گزر چکے تھے۔ (پارو، پروین شاکر)

منٹو کی بیوی صفیہ، جو یتیم لڑکی تھی تو بیاہ دی گئی، باقی زندگی تنگ دستی اور شوہر کی بے اعتدالی کی نذر ہوئی، اکلوتا بیٹا بچپن میں فوت ہو گیا، تین بیٹیاں چھوٹی سی تھیں تو شوہر فوت ہو گیا۔ خواہش ہوتی ہے کاش کہ منٹو کی کہانی صفیہ کی نظر اور اُس کے قلم سے بھی لکھی جاتی۔ (مہا منٹو، سعادت حسن منٹو)

کلبی صبح اٹھ کر کھڑا ہو کر زبان باہر نکال کر اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا بابا جی ایسا کیوں کرتے ہیں، کہنے لگا کہ میں اس زبان کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ سارا دن اچھے بول بولنا۔ اگر غلط بولو گی تو تم بول کر دانتوں کے اندر چھپ جاؤ گی اور مار سارے جسم کو پڑے گی۔ (دم دم دامن، استاد دامن)

خالد نے شبینہ ہوٹل میں بلیئرڈ کے کھیل، جس پر شرطیں بدی جاتیں، کے حوالے سے لکھا تھا کہ وہاں دیوار پر ایک سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا "یہاں غریب اور شریف آدمی کا داخلہ ممنوع ہے۔" (انوکھا لاڈلا، خالد حسن)

جون ایلیا کے ابتدائی دنوں کے دوست اور غم گسار شکیل عادل زادہ رقم طراز ہیں "کسی دن گھریلو معاملوں کا قصہ چل رہا تھا۔ کہنے لگے 'یار شکیل! سنتے ہیں، پچھلے زمانوں میں بیویاں مر بھی جایا کرتی تھیں'۔" ایک مرتبہ جون ایلیا نے کہا کہ "لکھنا لکھانا دراصل غیر فطری کام ہے۔ اس لیے تمام باشعور ادیبوں کو لکھنے سے دست بردار ہو کر محض بولنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔" دوستوں کی ایک محفل میں تہذیب و تمدن پر بحث جاری تھی۔ جون کہنے لگے "سمندروں کے کنارے تجارت اور معیشت پروان چڑھتی ہے، دریاؤں کے کنارے تہذیب۔" ایک مرتبہ کہنے لگے "ہم ایک ہزار سال سے تاریخ کے دسترخوان پر بیٹھے حرام خوری کر رہے ہیں۔" (جون صاحب، جون ایلیا)

میری منشا صاحب سے چھے ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات اُن کے گھر پر ہندوستان سے آئے مہمانوں کے اعزاز میں دیے ہوئے عشائیے میں ہوئی اور آخری اُن کے جنازے پر۔ پہلی ملاقات میں وہ بول رہے تھے اور میں خاموش بیٹھا رہا تھا اور آخری ملاقات میں وہ خاموش تھے۔ (یادگار، محمد منشا یاد)

انھوں نے ساری زندگی شادی نہ کر کے اچھا کیا تھا۔ بہت سے فن کار اپنے فن یا صلاحیت کا خراج اپنے بیوی بچوں کو نظر انداز کر کے اُن سے لیتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے تخلیقی جنون کی خاطر کسی عورت کی زندگی متاثر نہ کی تھی۔ محبتیں کئی کی تھیں اور عشق ایک برطانوی لڑکی انگرڈ سے کیا تھا۔ (جلاوطن، تصدق سہیل)

امجد اسلام امجد کو اندھی خالہ، ایک بیوروکریٹ اور ملکہ رضیہ سلطان نے تخلیق کار بننے میں مدد دی۔ (وارث، امجد اسلام امجد)

زندگی آنول نال دفنانے سے مردہ دفنانے کے درمیان کا ایک وقفہ ہے۔ (وارث، امجد اسلام امجد)

چیخوف سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ وہ صرف افسانے ہی کیوں لکھتا ہے تو اُس نے ایک حکایت بیان کی۔ "ایک خوش رنگ ننھے سے پرندے سے پوچھا گیا کہ وہ اتنے چھوٹے چھوٹے گیت کیوں گاتا ہے تو اُس نے جواب دیا، میری زندگی مختصر ہے اور میرے پاس گانے کو بے شمار گیت ہیں۔ میں اس زندگی میں سبھی گیت گانا چاہتا ہوں۔" (کوزہ گر، محمد الیاس)

ایک مرتبہ افتخار بخاری کے ایک دوست نے ان کا کسی سے تعارف کرواتے ہوئے اُسے بتایا "یہ بہت اچھے شاعر ہیں۔" انھوں نے فوری طور پر وضاحت کی "نہیں۔ میں ٹھیک ٹھاک آدمی ہوں۔" (ٹھیک ٹھاک آدمی، افتخار بخاری)

Rs. 900.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-3146-9
ISBN-13: 978-969-35-3146-6
9789693531466